''چہارسُو''

...... شہرِ نبوت ......

ادب ہمیشہ سے جناب حسن عسکری کاظمی کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے، عمر شہرِ ادب کے پڑھنے اور پڑھانے میں گزری، سخن شناسی وسخنوری خمیر میں گندھی ہوئی ہے ''دشت بے صدا'' اور ''خیمۂ دل'' کے عنوان سے ان کے دو شعری مجموعے قارئین ادب سے داد وصول کر چکے ہیں۔ مرصع سازی کے اس باریک کام کی مہارت بہم پہنچانے کے بعد اب انہوں نے اپنی ریاضتوں کا آب ورنگ آرائشِ فردوس بریں یعنی نعتِ ختم المرسلینؐ میں صَرف کرنے کی ٹھان لی ہے۔

آپ کی مدحت نگاری کا ہنرا چھالگا   موسم نعت نبیؐ شام وسحرا چھالگا

کاظمی صاحب کے مجموعۂ نعت ''شہرِ نبوت'' میں جذبہ وحسنِ عقیدت کے اساسی عناصر کے ساتھ ساتھ فنی لوازم کا التزام اور فکری تحریک کا اہتمام بھی نمایاں نظر آتا ہے، ان کی تلمیحات، مجموعی اسلامی روایات کے تار و پود سے ابھرتی ہیں، کہیں کمانوں میں سمٹا ہوا فاصلہ ''قاب قوسین'' کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے، کہیں بیڑی کھولنے کی رمزیصنع عنھم اصرھم والاغلال کا تلازم معنی پیدا کرتی ہے، کہیں ہستی بے سایہ کا سایہ مدحِ شہ لولاک کا حوالہ فراہم کرتا ہے اور کہیں ''ربذۂ جاں'' سے پیرہنِ بوذری کی مہک اٹھتی ہے اور اس پر مستزاد سادگی و برجستگی جو نگاہ سے گزرتے ہی دل وجاں تک نفوذ کر جاتی ہے۔

...... ڈاکٹر خورشید رضوی

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: ہادیہ حلیمہ سینٹر، اردو بازار، لاہور۔

...... عام عروضی مغالطے......

اردو میں استعمال ہونے والی بحروں کو صعودی اور نزولی سمتوں کی ترتیب می ں شماریاتی جدولوں کے ذریعے منکشف کیا گیا ہے۔ ماضی کی ممتاز عروضی تالیفات پر ڈاکٹر آفتاب مضطر کا تنقیدی جائزہ بھی ایک دیدنی جواز رکھتا ہے۔ غزل کے حوالے سے پاکستان کے معروف ادبی رسائل ''نقوش'' اور ''فنون'' کی ضخیم خصوصی اشاعتوں سے رائجہ بحروں اور اوزان کے فی صد تناسب کا خاکہ بھی اپنی جگہ ایک انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس مقالے کے آخری باب میں استنباط اور ماحصل کا خلاصہ بھی اس تحقیق کو ایک اجتہاد کا درجہ مہیا کرتا ہے۔ تجاویز کے زمرے میں عروضی سافٹ ویئر کی تجویز بالخصوص اس تحقیقی مقالے کو عصری تقاضوں سے منسلک کرتی ہے۔ اس تازہ کار تجویز سے ڈاکٹر آفتاب مضطر کی ذہنی ندرت کاری اردو عرض کے لیے ایک مضبوط حصار کھینچ رہی ہے۔ خشک موضوع کے باوجود ڈاکٹر آفتاب مضطر کی تحریر میں تناؤ نہیں بلکہ بناؤ کا حسن رچ بس گیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب مضطر کا یہ مقالہ دراصل فکری شراکت داری اور علمی شمولیت کے لیے صلائے عام کا محرک ہے۔ اس مقالے سے یہ بھی واشگاف ہوا کہ پرانے دروازوں پر نئے انداز کی دستک ضروری جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب مضطر کی حیثیت، اس مقالے میں آئینہ ساز کی نہیں بلکہ عکس کو آراستہ کرنے والے کی ہے۔ یوں ڈاکٹر آفتاب مضطر نے مغالطوں اور لغزشوں کے تیرہ خانے میں اعتبار کی روشنی کے ذریعے راستی کے متلاشی کو اثباتی تائید کا راستہ ڈھونڈ نکالنے کی گنجائش سے قریب کر دیا ہے۔

......نصیر ترابی

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی۔

...... بارش، مٹھو اور محبت ......

عکسہ صدیقی ایک نوجوان اور پُرعزم شاعرہ ہیں۔ اس کی شاعری کو میں بہت محتاط الفاظ میں ''تجرباتی شاعری'' کہوں گا، کیوں کہ عکسہ اتنی نئی تکنیک میں لکھ رہی ہیں کہ ان کے اسلوب کو فوری طور پر کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی میں اسے ''شعور کی رَو'' کے تحت لکھی جانے والی شاعری سے ایک قدم آگے کی شاعری سمجھتا ہوں اور اسی لیے مفروضے کے طور پر اسے ''تحت الشعور کی رَو'' کی تخلیق کہوں گا۔ عکسہ صدیقی کی یہ نیم اجنبی اور نیم مانوس شاعری، اس کی پُر اعتماد تجرباتی کاوشوں کا دوسرا نام ہے۔ یہی کاوش وکوشش کامیابی سے ہم کنار ہو تو اسلوب میں ڈھل جاتی ہے اور انفرادی تشخص کا امتیازی نشان بن جاتی ہے۔ ہر زمانے کا ہر کامیاب شاعر اپنے منفرد اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ عکسہ صدیقی بھی کامیابی کے اسی راستے ہیں۔

......سرشار صدیقی

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۶،شمارہ:مئی،جون ۲۰۱۷ء

رابطہ:537/D-1‘ گلی نمبر18، ویسٹریج-III‘ راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز

پروفیسر شمیم حنفی

کے نام

''عشقِ بیکراں''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : شمیم حنفی
والد کا نام : محمد یٰسین حنفی
والدہ کا نام : زیب النساء
تاریخ پیدائش: ۱۷۔مئی ۱۹۳۹ء
مقام پیدائش : سلطان پور (یوپی)
پتہ : ۱۱۴، بی ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۲۵

تعلیم:

۱۔ ایم۔اے (تاریخ) ۱۹۶۰ء
۲۔ ایم۔اے (اردو) ۱۹۶۲ء
۳۔ ڈی فل، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۷ء
۴۔ ڈی۔لٹ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۶ء

مشاغل وملازمت:

پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ ملیّہ اسلامیہ، نئی دہلی

مطبوعات:

۱۔ طرح دار لونڈی (ہندی میں ترجمہ۔ مصنف منشی سجاد حسین) ۱۹۶۴ء
۲۔ ہزار داستان (فراق گورکھپوری کے ایک ہزار شعروں کا انتخاب) ۶۵۔۱۹۶۴ء
۳۔ مرزا غالب۔ سوانح (تعلیم بالغاں کے لیے اردو، ہندی) ۱۹۶۵ء
۴۔ جواہر لال نہرو۔ سوانح (تعلیم بالغاں کے لیے اردو، ہندی) ۱۹۶۵ء
۵۔ قومی یکجہتی اور سیکولرازم (ترجمہ۔ مصنف: تاراچند) ۱۹۷۵ء
۶۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس (تنقیدی مقالہ برائے ڈی لٹ، جلد اوّل) ۱۹۷۷ء
۷۔ نئی شعری روایت (تنقیدی مقالہ برائے ڈی لٹ، جلد دوم) ۱۹۷۸ء
۸۔ مٹی کا بلاوا (ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ) ۱۹۸۱ء
۹۔ غزل کا نیا منظر نامہ (نئی غزل پر مضامین) ۱۹۸۱ء
۱۰۔ بھوتوں کا جہاز (بچوں کے لیے پری کتھاؤں کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء
۱۱۔ شہرخوں آشام (پچاس بنگالی شعرا کے کلام کا ترجمہ) ۱۹۸۳ء
۱۲۔ فراق: شاعر اور شخص (ترتیب وانتخاب مضامین) ۱۹۸۳ء
۱۳۔ کہانی کے پانچ رنگ (تنقیدی مضامین) ۱۹۸۳ء
۱۴۔ اندرا گاندھی کی کہانی (سوانحی حالات، تعلیم بالغاں کے لیے) ۱۹۸۴ء
۱۵۔ مجھے گھر یاد آتا ہے (ریڈیائی ڈرامے) ۱۹۸۵ء
۱۶۔ کٹا ہوا ہاتھ (اسرار آمیز کہانیوں کے سلسلے کی دوسری کتاب) ۱۹۸۶ء
۱۷۔ بیاتی سیریز۔ ایک مطالعہ (اے ایم چندرن کی نئی چتر مالا کے حوالے سے پورے آدمی کی کہانی) ۱۹۸۶ء
۱۸۔ یادوں کا اجالا (خود نوشت سوانح) (ترجمہ۔ مصنف: بھگوان سنگھ) ۱۹۸۶ء
۱۹۔ انتخاب فیض (ترتیب وانتخاب مضامین) ۱۹۸۶ء
۲۰۔ زندگی کی طرف (ریڈیائی ڈرامے) ۱۹۸۸ء
۲۱۔ جواہر لال نہرو۔ جدو جہد کے سال (منتخب تحریریں۔ انگریزی سے ترجمہ) ۱۹۹۰ء
۲۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ (۲۳ خاکے، انتخاب و ترتیب مع مقدمہ) ۱۹۹۱ء
۲۳۔ غزل اور غزل گائیکی (انگریزی میں غزل اور غزل گائیکی) ۱۹۹۱ء
۲۴۔ ہماری آزادی (مکمل متن) (ترجمہ۔ مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۹۱ء
۲۵۔ انتخاب عمیق حنفی (شاعری کا انتخاب اور ترتیب) ۱۹۹۵ء
۲۶۔ سرسید سے اکبر تک (منتخبہ مضامین۔ بہ اشتراک سہیل فاروقی) ۱۹۹۵ء
۲۷۔ سیاہ فام ادب (ترتیب بہ اشتراک سہیل فاروقی) ۱۹۹۵ء
۲۸۔ اقبال کا حرف تمنا (اقبال پر تنقیدی مضامین) ۱۹۹۶ء
۲۹۔ فراق۔ دیارِ شب کا مسافر (ترتیب بہ اشتراک سہیل فاروقی) ۱۹۹۷ء
۳۰۔ قاری سے مکالمہ (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۸ء
۳۱۔ بازار میں نیند (ریڈیائی ڈرامے) ۱۹۹۸ء
۳۲۔ تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ (۲۵ تنقیدی مضامین) ۲۰۰۳ء
۳۳۔ خیال کی مسافت (تنقیدی مضامین) ۲۰۰۳ء
۳۴۔ نذرِ انیس (رسالہ جامعہ کا خصوصی شمارہ) (ترتیب وانتخاب) ۲۰۰۳ء
۳۵۔ انتخاب رسالہ جامعہ۔ جلد اوّل (ترتیب وانتخاب) جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ، روایت (بہ اشتراک شہاب الدین انصاری اور شمس الحق عثمانی) ۲۰۰۳ء
۳۶۔ انتخاب رسالہ جامعہ۔ جلد دوم (ترتیب و انتخاب) اوارقِ مصور متعلقین ومعاصرین (بہ اشتراک شہاب الدین انصاری اور شمس الحق عثمانی) ۲۰۰۴ء
۳۷۔ انتخاب رسالہ جامعہ۔ جلد سوم (ترتیب وانتخاب) جامعہ ملیہ اسلامیہ علمی اور تہذیبی وراثت (بہ اشتراک شہاب الدین انصاری اور شمس الحق عثمانی) ۲۰۰۴ء
۳۸۔ آزادی کے بعد اردو نظم (ترتیب) ۲۰۰۵ء

۳۹۔ ہم سفروں کے درمیان (ہم عصرادیبوں پرمضامین)	۲۰۰۵ء	۴۸۔ درزی شہزادے کی کہانی (بچوں کے لیے کہانیاں)	۲۰۰۷ء
۴۰۔ پریم چند کے منتخب افسانے (ترتیب)	۲۰۰۵ء	۴۹۔ بازارشیشہ گری (ہم عصرادیبوں پرمضامین)	۲۰۰۷ء
۴۱۔ غالب کی تحقیقی حسیّت (تنقیدی مضامین)	۲۰۰۵ء	۵۰۔ فیض احمد فیض، غالب، اکبرالٰہ آبادی، اختر الایمان (ہندی	
۴۲۔ ہم نفسوں کی بزم میں (ہم عصرادیبوں پرمضامین)	۲۰۰۶ء	زبان میں چار کتابیں)	
۴۳۔ انتخابِ رسالہ جامعہ۔ جلد چہارم (ترتیب وانتخاب)	۲۰۰۶ء	**ایوارڈز واعزازات:**	
(بہ اشتراک شہاب الدین انصاری اور شمس الحق عثمانی)		ا۔ مولانا ابوالکلام آزادایوارڈ	
۴۴۔ انفرادی شعوراوراجتماعی زندگی (تنقیدی مضامین)	۲۰۰۶ء	۲۔ مغربی بنگال اُردواکادمی کا پرویز شاہدی ایوارڈ	
۴۵۔ ایک بونے کا قصہ (بچوں کے لیے کہانیاں)	۲۰۰۶ء	۳۔ دہلی اردو کادمی ایوارڈ	
۴۶۔ فاطمہ کی کہانی (بچوں کے لیے کہانیاں)	۲۰۰۶ء	۴۔ اتر پردیش اُردواکادمی ایوارڈ	
۴۷۔ رات شہراورزندگی (مضامین)	۲۰۰۷ء	☆	

- بقیہ -

شکست کی آواز

پیچ تاثرات اُن کی شاعری میں ملتے ہیں وہ معاشی پراگندگی سے زیادہ اس عہد کی فکری اور تہذیبی کشمکش کا ردِّعمل تھے۔ ماضی اور حال غالب کے لیے کعبہ اور کلیسا کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں دونوں کی حرمت اور تکریم کا پاس تھا۔ اُن کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک کے ہوکر رہ جاتے۔ اسی لیے ایک طرف اُن کے ہاں ماضی کے دُور افتادہ مناظر کی بازدید کی تڑپ ہے تو دوسری طرف حال کے بدلتے ہوئے موسموں کا ادراک۔ انہوں نے اپنی ذات کی وسعتوں میں نئی اور پرُانی قدروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا جو تماشہ دیکھا وہ عصری کائنات کا سایہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے شعور تک پہنچنے کے لیے اُسے غالب ہی کی آنکھ سے گزرنا پڑے جو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ہر سچے فنکار کی طرح غالبؔ کو یہ ہنر بھی آتا تھا کہ کس طرح ایک لمحاتی یا عارضی تجربے کو ابدیت سے ہم کنار کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ دنیا غالبؔ کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ہمیں اُن کی شاعری کے آئینے میں اُن کے ساتھ ساتھ اپنا چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ کوئی بھی تہذیبی، مذہبی، فکری یا سیاسی نظریہ اُن کے متجسس، تیز رواور سیماب صفت تخلیقی ذہن کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ذہنی آزادی کے جیسے نقوش ہمیں غالب کی شخصیت میں نظر آتے ہیں اُن کے ہم عصروں میں کسی کے ہاں نہیں ملتے۔ اُن کے پاس کوئی نظریہ نہیں تھا لیکن وہ صاحب نظر تھے اور چوں کہ اُن کی شگفتہ مزاجی آپ اپنا مذاق اُڑانے سے بھی باز نہیں آتی تھی اس لیے کسی نظریے کی قید اور حدبندیوں میں اپنے فنی احساس اور بیکراں تخیل کو محصور کردینا اُن کے لیے بھی ممکن نہ ہوسکا۔

آخیر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری غالبؔ کے لیے پناہ گاہ ہرگز نہیں تھی۔ اُسے غالب نے اپنی شخصیت اور ذات کے اظہار کا وسیلہ سمجھا اور اپنے عہد کی تغیر پذیر فکری اور مادّی کائنات کا تجزیہ بھی انہوں نے اپنی انفرادیت ہی کی روشنی میں کیا۔ وہ مصلح اور تخلیقی فنکار کا فرق اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے ایسے رجحانات جو اُن کی زندگی کی صرف خارجی سطحوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شعری تجربہ نہ بن سکے۔ اپنے عہد کے انسان کو پڑھتے وقت انہوں نے ہر عہد کے انسان کے مسائل کو مطالعے کا مرکز اور موضوع بنالیا اور خیر وشر کی تمام لہروں کو ایک روشن اور کھلے ہوئے دل ودماغ رکھنے والے انسان کی حیثیت سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں جذباتی سطح پر غالبؔ کو بہت دیر پا صدمے بھی جھیلنے پڑے لیکن اُن کی شاعری صدمات اور ذاتی مصائب کا مرقع نہیں ہے۔ وہ اُن کا اعمال نامہ بھی نہیں بلکہ ایک ایسے سوالنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے جواب میں غالبؔ نے ظاہر اور باطن کی تمام دنیاؤں اور فصلوں میں زندگی بھر تلاش کیے اور اس عہد کی سیاسی ومعاشرتی پراگندگی، تغیر وتبدل اور مادّی مصائب کے ہاتھوں شکست کے شدید المیاتی احساس کے باوجود انہوں نے اپنے نفس ارادی کو مغلوب نہ ہونے دیا بلکہ ہر ایسا تجربہ اُن کی انفرادیت کو اور زیادہ روشن اور اُجاگر کرتا گیا۔ شکست میں تعمیرِ ذات کا یہ حُسن کچھ غالبؔ ہی کا حصہ تھا۔

براہِ راست

نہ الفاظ کی کمی نہ احساسات بس سے باہر اگر کوئی خوف ہے تو اس بات کا کہ زیادہ اونچائی پر دیکھنے کے باعث خود کا چھوٹا پن نمایاں نہ ہو جائے۔

پروفیسر شمیم حنفی اردو ادب کا ایسا طویل مینار ہیں کہ جو بھی اُن کے قد کو ماپنے کی کوشش کرے گا اپنے قد سے مار کھا جائے گا۔ سو جناب آج کی نشست کا اصل سہرا دہلی میں مقیم عالمی اردو ادب کے مدیر اور نامور افسانہ نگار بھائی نند کشور وکرم کے سر ہے جن کے ارشاد کی تعمیل میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب قبلہ نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے اس اشاعتِ خاص کے لیے نہ صرف حامی بھری بلکہ ہماری رہنمائی اور تعاون کا بیڑا بھی اٹھائے رکھا۔ سو ہر قسم کی تعریف، توصیف اور ستائش کے حقدار دونوں فاضل بزرگ بجا طور پر ٹھہرتے ہیں۔ اس اشاعتِ خاص میں در آئی ہر طرح کی غلطی کے سزاوار ہم ہیں جس کی نشاندہی ہمارے لیے اعزاز سے کم نہ ہوگی۔

گلزار جاوید

☆ خاندانی پس منظر سے تو ہم کسی قدر آگاہ ہیں۔ بچپن کے حوالے سے ہمارا اشتیاق مجبور کر رہا ہے کہ ہم آپ کے کھیل، کود، شرارتیں اور دیگر مشاغل کے ساتھ دوستوں کے حوالے سے بھی آگاہی حاصل کریں؟

☆☆ کھیل کُود کی جانب تو کوئی زیادہ رجحان نہیں رہا البتہ میرے سب سے قریبی دوست یہ رہے ہیں: ابرار احمد حنفی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سید وقار حسین، سی۔ ایم نعیم، اے۔ رام چندرن، بلراج مین را، خالد رفیع رحمانی۔ ابرار صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ رفیع الدین خاں کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ کلام محفوظ نہیں، سوائے اس کے کہ دوستوں کو کچھ یاد ہو۔ سید وقار حسین علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر اور پروفیسر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے علی گڑھ ہی میں رہتے ہیں۔ مزاجاً بہت تنہائی پسند، لوگوں سے ملتے جلتے نہیں۔ میرے عزیز ترین دوست ہیں انگریزی اور اردو میں کچھ مضامین لکھتے ہیں۔ کتاب چھپوانے کے قائل نہیں۔ نعیم صاحب شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ اے۔ رام چندرن عالمی شہرت رکھنے والے مصور دلّی میں رہتے ہیں۔ خالد رفیع عثمانی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یونین بینک میں ایک بڑے عہدے پر تھے۔

☆ کچھ یاد پڑتا ہے کہ پہلی بار درسی کتاب کے علاوہ کون سی کتاب پڑھی اور اُس کا نتیجہ کیا ہوا؟

☆☆ پہلی درسی کتاب گھر والوں کی آنکھ بچا کر جو پڑھی ''مثنوی زہر عشق'' تھی۔ گھر میں انگریزی اردو کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ کچھ کتابیں چھپا کر ایک بڑے چوبی صندوق میں رکھی جاتی تھیں میں نے وہیں سے نکالی۔ اس وقت میری عمر نو دس برس رہی ہوگی۔ بہت مزا آیا۔

☆ ساتویں درجے کا طالب علم کس تحریک پر انشائیہ لکھتا ہے اور اُس کے بعد صورت حال کیا رُخ اختیار کرتی ہے؟

☆☆ ارے صاحب۔ نوجوانی میں آدمی بہت سے شغل اختیار کرتا ہے سو ہم نے بھی تفریحاً انشائیہ لکھ مارا۔

☆ کالج میگزین میں پہلی تخلیق کس وسیلے اور صنف میں شائع ہوئی؟

☆☆ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پہلی تخلیق کالج میگزین میں شائع ہوئی جو ایک افسانہ تھا ''درانتی کے ساز پر'' غالباً یہ کرشن چندر کے کسی افسانے کی بھونڈی نقل تھی۔

☆ نوجوانی میں لوگ باگ اکثر کمشنر، ڈپٹی کمشنر، انجینئر یا ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ علم و ادب کا انتخاب آپ کی مجبوری تھی یا شوق؟

☆☆ صاحب اسے آپ میرا شوق اور انتخاب کہہ لیجیے۔

☆ مصوری، موسیقی، فنون لطیفہ کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ ظروف سازی کا شوق آپ کو کب اور کس طور ہوا۔ اُس کے انجام کی بابت بھی روشنی ڈالئے؟

☆☆ مصوری، موسیقی کسی بھی فن میں کمال حاصل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، شوق برقرار ہے۔ کتابیں پڑھنے سے زیادہ وقت نمائشیں دیکھنے اور موسیقی سننے میں صرف ہوتا ہے۔ مٹی کے برتن بنانے میں مجھے بہت مزہ آتا تھا۔ میرے استاد دو تھے ایک تو کشوری لال جی جو پیشہ ور کمہار تھے اور جامعہ ملیہ کے آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں ملازم بھی تھے۔ دوسرے جناب دیوی پرساد مرحوم جو گاندھی جی اور ٹیگور کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ہندوستان کے نامور Ceramic Artist۔ بہت گُنی انسان تھے۔ مصور، مجسمہ ساز، لکڑی اور پتھر کا کام بھی خوب جانتے تھے۔ کئی کتابیں لکھی ہیں لوک کلا دی آرٹ اور تعلیم کے موضوع پر۔ لمبی عمر کو پہنچ کر انتقال کیا بہت یاد آتے ہیں۔

☆ شاعری، افسانہ اور ڈرامے سے آپ کا عشق عارضی ثابت ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ یہ تو جناب انسان کے موڈ اور مزاج پر منحصر ہوتا ہے جب جی میں آیا شعر کہہ لیا، جب موڈ بنا ڈرامہ لکھ لیا، ضرورت ہوئی تو کالم لکھ لیا۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے کچھ بھی چھوٹا نہیں۔

☆ بچوں کا ادب بھی آپ کا اہم حوالہ ہے مگر ہماری معلومات صفر؟

☆☆ میں اگر بھول نہیں رہا ہوں تو بچوں کے لیے سات یا آٹھ کتابیں چھپ چکی ہیں اگر آپ کی نظر سے میرا سوانح اعشاریہ گزرا ہو تو میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

☆ ادبی صحافت بھی آپ نے کی ہے۔ ہماری خواہش آپ کے تجربات سے استفادے کی ہے؟

☆☆ ادبی صحافت کا شغل آج بھی جاری ہے۔ میرے کالمز کا مجموعہ ''یہ کس کا خواب تماشا ہے'' شائع ہو چکا ہے جسے جناب خالد جاوید نے مرتب کیا ہے۔

☆ تراجم اور تالیف کے ذکر کے بغیر یہ گفتگو نامکمل تصور کی جائے گی؟

☆☆ میرے عزیز اس کے لیے بھی آپ کو سوانحی اعشاریہ سے رجوع کرنا ہوگا۔

☆ آپ کے کریڈٹ پر درسی کتب بھی شامل ہیں۔ اس حوالے سے باخبری بھی ضروری ہے؟

☆☆ سرِ دست میں زبانی نہیں بتلا سکتا۔ آپ کو زحمت ہوگی سوانحی اعشاریہ سے رجوع کیجیے۔

☆ آپ اس بات سے متفق ہیں کہ آپ نے تنقید میں گفتگو اور قصہ گوئی کا انداز اختیار کیا ہے جواب اثبات میں ہے تو جواز خود بہ خود سامنے آ جائے گا؟

☆☆ بہتر تو یہ ہوتا کہ اس حوالے سے معاصرین کی رائے کو اوّلیت دی جاتی لیکن میں آپ کے سوال کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں جی ہاں! شاید۔۔۔

☆ یہ تنقیدی موقف سے استفادے کی بات قبول نہ کرنا آپ کے مزاج کا حصہ ہے یا وجوہات کچھ اور ہیں؟

☆☆ مجھے تنقید سے دلچسپی بہت کم ہے۔ اور اپنی تنقیدی سرگرمی سے یوں کہہ لیجیے کہ صفر کے برابر ہے۔

☆ آپ کے تحریر کردہ تنقیدی مضامین کی نسبت یکسانیت کی بات کرنے والے اگر روبرو ہوں تو آپ کیا جواب دینا پسند کریں گے؟

☆☆ اس کا میں کوئی جواب نہ دوں گا۔ اعتراض قبول ہے۔

☆ اردو ادب میں وجودی طرزِ فکر اور احساس نے صرف آپ کو اپنی اہمیت کا احساس کیوں دلایا اور آپ نے اس ضمن میں جو کاوشات کیں اُس کے فوائد کس شکل میں ظاہر ہوئے؟

☆☆ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی

☆ تنقید، تخلیق کو قابو کرنے کے لیے طرح طرح کے حملے کیوں کرتی ہے اور اس عمل کو کون لوگ استعمال میں لاتے ہیں؟

☆☆ عام طور پر بوٗر (Bore) کرنے والے۔

☆ ایک صاحب آپ کو اردو تنقید میں سب سے اعلیٰ مقام پر فائز کرتے ہیں جبکہ دوسرے صاحب کے فرمان کے مطابق آپ کو پڑھا تو بہت گیا مگر آپ کی تنقید کو موضوع نہیں بنایا گیا؟

☆☆ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کس کس کو جواب دیتا۔

☆ آپ کی نسبت نفسیاتی مسائل کی بات کرنے والے آپ کے لیے مشکل کا باعث نہیں بن رہے؟

☆☆ ہرگز نہیں۔

☆ جو لوگ آپ کو پروفیسر حسن عسکری سے متاثر بتلاتے ہیں ڈھکے چھپے الفاظ میں وہی لوگ آپ کو نہ صرف عسکری صاحب بلکہ آزاد، فراق، سلیم احمد، مظفر علی سید بلکہ تمام ناقدین پر فوقیت بھی دیتے نظر آتے ہیں جس کے سبب حاسدین کو حاشیہ آرائی کا موقعہ میسر آ جاتا ہے؟

☆☆ یہ سارے نام میرے لیے بہت محترم ہیں۔ کہاں میں اور کہاں یہ عظیم المرتبت لوگ! حاسدین؟ کیا واقعی!

☆ یوں تو فی زمانہ مابعد جدید، پوسٹ کولونزم، کیمونزم، نیٹو ادب، صارفیت، گلوبل ویلیج، انفارمیشن ایکسپلوژن وغیرہ کا بہت چرچا ہے مگر جو لوگ اردو تنقید کو تصنع آمیز اور آلودگی سے تشبیہ دیتے ہیں اُن کا اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ میری طرف ہرگز ایسا نہیں ہے۔

☆ حالی اور آزاد سے لے کر وارث اور نارنگ صاحب نے خوبصورت اندازِ بیاں سے تنقید میں تخلیق کا رنگ بھر دیا ہے اس کے باوجود آپ کے حامی اور طرفدار آپ کی زبان کو سب سے بہتر بتلا کر زیادتی نہیں کر رہے؟

☆☆ میں کسی کو الزام نہیں دیتا۔ دنیا میں بہت سے بہتر کام بھی کیے جا سکتے ہیں۔

☆ ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' پر پروفیسر وارث علوی کی اتنی سخت گرفت فنی وجوہ کی بنا پر تھی یا کوئی اور وجہ ہے؟

☆☆ وارث علوی دوست تھے۔ اس مضمون کے بعد تعلقات میں اضافہ ہوا اور ہمیشہ قائم رہے۔

☆ ادب، قاری اور سماج کے درمیان مکالمے کی غیر موجودگی کا گلہ کرنے والے آپ کی تنقیدی زبان کو یہ کریڈٹ بھی دیتے ہیں کہ وہ اس خلا کو پُر کر رہی ہے جبکہ لاکھ کوشش اور تلاش و بسیار کے بعد بھی قاری کا دور دور تک پتہ نہیں؟

☆☆ سوال گنجلک ہے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ وقت اور حالات کے تحت ہو رہا ہے۔

☆ ''رات شہر اور زندگی'' میں نئے حنفی صاحب سے ملاقات ہوتی ہے جو سماجیات، سیاسیات، ادبیات، تاریخ اور تنقید کے نئے زاویوں سے متعارف کراتے ہیں۔ کیا ہم اسے مخالفین کا منہ بند کرنے کی دانستہ کوشش کہہ سکتے ہیں؟

☆☆ ان میں سے کچھ مضامین ہندی اور بنگالی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نہیں جناب میں کسی مخالف سے قطعاً واقف نہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کی شخصیت اور تنقید کو متنازعہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اُس سے آپ کے دل دماغ میں کوئی ملال، پچھتاوا یا افسوس تو سر نہیں اُبھارتا

کاش میں نقاد کے بجائے ادیب یا شاعر ہوتا؟

☆☆ نہیں جناب۔ مجھے ہرگز کوئی پچھتاوا نہیں۔

☆ عینی آپا سے آپ کی قربت فنی اکتساب تھا یا ذاتی نیازمندی۔ موقع کی مناسبت سے آپا کی شخصیت و فن پر آپ کی رائے مل جائے تو خوشی ہوگی؟

☆☆ عینی آپا سے مراسم ہمارے گھر کے ہر فرد سے تھے۔ میں ان کا نیازمند تھا، ہوں اور رہوں گا۔

☆ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ آپ ادیبوں کی نسبت غیر ادیبوں سے ملنا اور راہ و رسم رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟

☆☆ صحیح تاثر ہے۔ میرے ملنے جلنے والوں میں اکثریت بے کار لوگوں کی ہے یہ بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔

☆ آزاد نے اردو شاعری کو فارسی اور اردو کی زنجیروں میں قید بتلا کر انگریزی سے استفادہ کی جو بات کی تھی اُس سے آپ کس حد تک متفق ہیں اور کیا اردو والوں نے آزاد کی ہدایت پر کان دھرتے ہوئے اُس پر عمل کیا؟

☆☆ ارے صاحب چھوڑیئے۔ اردو والوں نے آزاد کی بات کہاں مانی؟

☆ ہندی ادبا و شعرا سے آپ کی راہ و رسم زیادہ رہی ہے یقیناً ہندی کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کا ادب بھی آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اردو ادب سے موازنے کی بات تو مناسب نہیں البتہ معیار پر بات ہو سکتی ہے؟

☆☆ جی ہاں مجھے ہندی اور علاقائی زبانوں کے ادب اور ادیبوں سے بے شک بہت دلچسپی ہے۔

☆ جو لوگ آپ پر سخت گیر اور تنک مزاج ہونے کا الزام لگاتے ہیں اُس کا سبب ذاتی پرخاش ہے کیا کوئی اور وجہ؟

☆☆ مجھے ان الزامات کا پتہ نہیں ہے۔۔۔ آپ سمجھتے ہیں بے خبری میں بھی بڑا لطف آتا ہے۔

☆ ہمارے عصر کے معتبر اور ثقہ نقاد جناب شمیم حنفی خود کو نقاد کہنے اور روز حشر ناقدین میں شمار نہ کیے جانے کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ یوں ہی۔۔۔ مجھے گمنامی پسند ہے۔۔۔ غیر اہم ہونا بھی پسند ہے۔۔۔ اصل میں نقّاد ہوتا ہی بَور آدمی ہے۔

☆ آپ پاکستان کے ادبی میلوں، کانفرنس اور سیمینارز میں اکثر مدعو کئے جاتے ہیں اگر آج کی نشست میں ہم آپ سے پاکستان کے ادب اور ادیب کی بابت بے لاگ رائے کی درخواست کریں تو آپ ہمیں مایوس تو نہیں کریں گے یاد رہے اس سوال کے پس منظر میں ستر سالہ تاریخ اپنے بیان کی منتظر ہے؟

☆☆ یہ سب جو آپ کہہ رہے ہیں میں اپنے مضامین میں لکھتا رہتا ہوں۔ آپ بھی کہاں کا قصہ لے بیٹھے۔

☆ برصغیر میں یونیورسٹی کی سطح پر ایم۔ اے، ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں میں جس طرح کی بے قاعدگی اور ناانصافی کھلے عام ہو رہی ہے اُس کے بعد مستقبل کے محقق، ادیب اور ناقدین سے اردو زبان و ادب کی بہتری کی توقع دیوانے کا خواب نہیں؟

☆☆ اسے آپ دیوانے کا خواب کہہ لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

☆ تمام تر مصلحت سے ماورا ہو کر بھارت کی موجودہ صورتِ حال ذہن میں رکھتے ہوئے اردو کے مستقبل پر آپ کی رائے؟

☆☆ بندہ پرور! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

☆ اکثر عالمی سروے میں اس صدی کے آخر تک دنیا کی پانچ ہزار زبانوں کے ختم ہونے کی بابت جب ہم پڑھتے ہیں تو اردو کے حوالے سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے؟

☆☆ اچھا ہے بہت اچھا ہے۔ اس طرح اگر بکھیڑا ختم ہوتا ہے تو اِس میں برائی کیا ہے؟

☆ ہمارے ادبی ادارے تو سرکاری رقوم کے بعد اُدھار کی مے پر چل رہے ہیں پھر بھی اُن کی مستی رنگ نہیں لا رہی۔ آپ کے ادبی ادارے تو اس بات کے پابند ہیں کہ آدھی رقوم ادب اور ادیب پر خرچ کریں پھر اُن کی نسبت اہل قلم نا مطمئن کیوں ہیں؟

☆☆ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بے اطمینانی باقی رہنی چاہیے یہ بھی نہ رہی تو باقی کیا رہ جائے گا۔

☆ آپ کے بعد کی نسل میں آنے والے ناقدین سرحدوں کی قید سے ماورا جن سے آپ کو اردو ادب اور تنقید کی نسبت اطمینان محسوس ہوتا ہو؟

☆☆ جی ہاں، بہت اطمینان ہے۔ وہ ہماری جنریشن سے بہتر ہیں۔ یہ آپ کو ناقدین سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کبھی وقت ملے تو آصف فرخی اور ناصر عباس نیرؔ کے مضامین ضرور پڑھ لیجیے کافی ہے۔۔۔

☆ ہمیں یہ اقرار کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج کے عالمی منظر نامے میں مسلمان سے زیادہ کوئی قوم پسماندہ نہیں۔ آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ یہ آپ کا خیال ہے تو اپنے آپ سے پوچھیے؟ میرے خیال میں ایسی باتیں چوں چرا کے بغیر مان لینی چاہئیں۔

☆ بہت سے مسلم، غیر مسلم زعما اور دانشور یہ بھی کہتے سُنے گئے ہیں کہ مسلم قوم کی پسماندگی اور جہالت ایک صدی سے قبل ختم ہونے کے امکانات نہیں؟

☆☆ جنابِ عالی! جو صاحب یہ کہہ رہے ہوں انہی سے پوچھئے۔ ویسے یہ تو اچھی خاصی مدت ہے اس پر تو خوش ہونا چاہیے۔۔۔ اور کتنی مدت چاہتے ہیں آپ؟

☆ کہتے ہیں ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اگر وہ ہاتھ بھابھی صاحبہ کا ہے تو آپ اُنہیں کتنے فیصد کا شریک ٹھہرائیں گے؟

☆☆ خفا نہ ہوئیے گا یہ ایک رسمی اور فرسودہ سوال ہے۔ میں اور میری بیوی دونوں اس سوال پر خوب ہنسے۔ ہنسنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔

شکست کی آواز

شمیم حنفی

مالی دشواریاں زندگی بھر ساتھ لگی رہیں اور مایوسی اور نامرادی کا ایک ہجوم سائے کی طرح دن رات تعاقب کرتا رہا۔شرب نوشی اور آزادہ روی کو دلّی کے شرفاء نے کبھی اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔جنہیں سامنے بُرا بھلا کہنے کی ہمت نہ تھی، گالیوں بھرے گمنام خطوط لکھتے رہے۔زمانہ ایسا پُر آشوب تھا کہ حفظ وضع کا حوصلہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔قید کاٹی سزانے رہی سہی کسر بھی پُوری کر دی اور ذلّت و رسوائی کا ایسا بوجھ کاندھوں پر آیا کہ زندگی عذاب بن گئی۔صدیوں کی محبوب اور محترم روایتیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ایک عظیم الشان تہذیبی ورثہ ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھرتا جا رہا تھا۔پھر صلاحیتیں ایسی کہ قدر دانوں کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں،جس شاعری کا دربار اور بازار میں چرچا تھا وہ بس میں نہیں تھی اور عرض ہنر کی جو دولت پاس تھی اُس کی قدر و قیمت کا احساس رکھنے والے بہت کم تھے۔زمانہ دشمن تھا اور گھریلو زندگی بھی کچھ ایسی خوشگوار نہ تھی۔یکے بعد دیگرے ساری اولادیں شہرِ عدم میں جا بسیں۔عارف کو شفقت و محبت کا مرکز بنایا تو فلک پیر سے یہ بھی دہ دیکھا گیا اور بالآخر اُسے بھی موت نے چھین لیا۔مرزا یوسف جب مرے تو شہر میں ایسا انتشار تھا کہ کفن دفن کا سامان بھی دشوار تھا۔غرض کہ مصائب و آلام کی ایک طویل، بے حد طویل زنجیر میں غالب کے پیر ہمیشہ الجھے رہے اور ہر چند کہ وہ آتش زیر پا رہے لیکن یہ زنجیر ٹوٹ نہ سکی۔اُن کی زندگی اور زمانے پر ایک لمحے کے لیے بھی نظر ڈالی جائے تو کیسے ہولناک اور حشر زا مناظر ایک دوسرے میں گڈمڈ آنکھوں کے دامن میں اتر آتے ہیں۔عزت و افتخار کی بساط اُلٹ چکی تھی۔عقائد اور روایات کی چھتیں ٹوٹ رہی تھیں۔فضا میں ایک طرف پول والوں کی سیر کے تماشے تھے تو دوسری طرف شہزادوں کے سر تن سے جدا کئے جا رہے تھے۔لٹیروں نے شہر میں تباہی مچا رکھی تھی۔گھر اُجڑ رہے تھے۔بہادر شاہ ظفر لال قلعہ کی سنگین دیواروں کو محفوظ نہ پا کر ہمایوں کے مقبرے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔مولوی محمد باقر کو گولی ماری جا رہی تھی۔وہ خود بین اور خود سر شرفا جن کی پُر غرور گردنیں صرف طوق انا سے بجی رہتی تھیں،تختۂ دار کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ایک طرف صہبائی، علوی، مومؔن، آزردہ، نیّرؔ، شاہ نصیر، ذوق، عیش، احسان اور غالب کی شعری صحبتیں تھیں تو دوسری طرف دلی دروازے کے باہر سپاہیوں نے کم عمر محمد حسین آزاد کے ہاتھوں سے ذوق کے کلام کا پلندہ چھین کر فرش پر پھینک دیا تھا اور آزاد بکھرے ہوئے اوراق کو ایک ایک کر کے چُن رہے تھے کہ زمانہ انہیں فراموش کاری کی گرد میں نہ چھپا دے۔

مصنف سیر المتشم کے لفظوں میں:

''۔۔۔(چاندنی چوک میں) صبح سے تا نصف شب رونق و آبادی ہے۔ گرد اُس کے دو دکانیں کمانچہ دار اور شان و قطعہ داری میں نامدار۔شبِ ماہ میں وہ قطعہ مدور بھی ماہِ زمین کہلاتا ہے اور اس کے بیچ کا حوض نقطۂ مرکز دائرۂ قمر نظر آتا ہے۔عصر کے وقت مجمع خلقت سے وہاں ایک کیفیت ہوتی ہے۔ہر امیر و غریب بہ طریق تفنن ہوا خوری کو اس طرف سے نکلتا ہے۔وہاں ہر ولایت کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔''

غالب کہتے ہیں:

''وہ دلی نہیں جس میں سات برس کے سن سے آتا جاتا تھا۔وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا۔بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود قصبہ تھا، اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ و دکانین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور ہماری دکان کہاں تھی؟''

''اے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔''

سی۔ایف۔اینڈریوز کا بیان ہے:

''بہادر شاہ ظفر اب بھی سجے ہوئے ہاتھیوں پر زرق برق پوشاک میں ملبوس قلعۂ معلّی کے ایک مینارِ خاص کی بلندی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں اور تقریبات کا نظارہ کرتے تھے۔قلعے کے باہر وسیع میدانوں میں اکٹھا ہجوم کی نظریں اُن پر پڑتیں اور مغلیہ خاندان کی گزشتہ عظمت کے احساس و احترام اور جوشِ عقیدت میں سب کے سر جھک جاتے۔''

غالب لکھتے ہیں:

''مبالغہ نہ جاننا۔امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہ رہا۔مفصّل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔''

یہ تصویریں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے پر مستقل طنز معلوم ہوتی ہیں ایک ہی شخص نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔غالب کا حصہ دور کا جلوہ بھی نہ تھا۔وہ خود بھی ایک جیتے جاگتے کردار کی طرح تاریخ کے اس المیہ ڈرامے میں شریک تھے۔اور فتح و شکست کا ہر تاثر ایک ذاتی تجربے کے ردِ عمل کی طرح قبول کیا تھا۔قدروں کا ٹوٹنا اور بکھرنا ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔ایسے سانحات وقت کے فطری تسلسل کو رنگا رنگی عطا کرتے ہیں اور انسان کے تہذیبی و فکری سفر میں منزلوں کا تنوع پیدا کرتے ہیں۔لیکن المیہ یہ تھا کہ ایسی قدریں جنہیں غالبؔ نے حرزِ جاں بنا رکھا تھا اور جو اُن کی شخصیت اور مزاج کا اشاریہ بن چکی تھیں، سیاسی اور معاشرتی انتشار کی فضا میں نہ صرف یہ کہ دھندلاتی گئیں بلکہ بری طرح اُن کی بے توقیری بھی ہوئی۔اُن کی شکست و قیر غالب کے لیے ایک ذاتی اور نجی المیے کا حکم رکھتی تھی۔۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے ان قدروں

کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔مغلوں کے سیاسی زوال نے ایک گراں مایہ تہذیب کو رفتہ رفتہ معدوم کر دیا جس کی رسوائی کا سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔اس تہذیب کے انحطاط کی رفتار ۱۸۵۷ء میں پلاسی کی فیصلہ کن جنگ کے ساتھ ہی تیز ہو چکی تھی۔سراج الدولہ کی موت اس تہذیب کی موت کا علامیہ بن گئی۔اسی وقت کلائیو کی قیادت میں انگریزی افواج نے بنگال کے نظام پر قبضہ کر لیا اور اُسی واقعے کے بعد انگلستان میں صنعتی انقلاب کی ابتدا ہوئی۔یہ واقعات بظاہر دور از کار معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب کے عہد کو سمجھنے کے لیے ان باتوں کو جاننا بھی ضروری ہے کہ یہی اس کا پس منظر بنی تھیں۔انگلستان کو صنعتی انقلاب کی کامیابی کے لیے دولت کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل کا سارا بوجھ لارڈ کلائیو نے بنگال کے سر ڈال دیا۔انگلستان میں شہر بستے گئے اور بنگال اجڑتا گیا۔قحط کی حشر سامانی نے بہار اور بنگال کی تین چوتھائی آبادی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔اس کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ عہدِ وسطیٰ کے تمدنی نظام کی پے در پے شکست کا افسانہ ہے۔۱۸۵۷ء کے ساتھ ہی انگلستان کے صنعتی انقلاب کی تکمیل بھی ہوگئی اور ہندوستان کی تہذیبی بساط پر مغربی ثقافت اور فکر و فلسفہ کے تازہ دم مہرے نظر آنے لگے۔پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا کہ تجارت نے حکومت کے لیے راہ ہموار کر دی تھی اور اب ہندوستان باقاعدہ طور پر برطانیہ عظمیٰ کی جلیل القدر مملکت کا حصہ بن گیا۔پنڈت جواہر لال نہرو کے لفظوں میں:

''ہندوستان اس سے پہلے بھی فتح کیا گیا تھا لیکن ان لوگوں کے ذریعہ جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور خود ہندوستانی معاشرے کا ایک جزو بن گئے (اس سے پہلے) ہندوستان نے کبھی بھی اپنی آزادی نہیں کھوئی تھی۔اسے کبھی بھی غلام نہیں بنایا گیا تھا۔ہندوستان کبھی بھی ایسے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کی گرفت میں نہیں آیا تھا جس کا مرکز اس کی جغرافیائی حدود سے باہر ہوتا اور کبھی بھی کسی ایسی طاقت کا غلام نہیں ہوا تھا جو تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے اس سے اس قدر مختلف اور بیگانہ ہوئی۔''

غالبؔ کے زخموں کی قطار میں سب سے گہرا اور پائیدار زخم یہی تھا۔یوں وہ ایک عام انسان تھے۔اپنے عہد کی سیاسی سرگرمیوں میں انہوں نے عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا،لیکن سیاسی تبدیلیوں کا عذاب اس عہد کے دوسرے شعراء کے مقابلے میں سب سے زیادہ غالبؔ ہی کے حصے میں آیا کیوں کہ وہ صاحبِ ادراک بھی تھے اور انہوں نے اپنے شعور کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ رکھی تھیں۔ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح وہ ان سمتوں اور راستوں کا زوال دیکھتے رہے جن سے گزر کر انہوں نے تاریخ کی اس المناک اور طوفان خیز منزل پر قدم رکھا تھا۔اب اُن کے سامنے فکر کی نئی دنیا تھی۔یہ دُنیا ان کے لیے اجنبی بھی تھی اور اندیشوں سے پُر بھی۔مصیبت یہ ہے کہ اس دنیا نے جس معاشرے کی قبر پر اپنے استحکام و امتیاز کی دیواریں کھڑی کی تھیں اس میں بھی غالب کی حیثیت ہمیشہ ایک ناکام اور ہارے ہوئے انسان کی ہی رہی۔اُس معاشرے میں دنیاوی عیش و مسرت کے حصول کے لیے ضمیر کی جن آزمائشوں سے گزرنا ضروری تھا وہ غالب کے لیے قابلِ قبول نہ تھیں کیوں کہ وہ صرف غالب نہ تھے،نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں بھی تھے،سلجوقی ترک بھی تھے اور آبا کا پیشہ سپہ گری تھا۔وہ صرف شاعری کو ذریعہ عزت سمجھنے پر قانع نہیں تھے۔بفرضِ محال انہوں نے ایسا سمجھا بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیوں کہ بقول ناصر کاظمی ''کیا ستم ہے عجم کا ایک سردرواں بلیماراں کے کوچے میں خاک پھانکتا پھرے اور لال قلعہ میں ضاغ و زغن کہرام مچائیں۔''اس شور میں غالب کی آواز چونکہ سب سے زیادہ پُر جلال تھی لیکن صد الصحرا ہی ثابت ہوئی۔ایک ایسے زمانے میں جب کم و بیش ہر شخص زبان وادب کا مذاق رکھتا تھا اور گنتی کے دس پانچ آدمیوں کا غالب کو شاعر یا بڑا شاعر سمجھنا بہت بڑی بات نہیں۔پھر تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ انہیں بحیثیت شاعر آسمان پر اٹھالیا جاتا اور نیچے زمین ویسی ہی لرزہ خیز ہوتی تو بھی کیا ہو جاتا؟

اس صورتِ حال میں غالبؔ کے سامنے نجات کے راستے بھی تھے وہ جیسی کمیاب ذہانت اور بصیرت رکھتے تھے اس کے سہارے بڑی آسانی سے انہیں اس حلقے میں جگہ مل سکتی تھی جس نے قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔لیکن وہ صاحبِ شعور ہونے کے باوجود ایک مصلح یا نظریاتی مبلغ بننا شاید پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ انہیں سچے تخلیقی فنکار کے منصب و مقام کا پاس تھا۔اسی لیے وہ خاموش اور متحیر اپنی ذات کے مرکز پر قدم جمائے رہے اور کائنات کے بدلتے ہوءہ رنگوں کا طلسم دیکھتے رہے۔دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ تصوف کے نام پر ایک انفعالیت زدہ اور مجہول تصور کی خیالی دنیاؤں میں جا بستے لیکن اُن سے یہ بھی نہ ہو سکا۔انہیں تصوف سے دلچسپی ہوئی بھی تو ایسی کہ نیم عملی اور فلسفیانہ نوعیت سے الگ نہ ہو سکی۔آخری صورت یہ تھی کہ انہوں نے تبدیلی اور تباہی کے ہر شور کی طرف سے کان بند کر لیے ہوتے اور بحر و وزن یا ردیف و قوافی کے مشاغل میں ڈوب جاتے یا غفلت اور بے بصری کو اپنا شعار بنا لیتے لیکن یہ اُن کے لیے سب سے زیادہ دشوار تھا کیوں کہ شعور کی مشعل نے اُن کے دل و دماغ کو ہمیشہ روشن رکھا اور شاعری کے معاملے میں اُن کا رویہ شروع سے یہ رہا کہ وہ فکری تجسیم کے لیے لفظ ڈھونڈتے رہے اور لفظوں کو کبھی اپنا رہنما نہیں بنایا۔

انیسویں صدی کا یہ دور جس تہذیبی بحران سے دوچار ہوا اس نے غالب پر بہت گہرے اور دور رس اثرات ڈالے عملی زندگی کی ناکامیوں اور گرد و پیش کی دنیا کے مسلسل انتشار نے انہیں خارجی سطح پر بالکل پسپا کر دیا تھا۔دل شکستگی کے بہانے اسی وقت سے غالبؔ کا تعاقب کر رہے تھے جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا تھا۔شب و روز کے تماشوں نے انہیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ دنیا بازیچۂ اطفال ہی نہیں،آئینۂ آگہی بھی ہے۔جس میں عبرت و حیرت کی ہزار ہا تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔پنشن کی بحالی کے لیے جب انہوں نے کلکتے کا سفر کیا اور اہلِ کلکتہ نے ایک مہمان شاعر کی پذیرائی کے بجائے اس پر بے مہریوں کی

یورش شروع کر دی تو غالب ایسے پریشان ہوئے کہ کچھ دیر کے لیے پاسِ وضع کا بھی اُنہیں خیال نہیں رہا اور آباء اجداد کی شوکت وحشمت کا راگ الاپنے والے اور اپنی محرومیوں پر ظرافت اور بذلہ سنجی کا غلاف چڑھانے والے سپاہی نے خستہ حال اور بے سروسامان شاعر کے مقابلے میں ہار مان لی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ہی لاش ڈال دی اور آپ اپنے نوحہ گر بن گئے۔ مثنوی بادِ مخالف کے یہ اشعار دیکھئے۔

کیستم ؟ دل شکستہ غمزدۂ   بید لے خستۂ ستم زدۂ
برق بے طاقتی بجاں زدہ   آتشِ غم بجا نماں زدۂ
از گدازِ نفس بہ تاب وسہے   در بیابانِ یاس تشنہ لبے
خسِ طوفانیٔ محیط بلا   سر بسر گردِ کاروانِ فنا
درد مندے جگر گداختۂ   از غم دہر زہرہ باختۂ

اُن کے احساس پر یہ درد بھی چھایا ہوا تھا کہ رسوائی کی یہ داستان اُن کے بعد بھی دہرائی جائے گی اور لوگ کیا کچھ نہ کہیں گے:

کہ پس از من بسا لہائے دراز   بہ زباں ماندریں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا   چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت   زحمتے وا وراہِ خویش گرفت
شوخ چشمے وزشت خوئے بود   بے حیائے و ہرزہ گوئے بود
ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت   ہر خرابا تیانہ ہوئے داشت
برگِ دنیا نہ ساز ونیش بود   تنگِ دہلی و سرزمینش بود

ان اشعار میں المناکی اور ویرانی کی جو ہولناک اور طوفان خیز فضا ملتی ہے اس سے مجموعی طور پر تاثر مرتب ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنے شخصی وقار اور افتخار کا ہر نقش کھو بیٹھے تھے لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اپنے بے برگ و بار ہونے کا ماتم کرتے ہوئے بھی انہوں نے یہ یاد رکھا کہ آنے والا زمانہ اُن کی شوخ چشمی ، زشت خوئی اور قلندرانہ ہاؤ ہو کو بھی فراموش نہ کر سکے گا۔ اس تاثر کے پردے میں شخصیت کے انفرادی نشان اور سربلندی کا سراغ بھی مل جاتا ہے اور ذہن اس نظریاتی حقیقت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت غالب نے ایک شعر میں فرزندِ آذرؔ کی مثال دیتے ہوئے اس طرح کی کہ صاحب نظری دینِ بزرگاں کو کبھی خوش نہیں کرتی۔ مصائب و حرماں نصیبی کے حصار میں بھی ذہانت اپنی فلسفہ طرازی سے ناکامیوں کا جواز فراہم کر لیتی ہے۔ اس ذہانت نے ہر بُرے وقت میں غالب کا ساتھ دیا۔ توکل اور قناعت اُن کے بس کی بات نہیں تھی کہ یہ رویہ ان لوگوں کا ہے جو دُنیا کی آسائش و کشش کی طرف سے غافل رہتے ہیں یا پھر ایسے خدا رسیدہ لوگوں کا جو سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں اصل حقیقت کے علاوہ سب کچھ باطل دکھائی دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وحدت الوجود کی اس روایت کا عکس غالب کے شعور میں بھی ملتا ہے لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کو اس دائرے میں سمٹنے نہیں دیا تھا۔ بے چون و چرا بڑی سے بڑی حقیقت کو تسلیم کر لینا اُن کے فطری تجسس اور ذہنی کرید کے منافی تھا۔ اسی لیے انہوں نے یہ دونوں راستے چھوڑ کر ایک تیسرا راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ عروج و زوال کے باہمی روابط کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر جا پہنچے کہ جب روشنی اور تیرگی ناگزیر ہیں تو اُن سے گھبرانا فضول ہے۔ ان کے نزدیک یہ باہم برسرِ پیکار آوازیں ایک ہی ساز سے بیدار ہوئی تھیں اور وہی ساز وجود و عدم دونوں کا علامیہ ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر دانش و عبادت دونوں لاحاصل ہیں۔ کیوں کہ دنیا و دین کی بساط دُردِ یک ساغر غفلت سے زیادہ کچھ اور نہیں دنیا غالب کی نظروں میں اندھیری تھی اور عقبیٰ کی طرف سے بھی انہیں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ چنانچہ دونوں پر خطِ تنسیخ کھینچ کر انہوں نے اپنی بے بضاعتی کی کوفت سے نجات پائی۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرزِ فکر نے غالب کی شخصیت کے انفرادی نقوش کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔ لیکن ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا ذہن جب معرفت کے لحاظ تجربے سے آزاد ہو کر حقائق کی زد میں آیا تو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بے اطمینانی، کسک، اضطراب اور خلش ان کا مقدر بن گئی۔ اضطرابِ مسلسل کا یہی اندازِ غالبؔ کی شخصیت میں اس وقت بھی ایک فکری تابندگی اور نظم و ضبط کا پتہ دیتا ہے جب اُن کے حواس ہواؤں کے قہر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔

اب غالب کی تصویر کے ایک اور رُخ پر نظر ڈالیے۔ سرسید نے جب بڑی محنت اور لگن سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی اور غالب سے ایک منظوم تقریظ کی شکل میں اپنی جاں فشانی کی داد طلب کی تو غالب نے دوستی کی جذباتی کمزوریوں یا مصلحت کی پروا کیے بغیر بہت کھُلے لفظوں میں کہا:

مُردہ پروردن مبارک کارنیست
خود بگو کاں نیز جُز گفتار نیست

یہاں مُردہ پروری سے مراد ماضی کے غبار میں کھوئے ہوئے آئین کے تئیں اظہارِ عقیدت سے ہے جو غالب کے خیال میں آئینِ روزگار کے سامنے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب سا شخص جس نے مغلوں کے ثقافتی ورثے کی بربادی کا ماتم کیا تھا، یک بارگی اُن کی کہانی سُن کر بے مزہ کیوں ہو گیا اور اُن کی رفعت و شکوہ سے منحرف کیوں ہو گیا؟ یہاں معاملہ انحراف کا نہیں بلکہ تاریخ کے جدلیاتی ارتقاء کے شعور اور ایک ترقی پذیر زندہ و متحرک احساس کا ہے۔ پرانی قدروں میں کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں غالب نے اپنی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں خام مواد کی حیثیت دی تھی اور اُن کے بغیر غالب کی وجودی ہیئت کی تکمیل دشوار تھی۔ وہ خود پرست نہیں تھے لیکن عرفانِ نفس کا مرتبہ سمجھتے تھے۔ اپنی ذات سے انہیں محبت بھی تھی کیوں کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا مقام اور معیار بھی سمجھتا تھا۔ ان میں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ایماندارانہ تنقیدی نظر ڈالنے کی عادت بھی تھی چنانچہ اُن پر لعنت ملامت کرنے والوں اور طنز و تمسخر کی بوچھار کرنے والوں میں اُن کا نام اپنے دشمنوں اور معترضوں سے پیچھے نہیں۔ اُن کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بہر صورت وہ خود کو بچانا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مڑی تڑی شخصیت بھی جوہرِ حیات

سے خالی نہیں۔اس لیے انہوں نے ان قدروں کا مرثیہ بھی کہا جوانہیں عزیز تھیں اور زندگی کے اُن تمام نئے تقاضوں کا خیر مقدم بھی کیا جوان قدروں کو نیا لباس عطا کرنے اوراُن کی حفاظتی فصیل بننے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے لگ بھگ اکتیس برس کی عمر میں غالب نے کلکتے کا سفر کیا تھا وہاں انہوں نے اس توانا اور سرکش عالمی معاشرے کے خال وخط دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے تھے جو صنعتی انقلاب اور سائنسی تصورِ حیات کے غلبے سے عصرِ رواں کا کردار بن چکا تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں نے پہلے معاشی تسلط قائم کیا، پھر سیاسی اقتدار حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ عروج میں ہر چند کہ مغل شہنشاہ کا نشان باقی تھا لیکن نام مٹتا جارہا تھا۔ معاشی اور سیاسی اقتدار کی ایک متوازی لکیر کے طور پر مغربی فکر وفلسفہ،علوم اور نظریۂ زندگی کی لکیر بھی ہندوستان کے تمدنی نقشے پر کھینچی گئی۔ ہندوستانی کلچر لارڈ میکالے کے لفظوں میں خرافات اور توہمات کا پشتارہ قرار دے دیا گیا۔سرکاری نظم ونسق کی زبان فارسی کی جگہ انگریزی ہوگئی۔ دلّی،کلکتہ اور ملک کے دوسرے حصوں میں انگریزی کالج قائم کیے گئے۔اصلاحی تحریکات کا شور بلند ہوا اور دیکھتے دیکھتے کئی انجمنیں قائم ہوگئیں جن کا مقصد قدیم عقائد کو جدید سے ہم آہنگ کرنا یا از کار رفتہ ہونے کی صورت میں اُن سے چھٹکارا پانا تھا۔تہذیبی اور فکری تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ ماضی قریب کا زمانہ بھی صدیوں پُرانا اور فرسودہ نظر آنے لگا۔صدیوں کے تسلیم شدہ اخلاقی اور تہذیبی معیار ناقص اور بے معنی قرار دے دیئے گئے۔

یہ منزل غالب کے لیے بہت دشوار تھی ایک طرف ماضی کی اُداس اور شادماں یادوں کا بارِ گراں تھا اور دوسری طرف حال کی دیدہ دلیریاں۔ وہ ان دونوں کی طرف سے نہ تو آنکھیں بند کرنا چاہتے تھے اور چاہتے بھی تو یہ ممکن نہ تھا۔انہوں نے دلّی کا شباب دیکھا تھا پھر اس کی ویرانی دیکھی اور اب نئے روپ رنگ میں اس کا نیا جنم دیکھ رہے تھے۔انہیں یہ اطلاع بھی تھی کہ لندن کے رخشندہ باغ میں شہر بے چراغ روشن ہیں۔وہاں نغمہ وساز محتاج زخمہ نہیں رہ گئے اور فضاؤں میں حروف طیور کی طرح پرواز کرتے ہیں۔ایک طرف بیتے ہوئے لمحوں کی کسک تھی اور دُوسری طرف سامنے کی دنیا کا شور شرابہ تھا۔حالؔی کے بیان کے مطابق اُن کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ مانگ کر کتابیں پڑھنے کے علاوہ کتابیں خریدنے کی اُنہوں نے کبھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ پھر کتابِ زندگی کے ان واقعات کو وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے جو تاریخ نے اُن کے شعور کے صفحات پر لکھے تھے اور اب ہوا کی پیشانی پر نئے سوالات کی شکن تھی جن پر غالب کی زمانہ شناس اور دُور بیں نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔نتیجہ ایک کشمکش کی شکل میں نمودار ہوا۔غالب کے لیے سب سے بڑا سہارا یہی تھا کہ انہوں نے نہ تو ماضی سے اپنی نظریاتی عقیدتیں رشتۂ ایمان کی طرح منسلک کی تھیں اور نہ حال کا طنطنہ اُن کے لیے حرفِ حق کی حیثیت رکھتا تھا۔ زندگی کے چند انتہائی بدنصیب اور حوصلہ شکن لمحات کو چھوڑ کر اُن کی وفاداری اپنی ذات سے مسلم رہی اور کائنات کے ہر پہلو کو انہوں نے اپنی ذات ہی کے آئینے میں دیکھا۔ خارجی حالات اور عوامل نے اُن کی مادی زندگی کے راستوں کے تعین میں بہت اہم حصہ لیا لیکن اُن کی ذات تبدیلیوں کا اثر قبول کرنے کے باوجود اپنی انا اور انفرادی وجود کے سائے سے کبھی باہر نہ نکلی۔اس لیے غالب کی شخصیت نہ صوفیانہ عقائد کے پردوں میں چھپ سکی نہ زمانے کے مروّجہ ادبی مذاق میں جذب ہوسکی، نہ تبدیلیوں کے نشے میں ماضی سے بالکل بے تعلق ہوسکی اور نہ غیر مشروط طور پر اُس نے حال کے آئینِ روزگار کو الف سے ''یے'' تک قبول کیا۔حالات اور واقعات کے بلاتا خیز سمندر میں گردن تک ڈوبے ہونے پر بھی انہوں نے انفرادیت کے ساحل سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ مادی پریشانیوں کے انتہائی پُر آشوب زمانے میں جب گھر کے کپڑے لتے تک بِک چکے تھے اور وہ پنشن کی بحالی کے لیے کلکتے جارہے تھے،انہوں نے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں معتمد الدولہ آغا میر سے محض اس لیے ملنا پسند نہیں کیا کہ ملاقات کی شرطوں کو وہ اپنے احساسِ غیرت کے منافی سمجھتے تھے۔۱۸۴۰ء میں جب اُن کے اندر کا شاعر انتہائی مفلوک الحال ہو چکا تھا اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں کے لیے عزت کی روٹی بھی حاصل کرنا دشوار تھا۔انہوں نے دلّی کالج کی فارسی مدرسی کا عہدہ صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ مناسب طریقے سے اُن کا خیر مقدم نہیں کیا گیا۔اُن کی آزادی اور خود بینی درِ کعبہ کو بھی بند دیکھ کر احساسِ بندگی کے وفور کے باوجود ترک دینے کی روادار نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس رویے نے انہیں انتشار اور عدم توزان سے بچالیا، ورنہ حالات نے کون سی کسر باقی رکھی تھی۔

غالب کے اشعار میں ذات کی شکست کا احساس ضرور ملتا ہے لیکن شخصیت کے زوال کا شائبہ تک نہیں۔اُن کی شکست دراصل ایک سپاہی کی شکست تھی اسی لیے اس کے المیاتی احساس کا شکار ہو کر بھی انہوں نے اپنی آواز کا سر جھکنے نہ دیا۔عرصہ ہوا خوشبو کی ہجرت کے عنوان سے ایک مذاکرہ سویرا میں شائع ہوا تھا۔ اس مذاکرے میں شیخ صلاحی الدین، ناصر کاظمی، انتظار حسین اور حنیف رامے شامل تھے۔غالب کے عہد پر باتیں کرتے ہوئے انتظار حسین نے کہا تھا۔ ''غالب اپنے آباواجداد کے پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھے اور سپاہی کو ''جنگ'' فتح اور کبھی کبھی شکست سے بہرہ ور اور دوچار ہونا پڑتا ہے۔'' یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن جب آگے چل کر انتظار حسین یہ کہتے ہیں کہ (غالب) کے جذبات ایک ایسے ذہین بچے کے سے ہیں جو ہر چیز پر قبضہ چاہتا ہے، ہر نعمت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے، ہر آسائش کو اپنا حق سمجھتا ہے اور جب اسے مایوسی ہو تو کہرام مچاتا ہے، لڑنے مرنے پر تل جاتا ہے اور اس کے بعد منہ بسورے کسی کونے میں تخلیات کی دنیا میں کھو جاتا ہے، جہاں اُسے آخری پناہ ملتی ہے تو انتظار حسین ایک بہت بڑی بھول کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مادّی وسائل اور دنیاوی جاہ ومال کے حصول کی طلب ایک حد تک غالب میں ضرور تھی لیکن انہوں نے محض اسی کو اپنا نصب العین کبھی نہیں سمجھا۔انہیں جو سوالات پریشان کررہے تھے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مادّی نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری تھے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی میں کبھی بھی انہیں معاشی فراغت اور خوش حالی نصیب نہیں ہوئی لیکن ان باتوں نے انہیں حواس باختہ کرنے کے باوجود بجھایا نہیں۔شکستِ ذات کے جو گہرے، گونجیلے اور پیچ در

باقی صفحہ ۷ پر ملاحظہ کیجیے

شمیم حنفی: تنقید کا تخلیقی آہنگ

سرورالہدیٰ
(دہلی، بھارت)

شمیم حنفی کو توجہ کے ساتھ پڑھا گیا مگر ان کی تنقید کو موضوع گفتگو نہیں بنایا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو شمیم حنفی کی تنقیدی فکر ہے جو قاری کو مشتعل نہیں کرتی۔ مشتعل کرنے والی تنقید ردعمل پر آمادہ کرتی ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید قاری سے صرف اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے ایک مکالمہ کے طور پر دیکھا جائے اور یہ کہ وہ تنقید کا فریضہ انجام نہیں دے رہی ہے۔ شمیم حنفی کے تنقیدی مضامین اہم ترین رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے اقتباسات مختلف مطالعات میں مل جاتے ہیں لیکن ان مضامین کی روشنی میں شمیم حنفی کے تنقیدی اختصاص پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بڑی بات یہ ہے کہ شمیم حنفی کو ادب کے سنجیدہ قارئین ملے۔ میں ناقدین کی بات اس لیے نہیں کرتا کہ ان کے مسائل کچھ نفسیاتی نوعیت کے بھی ہیں۔

شمیم حنفی کی تنقید کے لیے 'تنقید کا تخلیقی آہنگ' جیسا عنوان دیکھ کر وہ لوگ حیرت زدہ نہیں ہوں گے جو تنقید کو بطور زبان دیکھتے ہیں اور تنقید کی زبان تخلیقی نوعیت کی بھی ہوسکتی ہے۔ تنقید کا تخلیقی آہنگ' ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تنقیدی عمل تخلیقی متن پر ایک اور تخلیقی متن بنانا بھی ہے اور اس صورت میں تنقید کی زبان بہت منطقی اور سائنسی نہیں ہوسکتی۔ تخلیقی متن کا اسرار اگر تنقیدی زبان کو بھی پراسرار بنادیتا ہے تو یقیناً اسے تنقید کے منافی سمجھا جائے گا۔ لیکن تنقید صرف سائنسی نقطۂ نظر کی وجہ سے ہمارے لیے بامعنی نہیں ہوسکتی، نقاد اپنی ذہنی فلاشی کو منطقی اور وضاحتی آہنگ کے ذریعہ بہت دیر تک چھپا نہیں سکتا۔ جو چیز کسی قاری کے لیے اول و آخر اہمیت کی حامل ہے وہ بصیرت ہے۔ لیکن جو تنقیدی نثر حالی، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کی ہے۔ محمد حسین آزاد اور فراق کی نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ان شخصیات کے اذہان ہی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ زبان کی ساخت اولین صورت میں تو ذہن کی ساخت سے تحریک پاتی ہے۔ یوں دیکھیں تو ذہن اور زبان کی ساخت ایک ہوجاتی ہے۔ جن ناقدین کی تنقیدی نثر منطقی اور شفاف ہے ان کے ذہن کی ساخت بھی بڑی حد تک منطقیت اور شفافیت سے منسلک ہوتی ہے یا کم سے کم تنقید لکھتے وقت منطقی لہر زیادہ حرکت میں آجاتی ہے۔ شمیم حنفی کے تنقیدی ذہن پر ہمیشہ تخلیقی آہنگ غالب رہتا ہے۔ تخلیقی آہنگ دراصل غور وفکر کا ایک مختلف عمل ہے جس کا رخ داخل کی طرف ہوتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید کسی فن پارے کے بارے میں ایک وسیع تر سیاق کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لہٰذا ایک موضوع کے ساتھ کئی موضوعات نکل آتے ہیں۔

ایک موضوع کے ساتھ دیگر موضوعات کا نکل آنا لکھنے والے کی داخلی مجبوری ہے۔ یہ داخلی مجبوری بہتوں کی ہوسکتی مگر لوگ اس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شمیم حنفی کی بعض تحریروں میں موضوع سمٹنے کے بجائے پھیلتا جاتا ہے اور یہ پھیلاؤ بھی چونکہ تخلیقی آہنگ لیے ہوئے ہے لہٰذا ایک قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح تخلیقی متن کا حصہ بنتا جارہا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ نقاد اور قاری تخلیق کے باہر نہیں بلکہ اندر ہے۔ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی زبان سے باہر نہیں ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید ایک معنی میں مصنف دوم کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔ مصنف دوم کوئی بھی باشعور نقاد یا قاری ہوسکتا ہے جو متن کو اپنے طور پر پڑھتا ہے۔ اسے مصنف اول کی ارادی معنویت سے کوئی مطلب نہیں۔ شمیم حنفی مصنف دوم کے طور پر متن کی جس طرح تفہیم و تعبیر کرتے ہیں وہ خود ایک پراسرار عمل کا حصہ معلوم ہوتا ہے اور اس طرح وہ مصنف دوم میں مصنف اول کا تاثر بھی پیش کرتے ہیں۔ شمیم حنفی کی تنقیدی زبان کیوں کر تخلیقی عمل کی پراسراریت کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسے سمجھنا مشکل بھی ہے اور نہیں بھی۔ مشکل ان کے لیے جو اس سبق کو بھولتے نہیں کہ تنقید کی زبان شفاف اور منطقی ہوتی ہے۔ اس سبق کو یاد رکھنے کے باوجود تنقیدی زبان کے تعلق سے اپنے ذہن اور ذات کو کشادہ کیا جاسکتا ہے۔ تنقیدی زبان میں اسرار کے پیدا ہونے کا سبب ادب کو اپنی ذات پر طاری کرلینا بھی ہے۔ شمیم حنفی نے جن اہم شعرا و ادبا پر لکھا ہے وہ ان کا انتخاب ہے مجبوری نہیں۔ مثلاً میر، غالب، شاد، اقبال، یگانہ اور فانی کے بعد ان کے پسندیدہ شعرا راشد اور میراجی ہیں۔ جو راشد اور میراجی شمیم حنفی کے ہیں وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے نہیں۔ شمیم حنفی نے عموماً جو تنقیدی نتائج اخذ کیے ہیں انھیں داخلی تعبیر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے:

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

شمیم حنفی نے مطالعۂ متن میں معنی کی تلاش سے زیادہ انسانی تجربات اور محسوسات کو تلاش کیا۔ کیا انسانی تجربات اور محسوسات معنی کا بدل ہوسکتے ہیں یا انھیں بطور معنی قبول کیا جاسکتا ہے؟ شمیم حنفی کی تنقید کو پڑھ کر لگتا ہے کہ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ معنی کی دریافت تو ایک فطری عمل ہے لیکن معنی کا تعین ایک فریب ہے۔ شمیم حنفی دریدا کے التوائے معنی کے تصور کو قبول کریں یا نہ کریں مگر عملی سطح پر انھوں نے التوائے معنی ہی کو تقویت پہنچائی ہے۔ انھوں نے شاید ہی کسی متن کے تعلق سے کسی ایک معنی پر اصرار کیا ہو۔ وہ اچھے متن کی طرح معنی اور مطالعے کی طرفوں کو کھلا رکھتے ہیں، بعض اوقات ان کے یہاں اتنے اطراف پیدا ہوجاتے ہیں کہ ہمیں یہ شکایت ہونے لگتی ہے کہ تنقید کو کسی ایک مسئلے سے متعلق ہونا چاہیے۔ پتہ نہیں غالب کے ذہن میں کیا بات تھی جس نے ان سے مندرجہ بالا شعر کہلوایا۔ شمیم حنفی کو بھی اہل طلب کی طرف سے طعنۂ نایافت سننا پڑا ہوگا۔ طعنۂ نایافت کا تعلق معنی کی کشید اور دریافت سے ہے ایک اچھے متن کے مطالعہ کا حاصل ہمیشہ معنی کی کشید یا دریافت نہیں۔ مطالعہ ایک معنی میں حاصل مطالعہ بھی ہے۔ لہٰذا شمیم حنفی نے یہ تاثر بھی دینے کی

کوشش کی ہے کہ اہلِ طلب کا تشنۂ نایافت برحق مگر ایک حساس قاری کے طور پر متن میں ڈوب جانا، اس میں کھو جانا سعادت اور اعزاز کی بات ہے۔

شمیم حنفی کا تنقیدی سفر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ اس عرصے میں ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں۔ کتابوں کے مشمولات کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر میں شمیم حنفی ایسے تنہا نقاد ہیں جنھوں نے خود کو ادب کی کسی خاص صنف اور ہیئت تک محدود نہیں رکھا۔ بظاہر یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ بیک وقت مختلف اصناف، شخصیات اور ان سے وابستہ متون کو پڑھنا اور ان کے درمیان اختلاف او وحدت کو تلاش کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے جتنے معاصرین پر لکھا ہے اس میں بھی کوئی ان کا ہم سر نہیں۔ میں اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ خوف کا بھی احساس ہوتا ہے۔ حیرت تو اس لیے کہ ایک تنقیدی ذہن کس طرح ادب کے پرانے اور نئے مسائل پر مسلسل غور کرتا رہا ہے۔ خوف کا تعلق ادبی معاشرے کی اس عمومی روش سے ہے کہ وہ صبر اور توجہ کے ساتھ ادبی و تنقیدی تحریروں کا مطالعہ نہیں کرتا۔ یوں تو یہ شکایت ہر زمانے میں کی جاتی رہی ہے مگر آج جو صورت حال ہے اس میں شمیم حنفی کے پورے تنقیدی سرمائے پر نگاہ ڈالنا مشکل ضرور ہے۔ میں اس گفتگو میں شمیم حنفی کے معاصر نقادوں کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اہم ترین معاصرین کا جو تنقیدی اختصاص یا رویہ ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں شمیم حنفی کی تنقید کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ انھوں نے ایسے کئی مضامین لکھے جن میں نئی تنقید یا نئے تنقیدی مسائل کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کی گرفت کی گئی ہے۔ مجھے یہ بات آج بھی پریشان کرتی ہے کہ جس شخص نے 'نئی شعری روایت' اور 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' جیسی نظری کتاب لکھی ہو۔ اس کے نزدیک نئی تنقید کے مسائل اور ان مسائل کے اظہار کی زبان کیوں کر غیر دلچسپ ہوتی گئی۔ یہ دونوں کتابیں بنیادی طور پر شمیم حنفی کی ڈی لٹ کا مقالہ ہے۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے اہم اداروں سے ان کتابوں کی اشاعت یہ بتاتی ہے کہ مصنف کی دلچسپی ان کتابوں میں پوری طرح قائم ہے۔ ان کتابوں میں جو تنقیدی ذہن ہے اور اس ذہن نے جدیدیت کے سیاق میں جن علوم کا بوجھ اٹھایا تھا اس کا یارا ان کے معاصرین یا بعد کے لوگوں میں کس کے یہاں تھا یا ہے۔ آپ ان کتابوں کے نظری مباحث سے چاہے جتنا بھی اختلاف کریں، مگر جدیدیت سے وابستہ تصورات کو اتنے بڑے کینوس میں رکھ کر کسی نے نہیں دیکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت اردو ادب کا بنیادی مسئلہ بن رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بعض ادبی اور تہذیبی روایت کے سلسلے میں ان کا رویہ نہایت سخت ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جدیدیت کے یہ مباحث سب کچھ بہالے جائیں گے۔ شمیم حنفی کی ان دو کتابوں کا خوف بدستور قائم ہے۔

شمیم حنفی کا تنقیدی ذہن اپنے جس اسلوب کے ساتھ ان کتابوں سے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اس نے ادبی معاشرے کے لیے بڑے مسائل پیدا کیے اور بعد کو شمیم حنفی نے اپنے عہد کے تنقیدی اسلوب پر جیسی گرفت کی اس کا کوئی رشتہ ان کی دو اہم کتابوں سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ 'نئی شعری روایت' اور 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' میں علم و آگہی کی سطح نہایت بلند ہے۔ اس کے کئی ایسے حوالے اور ماخذ ہیں جن تک بہت لوگ پہنچ نہیں سکے۔ ابتدا میں علمی اور تنقیدی ڈسکورس کی زبان مشکل ہو ہی جاتی ہے، اور فطری طور پر علم و آگہی کا پورا حصہ سینے کا نور نہیں بن پاتا۔ ان کتابوں میں شمیم حنفی کا علمی اور لسانی وفور کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسے اپنے عہد کے نقاد یا قاری کی ذہنی سطح کی پرواہ نہیں۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ وارث علوی جیسے بڑے نقاد کو 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پر اتنا طویل مضمون لکھنے کا مواد مل گیا۔ یہ تمہید دراصل شمیم حنفی کے ان چند مضامین کے تجزیے کی ہے جن میں نئی تنقید کی زبان اور اس کے سروکار کی سخت گرفت کی گئی ہے۔ نئی تنقید جس طرح شمیم حنفی کے لیے ایک مسئلہ بنی اس کی کوئی دوسری مثال ان کے معاصرین کے یہاں نہیں ملتی۔ ایک ایسا نقاد جو نئی تنقید کے تمام اہم نقادوں کے درمیان رہا ہو اور جس نے ان نقادوں کے تنقیدی ارتقا کو نزدیک و دور سے دیکھا ہو اس کی برہمی کو ہم آسانی سے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے آل احمد سرور کا خیال آتا ہے جو ترقی پسند ہونے کے باوجود جدیدیت کا استقبال کرتے ہیں اور جدیدیت کے ذریعہ لائی گئی فکری و لسانی دولت سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، البتہ ان کے یہاں بھی نئی تنقید کی زبان اور اس کی ترجیحات سے کہیں کہیں ناراضگی پائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر انھوں نے نئی چیزوں کا استقبال کیا۔ شمیم حنفی جدیدیت کے تعلق سے یقیناً کشادگی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن مابعد جدیدیت کی بحثوں سے انھوں نے خود کو تقریباً الگ کر رکھا ہے۔ ان کی زبان سے میں نے بارہا فراق کا یہ شعر سنا ہے:

مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے
نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے

شمیم حنفی کو نئے خیال نے کبھی نہ تو پریشان کیا اور نہ ہی ڈرایا لیکن یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ ان کے یہاں تھیوری اور تنقیدی نظام وغیرہ سے کیوں کر اجتناب ہے۔ اس سوال کا جواب شمیم حنفی کی تحریریں ہی فراہم کرسکتی ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں تھیوریز اور نظریات سے بیزاری کا سبب دوسروں سے خود کو الگ کر کے دیکھنے کا غرور تو نہیں۔ میرے پیش نظر شمیم حنفی کے چار مضامین ہیں جنھیں موضوعِ گفتگو بنائے بغیر نہ تو شمیم حنفی کی تنقید کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان کے عہد کی تنقید کو۔ آخر کوئی سبب تو ہے کہ گذشتہ دو تین دہائیوں میں انھوں نے تھیوریز اور نظریے کو تخلیقی اور ادبی معاشرے کے لیے ضرر رساں بتایا ہے۔ ان کی کتابوں کے دیباچے میں بھی تنقید اور عصری منظر نامے سے مایوسی کا اظہار ملتا ہے۔ شمیم حنفی اس حقیقت کا گہرا ادراک رکھتے ہیں ان کی ناراضگی اور ناپسندیدگی سے تنقید کا عمومی منظر نامہ تبدیل نہیں ہوگا لیکن انھوں نے ادب کے سنجیدہ قاری کو اپنا مخاطب ضرور بنایا ہے۔ مجھے یہ بات بھی پریشان کرتی ہے کہ جب ایک عام اور اوسط ذہن کا قاری یا نقاد نئے پرانے نظریات اور تھیوریز پر اظہارِ خیال کرسکتا ہے تو شمیم حنفی جیسا ذہین اور باخبر

نقاد کیوں کران مسائل میں گہری دلچسپی نہیں لے سکتا۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو چند اصطلاحوں کو لکھتے اور بولتے ہوئے تھیوریز کے ماہر ہوگئے اوران کی زبان سے یہ بات بھی سنی گئی کہ شمیم حنفی فکری مسائل سے گریز اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات تو ہمیں ایک نہ ایک دن سننی ہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی۔ اس کا جواب شمیم حنفی کی یہ شعوری کوشش ہے کہ تھیوریز کوادبی تنقید کا مسئلہ نہ بنایا جائے اور اس صورت میں ان ناقدین پر ایک طنز کا پہلو بھی نکلتا ہے جو تھیوریز کے ماہر ہونے کے باوجود شمیم حنفی کی تنقیدی بصیرت تک نہیں پہنچ سکے۔ لہٰذا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شمیم حنفی نے اپنے عہد کے ادبی وتنقیدی منظرنامے کو بہت سلیقے کے ساتھ ایک آئینہ دکھایا ہے۔ میں شمیم حنفی کی تنقید کو متبادل تنقید کا نام بھی دینا نہیں چاہتا۔ اس میں ہمیشہ یہ خطرہ بنا رہتا ہے کہ معاصر تنقید گویا اس کے لیے ایک فضول سی ادبی سرگرمی ہے۔ شمیم حنفی نے ناقدین پر مضامین ضرور لکھے مگر کسی خاص نظریے کو عنوان بنا کر کوئی مضمون نہیں لکھا۔ البتہ تنقید کے مختلف رویوں کی نظری اور عملی صورت ان کی تحریروں میں مل جاتی ہے۔ ان رویوں کو عموماً انھوں نے مروجہ اصطلاحوں کے بغیر بھی پیش کیا ہے لہٰذا ان میں ایک انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ ادب کے مختلف اسالیب سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش قرأت اور تنقید کی آمریت سے خود کو بچانے کی ایک کوشش ہے۔ شمیم حنفی کو یوں تو غیر ترقی پسند نقاد کہا جاتا ہے لیکن انھوں نے ترقی پسند شعراء ادبا پر لکھتے ہوئے جدیدیت کے ایجنڈے کو پیش نظر نہیں رکھا۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ایک متن کی قیمت پر دوسرے متن کو رد کرنا ٹھیک نہیں۔ ترقی پسند شاعری کا وہ حصہ انھیں زیادہ اپیل کرتا ہے جس کا تعلق انسانی تجربات یا انسانی سروکار سے ہے۔ ممتاز حسین، سردار جعفری اور محمد حسن کی تحریریں انھیں اسی بنا پر عزیز ہیں کہ ان میں علم کے ساتھ انسانی زندگی سے گہرا اور سچا سروکار ہے۔ ترقی پسند تنقید کی یہی وہ تثلیث ہے جو انھیں ترقی پسند تنقید کی روشن روایت پر اصرار کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ شمیم حنفی کی کئی تحریروں کا مزاج ترقی پسند تنقید سے بہت قریب ہے۔ یہ تبدیلی شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری ہے۔ جدیدیت نے ادب کے سماجی سروکار کو جس حقارت کے ساتھ رد کیا تھا اس کا ردعمل تو ہونا ہی تھا۔ شمیم حنفی نئی تنقید پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے خود کو تھیوریز میں قید کرلیا ہے اور ایک خاموش لسانی جزیرے میں تبدیل ہوگئی۔ جب ہم ترقی پسند تنقید کے بڑے نقادوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظریے کی سطح پر یہاں بھی تھیوریز کو برتنے، سجانے اور پیش کرنے کی غیر معمولی کوشش نظر آتی ہے۔ ممتاز حسین کی صرف ایک کتاب 'حالی کا نظریہ شعری' کو دیکھا جاسکتا ہے۔ سردار جعفری کی کتاب 'ترقی پسند ادب' اور محمد حسن کی کتاب 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر' کو تھیوری اور تنقیدی نظریے سے الگ کرکے دیکھا نہیں جاسکتا۔ شمیم حنفی ان ناقدین کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں تھیوری سے ان کی بیزاری کا سبب کیا ہے۔ مضمون 'نئی تنقید کا المیہ' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ایسی تنقید جو انسانی تجربوں سے زیادہ دلچسپی تصورات اور نظریات سے رکھتی ہو، ہمارے نظام احساس میں نہ تو کوئی تبدیلی پیدا کرسکتی ہے۔ نہ ہی زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ تہذیبی زندگی میں کسی بامعنی رول کی ادائیگی کے لیے تنقید کو ادب کی طرح اجتماعی تہذیب کی عام سرگرمی کا حصہ بننا پڑے گا۔ گئے زمانوں میں نقاد کے لقب کی تہمت اٹھائے بغیر ادبی رموز ونکات کے مفسر اور ادب پاروں کی شرح لکھنے والے یہی خدمت انجام دیتے تھے مگر جب سے تنقید، سماجی اور سائنسی علوم کی طرح اختصاص کے دائرے میں داخل ہوئی ہے، اپنی اس طاقت اور استعداد سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔''

اس اقتباس میں شمیم حنفی کے وہ تمام اعتراضات اور خدشات سمٹ آئے ہیں جن کا اظہار نئی تنقید کے سلسلے میں انھوں نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ اس اقتباس کی روشنی میں جو چند باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں وہ کچھ یوں ہے:

نئی تنقید انسانی تجربوں میں دلچسپی اس لیے نہیں رکھتی کہ اس صورت میں اس کا علمی چہرہ زیادہ روشن ہوگا۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ نئی تنقید نے نظریات کا اطلاق متن پر نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو اس کا تعلق انسانی تجربات سے نہیں تھا۔ اس سے یہ سوال بھی وابستہ ہے کہ مختلف متون میں انسانی تجربوں کی نوعیت کیا یکساں ہوگی، انسانی تجربوں کی تلاش اور تعبیر کے لیے کسی نظریے کی ضرورت ہے یا نہیں، کیا انسانی تجربوں کو عام انسانی محسوسات اور واردات کا نام دیا جاسکتا ہے؟ یا اس میں شک نہیں انسانی تجربات اور محسوسات کی حامل شاعری کی اپیل زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ تنقید کسی نہ کسی نظام کے تحت انھیں دیکھے اور پرکھے گی۔ اس عمل میں تنقید کا علمی اور اختصاصی بن جانا بھی فطری ہے۔ شمیم حنفی کی نگاہ میں ایسی تنقید ہے جس نے خود کو محض ایک علمی اور اختصاصی مشغلے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر ایسی تنقید کی کچھ مثالیں سامنے آجاتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ تنقید کس طرح اجتماعی تہذیب کی عام سرگرمی کا حصہ بنے گی۔ اجتماعی تہذیب سے کسے انکار ہوسکتا ہے اور اس تعلق سے نئی تنقید کے کچھ نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں اجتماعی تہذیب سے رشتہ موجود ہے۔ اصل میں سارا مسئلہ تنقید کی علمی زبان کا ہے جو پہلی نظر میں عام انسانی تجربوں سے دور معلوم ہوتی ہے۔ شمیم حنفی کے مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں ادب کا ایک طالب علم یہ سوال کرسکتا ہے کہ تنقید چاہے جتنی بھی علمی اور بین العلومی ہوجائے اسے اول وآخر ادب کا حصہ بننا ہے اور ادب کی تعبیر وتفہیم کا کوئی بھی عمل انسانی تجربوں سے کلی طور پر الگ نہیں ہوسکتا۔ شمیم حنفی تنقید کے اختصاصی رویے کو سماجی اور سائنسی علوم کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ادب کے لیے نہیں۔

کسی ادبی متن کی قرأت کے کئی زاویے ہوسکتے ہیں۔ ان زاویوں کو الگ الگ اور ایک ساتھ بھی متن پر آزمایا جاسکتا ہے۔ اختصاص کا پہلو کسی ایک زاویے سے بھی پیدا ہوسکتا ہے لیکن بعض اوقات ایک زاویہ میں کئی زاویے دبے پاؤں داخل ہوجاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ذوق اور زاویہ میں فرق کیا ہے کیا ذوق کو زاویہ کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ذوق کی بنیاد پر ادب سے ذاتی طور پر محظوظ تو ہوا جاسکتا ہے مگر اس کی روشنی میں تنقید کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ زاویہ ذات سے ہم آہنگ ہوجائے تو تنقید کی زبان قاری کو نہ تو پریشان کرتی ہے اور نہ وہ تخلیقی متن

سے فاصلہ قائم کرتی ہے۔ذوق تو بڑی دولت ہے اس کے نہ ہونے کی صورت میں ادب کا قاری ذہنی اور حسی طور پر بڑا ہی غریب واقع ہوتا ہے۔شمیم حنفی کی تنقیدی فکر ذوق کی اعلیٰ ترین منزل پر نہ صرف فائز نظر آتی ہے بلکہ وہ معاصر تنقید کو بھی اس مقام پر فائز دیکھنا چاہتی ہے۔زاویہ ان کے یہاں ذوق کے ساتھ ابھرتا ضرور ہے مگر وہ ذوق پر غالب نہیں آتا۔ یہ زاویہ ترقی پسند ہوسکتا ہے جدیدیت کا حامل ہوسکتا ہے اور مابعد جدید بھی۔شمیم حنفی کے یہاں جب یہ زاویے ایک ہی مضمون میں یکجا ہوجاتے ہیں تو ادب کے اس قاری کی الجھن بڑھ جاتی ہے جو تنقید کو کسی ایک زاویے تک محدود دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتا ہے۔شمیم حنفی کے تنقیدی مطالعے میں ان تمام وسائل کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو تنقید کو ادبی مکالمہ یا بات چیت بنا دیتی ہے۔وزیرآغا نے نئی تنقید کے مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس میں ادب کے سنجیدہ قاری کی دلچسپی بھی رہی ہے۔ بلکہ مابعد جدیدیت کے کئی شیڈس ان کے یہاں زیادہ واضح اور روشن ہیں۔اس کی وجہ نظریات کو اچھی طرح سمجھنا اور جذب کرنا ہے۔شمیم حنفی کے مندرجہ بالا اقتباس کے سیاق میں وزیرآغا کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ساختیات اور مابعد ساختیات کے فکری نظاموں کے تحت تشریح Interpretation کے سلسلے میں جو مباحث ہوئے بے کار نہیں گئے۔ ان مباحث کو نظریہ سازی کہہ کر مسترد کرنے کا کوئی جواز نہیں۔اول اس لیے کہ یہ جملہ نظریات تھیوری کا حصہ ہیں اور تھیوری قدیم ہندوستان اور یونان کے زمانے سے لے کر آج تک کسی نہ کسی انداز میں زیر بحث ضرور رہی ہے۔ ہر زمانے میں دیگر علمی شعبوں مثلاً فلسفے سائنس یا مذہبی تصورات میں جو پیش رفت ہوئی اس سے متاثر ہوکر تھیوری نے بھی اپنے آفاق کو کشادہ کیا ہے۔تمام علمی شعبے اپنے اپنے مخصوص منطقوں میں فعال ہوکر دراصل کائنات کے تخلیقی عمل کو جاننے کے متمنی نظر آتے ہیں......''

سچ تو یہ ہے کہ شمیم حنفی تنقیدی اور تخلیقی سرگرمی میں اسی وسعت ذہنی اور کشادہ نظری پر زور دیتے رہے ہیں جس کی طرف وزیرآغا نے اشارہ کیا۔فرق یہ ہے کہ شمیم حنفی نے اس سلسلے میں نظریاتی نوعیت کے مضامین نہیں لکھے مگر متن یا مصنف کے تعلق سے انھوں نے ہمیشہ ایک سے زیادہ تنقیدی نقطۂ نظر سے استفادہ کیا ہے۔یوں تو وہ تنقیدی موقف سے استفادے کی بات کم ہی قبول کرتے ہیں مگر قرأت کے عمل میں انھیں انسانی تجربوں کو سمجھنے اور اس کی باریکیوں تک پہنچنے میں جو نظری راستہ دکھائی دیتا ہے۔اسے وہ اختیار کرتے ہیں۔انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک کوئی تخلیقی تجربہ ان کی ذات کو چھیڑتا یا متاثر نہیں کرتا وہ اس سے بامعنی رشتہ استوار نہیں کرتے۔اس صورت میں مطالعہ اور تنقید کا عمل انتخابی ضرور بنتا ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ متن اپنے تمام فکری اور لسانی ابعاد کے ساتھ روشن ہوجاتا ہے۔ایسے موقعوں پر اصطلاحوں کے بغیر وہ متن کو جس فکری اور حسی سطح پر دیکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔وہ ان کی تنقید کا ایک بڑا امتیاز ہے۔شمیم حنفی نے شعوری طور پر تنقید میں گفتگو کا انداز اختیار کیا ہے۔اس پر کبھی کبھی قصہ گوئی کا بھی گمان ہوتا ہے۔ یہ انداز گفتگو دراصل نظریاتی جبر سے خود کو نکالنے اور ایک عام سطح پر مکالمہ قائم کرنے کی کوشش ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شمیم حنفی نے اپنے مضمون 'نئی تنقید کا المیہ' میں وزیرآغا کے دو اقتباسات پیش کیے ہیں جن میں وزیرآغا نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ تمام ناقدین نے کسی ایک مسلک یا نظریہ کو کاروباری طور پر اختیار کیا ہے۔ وزیرآغا شمیم حنفی کی طرح اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تنقید کا کام فن پارے کی جمالیاتی چکاچوند کو سامنے لانا ہے۔شمیم حنفی کو وزیرآغا کی یہ باتیں متاثر کرتی ہیں لیکن وہ سوال کرتے ہیں کہ نئی تنقید کے نام پر کیا ہو رہا ہے۔انھوں نے وزیرآغا، کا جو اقتباس پیش کیا ہے۔اس کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''نقاد اپنے مطالعے میں اوّلین حیثیت فن پارے کو دے اور فن پارے کے اندر چھپے ہوئے امکانات کی روشنی میں اپنی تنقیدی حس کو بروئے کار لائے نہ یہ کہ اپنے نظریات یا تاثرات کا عکس فن پارے میں تلاش کرنے کی سعی کرے۔''

وزیرآغا کی کتاب 'معنی اور تناظر' کے بیشتر مضامین کا تعلق نظریاتی مباحث سے ہے۔وزیرآغا کا موقف یہ ہے کہ علم و ادب کی دنیا میں ساختیات اور مابعد ساختیات نے جو انقلاب پیدا کیا ہے اس سے اردو کے ادیب آنکھیں بند نہیں کرسکتے۔لہٰذا وزیرآغا ان مباحث کو اردو کے ادبی معاشرے کے لیے ضرر رساں تصور نہیں کرتے۔مندرجہ بالا اقتباس میں نقاد کو فن پارے کا پابند بتایا گیا ہے گویا تنقید تخلیق کی انگلی پکڑ کر چلے گی۔اس سلسلے میں ہمارے ناقدین تضاد اور تذبذب سے خود کو نکال نہیں سکے۔کبھی وہ متن کی روشنی میں کسی زاویے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی کسی زاویے کی روشنی میں متن کو دیکھنا چاہتے ہیں۔بعض لوگ ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید سے وابستہ اصطلاحوں کو سننا نہیں چاہتے۔یہ ایک طرح کی سہل پسندی ہے جو فکری مسائل کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔شمیم حنفی نے فکری مسائل کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔لیکن ان کے یہاں ساختیات اور مابعد ساختیات کے کئی حوالے اور سلسلے مل جاتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ نہ تو زندگی معین اصولوں اور اصطلاحوں کی قیدی ہوتی ہے نہ ہی کوئی ادب پارہ گنبد بے در کی مثال ہوتا ہے کہ ہر نقاد ہر منظر و مظہر سے منہ موڑ کر بس ایک چھوٹے سے دائرے میں اپنے احساس اور نظر کو سمیٹ لے۔ ہر ادب پارہ انسانی ہستی کے تماشوں کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہوتا ہے۔ان تماشوں میں محض کسی اسرار کو جاننے اور سمجھنے کا،ایک زاویہ ہوتا ہے دیکھے ہوئے کسی منظر کو پھر سے دیکھنے کا۔ ادب پارہ اپنے قاری کے لیے ایک دریافت، ایک انکشاف ایک تجربہ اسی سطح پر بنتا ہے اور اگر تنقید ادراک کے اس نقطہ تک رسائی میں رکاوٹیں ڈالتی ہے تو وہ ادبی تنقید نہیں کوئی اور شئے ہے۔''

ان کا یہ جملہ کس قدر معنی خیز ہے کوئی ادب پارہ گنبد بے در نہیں ہوتا۔فن پارے میں داخل ہونے کے لیے مختلف راستے ہیں اور یہ راستے زندگی اور کائنات کی رنگارنگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شمیم حنفی تھیوریز اور نظریات سے

بیزاری کا ظہار کرتے ہوئے فن پارے کو جس بڑے سیاق میں دیکھنے پر زور دیتے ہیں وہ ایک مابعد جدید نقطۂ نظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ زبان اور اسلوب سے زیادہ فکری اور حسی مسئلے سے سروکار رکھتے ہیں مگر انھیں یہ بتانے کی کون جرأت کرے گا کہ فکر و احساس پر گفتگو کرنے کا مطلب لسانی ساخت پر گفتگو کرنا بھی ہے، مجھے جب کچھ لوگ شمیم حنفی کو یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ دیکھیے زبان کا یہ تہذیبی سیاق ہے اسے بین المتونی مطالعہ کہتے ہیں اس کا نام نوتاریخیت ہے، اسے مابعد نوآبادیاتی نقطہ نظر کہتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ کیا کوئی روشن دماغ ادیب اور نقاد اتنی توجہ کے ساتھ یہ سب سن سکتا ہے اور مسکرا سکتا ہے۔ شمیم حنفی کو معلوم ہے کہ ان اصطلاحوں کو استعمال کرنے والے زیادہ تر لوگ ذہنی طور پر مفلس ہیں۔ شمیم حنفی کو ان اصطلاحوں کے ساتھ جن نقادوں نے متاثر کیا ان میں سرِ فہرست ضمیر علی بدایونی اور وزیر آغا کے نام ہیں۔ شمیم حنفی نے گذشتہ چند برسوں میں ہر طرح کے جبر کی مخالفت کی۔ انھیں علاقائیت اور مقامیت میں ایک جبر اور تشدد کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ کئی معنوں میں شمیم حنفی ایسی کشادہ ذہنی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں جس پر مابعد جدید تنقید زور دے رہی ہے۔ مابعد جدید نقادوں نے اپنی کشادہ ذہنی اور روشن خیالی کو غالب کے اس شعر سے بھی واضح کرنے کی کوشش کی:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
آنکھ کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

شمیم حنفی کا ایک مضمون 'تہذیب اور تنقید کا رشتہ' ہے۔ یہ مضمون 1991 میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا تھا۔ سامعین نے مضمون سننے کے بعد جو سوالات کیے مضمون کے آخیر میں ان کے جوابات بھی موجود ہیں۔ مجھے یہ بات بہت اچھی لگی کہ مضمون کے تعلق سے پیدا ہونے والے اہم سوالات کو اہمیت دی گئی اور اشاعت کے وقت انھیں مضمون کا حصہ بنایا گیا۔ مضمون کا عنوان یوں بھی توجہ طلب ہے اور خصوصاً آج کی تنقید کے سیاق میں اس کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے۔ لفظ 'تہذیب' کا استعمال ترقی پسندوں نے بھی کیا اور جدیدیوں نے بھی، اور اب مابعد جدید تنقید میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مجموعی طور پر اس لفظ سے تمام مکتب فکر کے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ شمیم حنفی اس مضمون میں تہذیب کو جس طرح دیکھتے ہیں وہ تہذیب کا ایک آفاقی تصور ہے جس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ مابعد جدیدیت نے تہذیب کو پرانی اصطلاحوں کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادب میں بار بار تہذیب کے لیے عوامی کلچر کا ٹکڑا استعمال کیا۔ تہذیب کو طرزِ زندگی، طرز احساس کا نام بھی دیا گیا۔ مابعد جدیدیت نے اپنی بات لفظ سے شروع کر کے لفظ پر ختم کردی۔ اس نے تہذیب کو بھی زبان کا پابند بتایا۔ ایک سامع نے شمیم حنفی سے یہ سوال بھی کیا ہے کہ تہذیب کے بارے میں جو نئی آگہی ہم تک پہنچی ہے کیا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ شمیم حنفی نے تہذیب کو عام انسانی زندگی کے سیاق میں دیکھا ہے اور ساتھ ہی انفرادی احساسات کو بھی تہذیبی اقدار کا حصہ بتایا ہے۔ اگر موضوع تخلیق اور تہذیب کا رشتہ ہوتا تو یقیناً مضمون کا مزاج مختلف ہوتا۔ تنقید تہذیبی اقدار سے کس طرح سروکار رکھے گی اور کتنا رکھے گی۔ تہذیبی اقدار کی شرکت تخلیق میں تو ہوتی ہی ہے اور لازماً تخلیق کو ان اقدار سے کاٹ کر دیکھنا زیادتی ہوگی۔ اسے ہمارے بعض نقادوں نے شعریات اور تصور کائنات کا نام دیا ہے۔ تصور کائنات میں انسانی معاشرے کا طرزِ احساس اور طرزِ زندگی وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے۔ تنقید تہذیب سے اسی وقت رشتہ قائم کرے گی جب اسے تخلیق کی تہذیبی اقدار کا ادراک ہو، اسے نئی تنقید کی زبان میں ہم سیاق اول بھی کہتے ہیں۔ شمیم حنفی نے نئی تنقید کے غیر تہذیبی سروکار کا ذکر کرتے ہوئے انیسویں صدی کے تہذیبی اور تنقیدی مسائل پر نگاہ ڈالی ہے اور حالی کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ اس مضمون میں ادب، تہذیب اور تنقید کے اتنے مسائل سمٹ آئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شمیم حنفی نئی تنقید کے المیے کو جتنے حوالوں سے سامنے لانا چاہتے تھے اس میں وہ کامیاب ہیں۔ فطری طور پر آفاقیت، مقامیت اجتماعیت، انفرادیت سب ایک دوسرے سے الگ ہوتے اور گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ ایسا تو لگتا ہے کہ ہر چیز اپنے سیاق میں ٹھیک ہے۔ شمیم حنفی اس مضمون میں کچھ انسانی تجربہ کا ذکر کرتے ہوئے ادب کو اس کا تابع بتاتے ہیں۔ شمیم حنفی ان مسائل پر غور کرتے ہوئے خالصتاً ادب کے ایک حساس قاری کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب اور مشرق کے مختلف متون سے ان کا ایک مکالمہ جاری ہے اور ہر متن انھیں اپنے طور پر متوجہ کرتا ہے۔ کہیں ان متون کی حدیں مل جاتی ہیں کہیں ملنے کا التباس ہوتا ہے تو کہیں یہ الگ ہوجاتے ہیں۔ ان کیفیات سے گزرنا اور انھیں زبان دینا نہایت دشوار ہے۔ ایسی صورت میں کسی ایک کیفیت، آہنگ یا رویے سے مکمل وفاداری قائم نہیں ہو پاتی۔ اگر قائم ہوتی بھی ہے تو دوسری کیفیت اپنی معنویت پر اصرار کرنے لگتی ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''لیکن ہر تہذیب کی طرح ہر ادبی روایت کی جڑیں بھی ایک الگ زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس زمین کا ذائقہ، جغرافیہ، موسم، ماحول، رسمیں اور روایتیں، مجبوریاں اور معذوریاں، دکھ سکھ اس کے اپنے ہیں۔

لیکن زبان اور ادب کی سطح پر متعصّبانہ علاحدگی پسندی اگر عیب ہے تو صرف اس خیال سے کہ تہذیب اور تنقید کے بارے میں ہمارا تناظر وسیع اور ہر طرح کی حد بندی سے عاری ہو۔

سب سے بڑا سوالیہ نشان جو اردو کی جدید تنقید پر لگتا ہے یہی ہے کہ وہ اپنی تہذیب سے مناسبت رکھنے والی فنی شرطوں سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔ مغرب کی تقلید میں نہ تو وہ مغربی بن سکی نہ ہی مشرقی طرز احساس کے فروغ اور تحفظ کا وسیلہ فراہم کر سکی۔ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ حالی، آزاد سے اختلاف کے باوجود ان کا تنقیدی محاورہ ان کے عہد کے لیے نا قابل فہم اور غیر دلچسپ نہیں تھا۔

ابتدائی دو اقتباسات میں وہی کشمکش کی صورت ہے جو کسی بھی حساس اور ذہین ادیب کا مقدر ہے۔ اسے کچھ لوگ تضاد کہتے ہیں۔ لیکن ذرا سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کیجیے کہ ایک نہایت باخبر اور حساس شخص کے یہاں یہ صورت کیوں کر

پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی تنقید جو بظاہر متضاد کیفیات کی حامل ہے اس سے ہمارے رشتے کی نوعیت کیا ہوگی۔ لیکن اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ قاری انتخابی ہونے کے باوجود مختلف اسالیب کو نہ صرف ایک نظر میں دیکھ سکتا ہے بلکہ وہ امتزاجی مزاج بھی پیدا کرسکتا ہے۔

تیسرا اقتباس بھی پہلے اور دوسرے اقتباس ہی کا فکری حصہ ہے لیکن اسے حالی اور ان کے رفقا کی مشرقیت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نئی تنقید پر ان کا یہ اعتراض نہیں بلکہ سوال ہے کہ اپنی تہذیب سے مناسبت رکھنے والی فنی شرطوں سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔ یہ جملہ کئی اعتبار سے بامعنی ہے۔ اسے کلاسیکی شعریات، تصور کائنات، مشرقی شعریات وغیرہ سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ شمیم حنفی نے ان اصطلاحوں کے لیے ایک نہایت جامع جملہ بنایا ہے: ''وہ اپنی تہذیب سے مناسبت رکھنے والی فنی شرطوں سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔'' سچ تو یہ ہے کہ اس جملے کی روشنی میں انیسویں صدی کی تنقید کا چہرہ بھی کم یا زیادہ شرمندہ ہوتا ہے۔ شمیم حنفی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ حالی اور آزاد کا تنقیدی محاورہ ان کے عہد کے لیے اجنبی اور غیر دلچسپ نہیں تھا۔ گویا نئی تنقید بڑی حد تک ناقابل فہم بھی ہے، اور غیر دلچسپ بھی۔

اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا نئی تنقید کو حالی اور آزاد کی تنقید کے ساتھ رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔ بے شک حالی کا مقدمہ ایک بڑا انقلابی اور تاریخی کارنامہ ہے۔ آزاد کا مضمون نظم کلامِ موزوں کے باب میں کو بھی تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ مجموعی طور پر حالی اور آزاد کا تنقیدی محاورہ اپنی تمام تر علمیت اور خلوص کے باوجود مغرب سے براہ راست استفادے کی مثال نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی مغربیت میں اگر مشرقیت در آتی ہے تو یہ ایک طرح سے ان کی مجبوری بھی تھی۔ بلاشبہ یہ مجبوری تہذیبی حساسیت کی بنا پر بھی ہے اور یہ بھی کہ وہ مغربی محاورہ کو اس کے تمام لوازمات اور سیاق کے ساتھ دیکھنے کے اہل نہیں تھے۔ تنقیدی محاورہ اگر کسی معاشرے کے لیے اجنبی اور غیر دلچسپ بن جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری معاشرے پر ہی عائد ہوتی ہے۔ نئی تنقید کے جن نقادوں نے مغربی نظریات سے مرعوب ہوئے بغیر کچھ استفادے کی کوشش کی ہے انھیں آج پڑھتے ہوئے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ شمیم حنفی کا ایک مضمون 'تخلیقی متن اور تنقید کی کشمکش' ہے۔ عنوان ہی بتاتا ہے کہ تخلیقی متن کے ساتھ تنقید کا رویہ کیا ہے۔ تنقید کی کشمکش تو پھر بھی ایک حوصلہ افزا بات ہے۔ ایک اچھے تخلیقی متن سے تنقید کا معاملہ اکثر اوقات کشمکش کا ہوتا ہے۔ منفی معنوں میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنقید تخلیق کو قابو میں کرنے کے لیے طرح طرح سے حملے کرتی ہے۔ یہ عمل تخلیق سے مکالمے کا نہیں بلکہ آمریت کا ہے۔ شمیم حنفی تنقید کی اس آمریت کے خلاف ہے۔ کشمکش کا مثبت پہلو یہ ہے کہ تنقید اپنی تمام تر توجہ کے باوجود تخلیق کے تعلق سے بے اطمینانی کا شکار رہتی ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کرپاتی کہ اسے اور کس طرح اپنا بنایا جائے۔ لیکن تنقید میں دکھائی دینے والی بے سمتی کا بھی ایک روشن پہلو ہے۔ یہ عمل 'تماشائی نیرنگ تمنا' کی طرح ہوتا ہے۔ شمیم حنفی جب نئی تنقید کو غیر دلچسپ، اجنبی اور نامانوس بتاتے ہیں تو ان کی نظر میں نئی تنقید کا محاورہ اور اس کی زبان ہے۔ لیکن تنقید تنقیدی اصطلاحوں کے استعمال کے باوجود دلچسپ ہوسکتی ہے۔ تھیوریز کو پیش کرتے ہوئے اسے انسانی تجربات، محسوسات کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ ہمارے عہد میں اس تعلق سے سب سے بڑا کام ضمیر علی بدایونی نے کیا۔ لیکن ان کا ذکر کم آتا یا نہیں آتا ہے۔ شمیم حنفی اول و آخر خود کو ایک ادب کے قاری کی طرح پیش کرتے ہیں اور انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ نئے پرانے تنقیدی نظریات اور اصطلاحات سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔

شمیم حنفی نے انیسویں صدی کے ادبی اور تہذیبی مسائل پر کئی مضامین قلم بند کیے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ محمد حسین آزاد پر انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو شائع نہیں ہوا۔ اشاعت میں تاخیر کا سبب ان کی یہ فکرمندی ہے کہ محمد حسین آزاد پر اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی دیکھا جائے تاکہ نئے مباحث سامنے آئیں۔ غالب، حالی، محمد حسین آزاد، شبلی پر اردو میں اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں انیسویں صدی کے اردو ادب کو نوآبادیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اس رجحان نے ادب کے بہت سے سنجیدہ قارئین کے لیے مشکلیں پیدا کی ہیں۔ ایک دو سنجیدہ حضرات کو اگر چھوڑ دیں تو زیادہ تر تحریروں میں افراتفری اور فیشن پرستی نظر آتی ہے۔ شمیم حنفی نے انیسویں صدی کے مختلف ادبی اور تہذیبی پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہوئے نوآبادیاتی ڈسکورس سے وابستہ اصطلاحوں کا استعمال شاید نہیں کیا، لیکن مشرق اور مغرب کی فکری و حسی کشمکش کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے یہاں نوآبادیاتی نقطۂ نظر فطری طور پر چلا آتا ہے یہ نقطۂ نظر چوں کہ ایک خاص تنقیدی اور تخلیقی ذہن کا زائیدہ ہے لہٰذا اس کا اسلوب بھی بدلا ہوا ہے۔ ان کی دو اہم کتابوں 'نئی شعری روایت' اور 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' میں بھی انیسویں صدی کے ادب اور تہذیبی مسائل زیر بحث آئے۔ مجھے عصر حاضر میں شمیم حنفی کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا نقاد نظر نہیں آتا جس نے اتنے بڑے سیاق میں انیسویں صدی کا مطالعہ کیا ہو۔ ان مطالعات میں بعض باتوں کے حوالے فطری طور پر زیادہ آئے ہیں۔ شمیم حنفی کی تنقید انیسویں صدی کے ادب کو جن چند روایوں کی روشنی میں دیکھتی ہے ان سے ہماری آشنائی ضرور ہے۔ لیکن نتائج اخذ کرنے کے معاملے میں ایک حساس قاری کا سراغ نہیں ملتا۔ شمیم حنفی نے عمومی مباحث کے ساتھ بعض شخصیات اور متون پر جیسی گفتگو کی ہے اس میں ایک خاص تخلیقی آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ نظریاتی بنیادوں کے ساتھ ایک حساس اور باذوق قاری کے طور پر خود کو فعال رکھنا ہے۔ اسی لیے نظریات ان کے یہاں اکثر پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔ شمیم حنفی کے دو مضامین 'مقدمہ شعر و شاعری پر چند باتیں' اور 'نظم کلام موزوں کے باب میں' کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان دو تحریروں کو پڑھنے اور ان پر لکھنے کا زاویہ شخصی بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں لفظ شخصی سے مغالطہ ہوسکتا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شمیم حنفی مشرق اور مغرب کی کشمکش اور کشاکش کو ایک علمی ڈسکورس کے طور پر نہیں دیکھتے۔ شخصیات کے باطن میں اتر کر علمی ڈسکورس کو جذبے اور احساس سے ہم آہنگ کرنا شمیم حنفی کی تنقید کا بڑا

امتیاز ہے۔اس لیے حالی،محمد حسین آزادوغیرہ، پران کی تنقید میں لَو دینے کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ شخصیات جس طرح شمیم حنفی کے لیے محترم بنتی ہیں ان کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شمیم حنفی نے اتنے زمانی فاصلے سے حقائق کو یک رخا انداز میں نہیں دیکھا۔وہ ان شخصیات سے اس زبان میں شکایت نہیں کرتے جیسے نوآبادیاتی ڈسکورس نے پیدا کیا ہے۔

انیسویں صدی پر شمیم حنفی کی بیشتر تحریروں میں تاریخ کا حوالہ آیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس صدی کے تمام مسائل کو تاریخ ہی نے گھیر رکھا ہے۔شمیم حنفی کا بنیادی سروکار تاریخ کے جبر سے دبی شخصیات کو سمجھنا ہے اس لیے وہ جب حالی اور محمد حسین آزادوغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان شخصیات کے متون بھی ہمیں شخصیات کا بدل معلوم ہوتے ہیں۔مقدمہ پر بات کرنا ان کے لیے حالی کی داخلی دنیا میں داخل ہونا ہے۔انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان تحریروں کو صرف بطور تنقید پڑھا نہیں جاسکتا۔اس کی تعبیر کا عمل اس کشاکش سے دور نہیں جانا چاہیے جو ان کے باطن کا حصہ تھی۔اسی لیے مجھے شمیم حنفی کے یہاں سادگی اصلیت اور جوش کے نظری مسائل کچھ مختلف نظر آتے ہیں اور لازماً ان کا تنقیدی اسلوب تخلیقی ہوگیا ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ مقدمہ کا مصنف اور مقدمہ کا متن شمیم حنفی کے لیے محض علمی مطالعہ کے لیے نہیں ہے۔ یہ مطالعہ شمیم حنفی کو اس لیے اداس کرتا ہے کہ وہ خود کو حالی کی داخلی الجھنوں سے الگ نہیں کر پاتے۔حالی کی کشمکش کا ذکر تو بیشتر نقادوں نے اپنے اپنے طور پر کیا ہے۔شمیم حنفی نے اس کشمکش کو جتنے حوالوں سے دیکھا ہے وہ حوالے بھی آپ کو ممکن ہے کہیں اور مل جائیں لیکن یہ اسلوب نہیں ملے گا۔ یہ اسلوب تہذیبی کشمکش کا بدل بھی ہے جس نے حالی کے اندرون میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔شمیم حنفی کی تنقیدی زبان دراصل تہذیبی زبان ہے جو ایک دوسری سطح پر حالی اور ان کے رفقا کو ادبی معاشرے میں رائج کرنا چاہتی ہے۔اس لحاظ سے شمیم حنفی کا تنقیدی عمل تہذیبی عمل بن جاتا ہے۔حالی کا سخت گیر نقاد بھی مقدمہ میں حالی کو مشرق سے پوری طرح بیزار نہیں ثابت کرسکتا۔شمیم حنفی حالی کے اجتماعی دکھ کو دیکھتے ضرور ہیں مگر ان کی نگاہ بار بار حالی کی داخل دنیا کی طرف جاتی ہے اور ہم خود کو حالی کے درمیان پاتے ہیں۔یہ کام وہ تنقید کر ہی نہیں سکتی جو حالی کو صرف نظری طور پر دیکھنا چاہتی ہے۔شمیم حنفی نے انیسویں صدی کی تہذیبی کشمکش کو حالی کی کشمکش ثابت کرنے کی غیر ضروری کوشش نہیں کی۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ حالی کو اجتماعی کشمکش سے الگ کر دیں مگر حالی کی کوئی شخصی دنیا بھی تو ہوگی۔ یہ شخصی دنیا شمیم حنفی کو مل گئی۔وہ لکھتے ہیں:

''چناں چہ حالی کے معاصر مولویوں سے ہمارے معاصر سلیم احمد تک حالی کے ذہنی سفر اور مفلر کا جی بھر تماشا بنایا گیا۔ان میں سے کسی کو اس تہذیبی ملال اور دردمندی کا دسواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا، جس سے حالی کی نرم آثار اور متین شخصیت شرابور دکھائی دیتی ہے۔ایک اجتماعی ذمہ داری کے احساس اور اپنی انفرادی بصیرتوں کو ایک معاشرتی مقصد کے لیے وقف کر دینے کی جیسی طلب ہمیں حالی کے یہاں نظر آتی ہے اس میں ذہنی مغالطے اور جذباتی ابال کا عنصر بھی اور اصل ایک نسبت اور تعمیری عجلت پسندی کا نتیجہ تھا۔حالی کی الجھن کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ حقیقت پسندی کا وہ تصور جو انھیں اپنے عہد کی عقلیت سے ملا تھا اور جسے اختیار کرنے پر وہ خود کو مجبور پاتے تھے حقیقت کے اس تصور سے بہت مختلف تھا جو ان کی وراثت تھی۔حقیقت کے تصور کی سطح پر یہ مغرب اور مشرق کے مابین ایک اور آویزش بھی تھی۔اس آویزش کے حوالے اجتماعی سہی مگر یہی شخصی رزمیے کی بنیاد بھی بنی۔چناں چہ مقدمہ میں حالی کے گرد وپیش کی دنیا کے ساتھ ساتھ ہم اپنے آپ کو ان کے باطن سے بھی ہم کلام پاتے ہیں۔''

محمد حسین آزاد کے لکچر نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات کو زمانی اعتبار سے 'مقدمۂ شعر وشاعری' پر فوقیت حاصل ہے۔شمیم حنفی نے اس لکچر کو بڑے کینوس میں دیکھا ہے۔اس لحاظ سے ایک مختصر مضمون ایک عہد کی فکری اور تہذیبی زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی سے بھی گہرے طور پر وابستہ ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ ان شخصیات کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار تاریخ، ماضی اور حال جیسے الفاظ در آتے ہیں۔شمیم حنفی نے اس لکچر کی بازدید سے قبل آزاد کے ذہنی ارتقا کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس جائزے میں ادب، تاریخ اور تہذیب کے کئی حوالے زیر بحث آئے ہیں۔محمد حسین آزاد کے اس لکچر کو مقدمہ شعر وشاعری کے ساتھ رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مقدمہ شعر وشاعری کا کینوس آزاد کے لکچر سے بڑا ہے۔البتہ ایک بنیادی فرق آزاد اور حالی کے اسلوب میں ہے، محمد حسین آزاد اپنے افادی نقطۂ نظر کی پاسداری کے باوجود تخلیقی نثر لکھتے ہیں اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو عقلیت اور افادیت کی پاسداری کے سبب نثر سے رخصت ہو رہی تھیں۔شمیم حنفی کو محمد حسین آزاد کے تنقیدی اور تہذیبی شعور پر گفتگو کرتے ہوئے آزاد کی تخلیقی شخصیت کا خیال رہتا ہے۔تخلیقی شخصیت تو حالی کی بھی تھی مگر نثر کی حد تک محمد حسین آزاد کا اسلوب کس قدر حالی سے مختلف ہے۔شمیم حنفی اس مضمون میں مغرب سے حالی کی مرعوبیت کی گرفت کرتے ہوئے ان کی شاعری کو بے کیف اور سپاٹ بتاتے ہیں البتہ محمد حسین آزاد کی مغرب سے مرعوبیت پر جب وہ لکھتے ہیں تو ان کا انداز مختلف ہو جاتا ہے۔یعنی عقلیت نے محمد حسین آزاد کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب انگریزوں کے علم وفضل کی تعریف کرتے ہیں تو اس میں ایک تخلیقی شان برقرار رہتی ہے۔شمیم حنفی محمد حسین آزاد کو اس لحاظ سے بھی بہت اہم قرار دیتے ہیں کہ انیسویں صدی میں ان سے زیادہ کوئی بھی اپنی روایت کے تعلق سے سنجیدہ نہیں تھا اور یہ کہ وہ روایت سے شکوہ سنج بھی ہوتے ہیں تو ان کا لہجہ نرم رہتا ہے۔حالی اس معاملے میں آزاد سے مختلف واقع ہوئے ہیں۔ان کی طبیعت کی متانت اپنی جگہ مگر انگریزوں کی لائی ہوئی روشنی میں حالی کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں:

''آزاد کے اس تاریخی لکچر کا یہ پہلو بہت اہم اور توجہ طلب ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی اصلاح کا جذبہ تو رکھتے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کے چلن زبان وادب سے قومی تعمیر کا کام لینا چاہتے ہیں۔لیکن زبان وادب کو آلۂ کار کے

طور پر استعمال کرنے کی حمایت کے بعد بھی وہ اپنی روایت کے تشخص کو گنوانا نہیں چاہتے۔اس لکچر کے ذریعے وہ اپنے ماضی کے گم شدہ حصوں کو پھر سے پانا چاہتے ہیں۔اسی لیے مشرقی روایت کی وحدت سے ان کی نظر کبھی نہیں ہٹتی۔''

اس اقتباس کا آخری جملہ بہت اہم ہے۔انیسویں صدی کے ادبی اور تہذیبی ماحول میں مشرقی روایت کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس میں محمد حسین آزاد کی مغرب سے مرعوبیت کا بھی اہم کردار ہے۔سرسید، حالی، حسین آزاد وغیرہ کی اجتماعی کوششوں سے نوآبادیاتی ذہن پیدا ہورہا تھا، شمیم حنفی محمد حسین آزاد کو دیگر لوگوں سے الگ کرتے ہیں۔بعض ناقدین نے ایسے حوالے یکجا کیے ہیں جن سے انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے تئیں محمد حسین آزاد کی مرعوبیت اور خودسپردگی کا سراغ ملتا ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر روایت اور جدیدیت کی کشمکش انیسویں صدی کے تمام اردو دانشوروں کا مقدر تھی تو محمد حسین آزاد کو نوآبادیاتی جبر سے آزاد کیوں بتایا جائے۔میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ شمیم حنفی نے آزاد کے تخلیقی آہنگ کو مشرقی روایت کا اہم ترین حوالہ سمجھا ہے اور اس صورت میں ان کی مغرب پرستانہ فکر ثانوی درجہ اختیار کرلیتی ہے۔اس لکچر میں دیسی زبانوں سے استفادہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔شمیم حنفی اسے بھی نوآبادیاتی جبر کو توڑنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں۔انھوں نے آزاد کے یہ جملے بھی درج کیے ہیں:

''تمھاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہورہی ہے اس کو آزاد کرنے کی کوشش کرو۔اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔''

اے انگریزی کے سرمایہ دارو (انگریزی داں ہندوستانیو) تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمھیں افسوس نہیں آتا۔تمھارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمھیں درد نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ آزاد کو کیوں کر یہ خیال آیا کہ ان کی شاعری چند زنجیروں میں مقید ہے جس طرح فارسی اور عربی سے اردو نے استفادہ کیا، وہ انگریزی سے بھی استفادہ کرے۔اگر استفادہ نہیں کرے گی تو بزرگوں کی یادگار مٹ جائے گی۔کیا اس صورت میں آزاد کو مشرقی روایت کا سب سے اہم اور بڑا رازداں خیال کیا جاسکتا ہے۔محمد حسین آزاد کو یہ کون بتاتا کہ وہ جسے زنجیروں میں جکڑا کہتے ہیں اس سے نکلنے کی کوشش ہی دراصل مشرقی روایت پر خط تنسیخ کھینچنا ہے۔فطری طور پر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔کسی عہد کا Paradigm ماضی کو اپنی شرطوں پر دیکھتا ہے۔محمد حسین آزاد کے اقتباس سے بہت واضح ہے کہ روایت میں انگریزی کا نیا خون دوڑائے بغیر اسے باقی نہیں رکھا جاسکتا۔شمیم حنفی محمد حسین آزاد کی اس فکرمندی کو مشرقی روایت کے خلاف تصور نہیں کرتے۔انھیں محسوس ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد اگر یہ سب کچھ نہ لکھتے تو ایک خاص صورت حال میں اس تاریخی لکچر کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

شمیم حنفی نے مسعود حسن رضوی ادیب کی 'ہماری شاعری' کے امتیازات کی نشان دہی میں مقدمہ شعر و شاعری کا حوالہ تو دیا ہے لیکن انھوں نے اسے مقدمہ کا ردعمل نہیں بتایا۔اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت جن دنوں اور جن حالات میں ہوئی انھیں مقدمہ کی روشنی میں دیکھنا غیر فطری نہیں، شمیم حنفی نے 'ہماری شاعری' کے متن کو سامنے رکھ کر جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ عموماً 'ہماری شاعری' کی تنقید میں نظر نہیں آتے۔اول تو شمیم حنفی نے 'ہماری شاعری' کے مصنف کو ان کی دیگر ادبی دلچسپیوں سے الگ کرکے نہیں دیکھا۔یعنی کوئی ایک شئے بہرحال ایسی ہے جو کسی مصنف کی متفرق ادبی کارگزاریوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے، یوں بھی شمیم حنفی کا تنقیدی اختصاص یہ ہے کہ وہ تخلیقی متون کے درمیان وحدت تلاش کرتے ہیں۔ادیب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''ان کی تحریر کو پڑھتے وقت سوچنے اور محسوس کرنے کا عمل بیک وقت جاری رہتا ہے۔شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ تحقیقی اور علمی مسئلوں کے علاوہ سے ادیب کو انسانی جذبوں اور احساسات سے خاص دلچسپی تھی۔اسٹیج اور ڈرامے پھر مراثی کی تحقیق و تنقید میں ان کے انہماک سے اسی رویے کا اظہار ہوتا ہے۔''

شمیم حنفی نے 'ہماری شاعری' کے سیاق میں مشرق اور مغرب کی ثقافت کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔آج کی تنقید مشرق اور مغرب کے حوالے سے اس بات پر زور دے رہی ہے کہ اب مشرق اور مغرب اپنے امتیازات کے باوجود ایک دوسرے سے منحرف نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک سنبھلا اور متوازن نقطۂ نظر دھیرے دھیرے اردو معاشرے کا حصہ بن رہا ہے۔شمیم حنفی نے ادیب کی 'ہماری شاعری' کو ثقافتی ڈسکورس کے طور پر دیکھا ہے۔شعر کی تعریف کیا ہے۔شعر کس طرح بنتا ہے۔لفظ و معنی کا تصور کیا ہے موزوں اور بااثر کلام کی خوبیاں کیا ہیں۔شمیم حنفی نے ہماری شاعری کے تعلق سے ان مسائل سے سروکار ضرور رکھا ہے مگر انسانی جذبات اور احساسات پر ان کی نگاہ مرکوز رہتی ہے۔انسانی جذبات مشرق اور مغرب کو ایک مرکز پر لے آتے ہیں۔شمیم حنفی کو ادیب کی 'ہماری شاعری' میں اس حقیقت کا سراغ بھی مل جاتا ہے کہ ہم صرف اپنی تہذیب پر نازاں نہیں ہوسکتے اور یہ کہ دوسری تہذیب کو کمتر ٹھہرانا ایک نفسیاتی بیماری ہے۔یہ وہ نقطۂ نظر ہے جسے مابعد جدید تنقید کا فیضان بھی کہا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ادیب کے یہاں یہ شعور بھی ملتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے ادبی معیار اور تنقیدی تصورات کا بہت سا حصہ نسل انسانی کے دماغ اور اس کے عمل سے تعلق رکھتا ہے۔چناں چہ اس پر غور و فکر بھی عام انسانی سطح پر کی جانی چاہیے اور ہر مسئلے کو مشرق و مغرب کی آویزش میں الجھانا درست نہ ہوگا۔''

شمیم حنفی کے ان خیالات کا تعلق کثرت نظارہ سے ہے، جس میں انسانی زندگی اور کائنات کے مختلف رنگ و روپ اختلاف کے باوجود وحدت کا تاثر پیش کرتے ہیں۔'ہماری شاعری' کا متن داخلی سطح پر جو کچھ کہتا ہے اسے دیکھنے اور سننے کی کوشش عموماً نہیں کی گئی ہے۔شمیم حنفی نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تنقیدی زبان یا تنقیدی متن ایک ثقافتی متن بھی ہے۔

''علمیت کی پیشانی''

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
(دہلی، بھارت)

مارچ کا مہینہ تھا۔ایم۔اے سیکنڈ سمسٹر کے امتحانات قریب تھے۔ اس سمسٹر میں ایک پرچہ قصیدے کا بھی تھا اور سودا اور ذوقؔ کے قصیدے کسی طرح حلق سے نہیں اتر رہے تھے۔لگتا تھا کہ اس پرچے کا تو اللہ ہی مالک ہے۔شاید اس کی وجہ سے پہلے سمسٹر میں بنا ہوا امپریشن خراب ہو کر ہی رہے گا۔یوں تو قصیدہ ہمیں ایک بہت ہی قابل استاد پڑھا رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں ان کی بے تحاشا قابلیت کے سامنے ہمارا ذہن بہت ہی چھوٹا پڑ جاتا تھا اور ان کا سمجھایا ہوا ہمارے ذہن میں بیٹھ ہی نہیں پاتا تھا۔سوائے ہمارے ایک کلاس فیلو مولانا کے (جو خود بھی پچھلے دس سال سے بہار کے ایک مدرسے میں عربی اور اردو پڑھا رہے تھے) پوری کلاش پریشان تھی۔قصائد کی تشریحات لائبریری میں تلاش کی جا رہی تھیں اور ابو محمد سحر کی ،قصائد کی شرح خریدی جا رہی تھی۔ایسے میں میری دوست صالحہ نے مشورہ دیا''سنو۔کیوں نہ ہم شمیم حنفی صاحب سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں ذوق کا قصیدہ پڑھا دیں۔''

شمیم صاحب شعبہ کے نوجوان اساتذہ میں سے تھے۔وہ ہم لوگوں کو تو نہیں پڑھاتے تھے لیکن ان کی قابلیت کی دھوم تھی۔وہ شاید شعبے کے اکیلے استاد تھے،جنہوں نے ڈی لٹ کی تھی۔شعبہ اردو کے کمروں کی دورویہ قطار میں وہ بائیں بازو کے آخری کمرے میں بیٹھا کرتے تھے اور ہمیشہ مطالعے میں غرق نظر آتے تھے۔کبھی خود تو بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر لوگوں سے بات کرتے ضرور سنا تھا۔نہایت ہی مہذب،شائستہ اور نرم لہجے میں بات کرتے۔علمیت ان کی پیشانی سے ٹپکتی تھی۔نرم خوئی اور نرم گوئی کے باوجود ان کا رعب اتنا تھا کہ کبھی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔صالحہ کو یہ فخر اور مراعت حاصل تھی کہ شہر یار صاحب کی بھانجی ہونے کے ناطے وہ ان سے اور ان کے خاندان (صبا بھابی اور بچیوں سے) ذاتی طور پر واقف تھی۔شمیم صاحب سے درخواست کرنے کا ذمہ اس ہی نے لیا۔

چنانچہ ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں محوِ مطالعہ تھے تو ہم دونوں دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔کچھ ہی لمحے بعد شمیم صاحب نے نظر اٹھائی۔

''جی فرمایئے''

صالحہ نے ہمت کر کے بات شروع کی اور شہر یار صاحب کے حوالے سے اپنا تعارف کروایا۔انہیں فوراً ہی یاد آ گیا۔اخلاق سے بٹھایا،خیریت پوچھی، پڑھائی کے بارے میں استفسار کیا۔صالحہ نے حرفِ مطلب بیان کیا۔کہنے لگے۔

''ہاں،مگر قصیدہ بہ تو آپ کو فلاں صاحب پڑھا رہے ہیں۔وہ تو بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔آپ کو کیا پریشانی ہے؟''

میں نے کہا''جی سر۔لیکن اکثر ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔''

ایسا لگا کہ ہامرے جواب سے محظوظ ہوئے ہوں۔دھیرے سے مسکرائے ،پھر بولے''گیارہ بجے ہماری کلاس ہے۔آدھا گھنٹہ ہے۔اگر کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ لیں''

پوچھنا کیا۔ہمیں تو پورا قصیدہ ہی سمجھنا تھا۔ہم نے جھٹ سے کتاب کھول کر سامنے رکھ دی۔

پوچھا''کونسا شعر؟''

شمیم صاحب نے کچھ دیر تک اشعار پر نظر ڈالی اور پھر پہلے شعر سے سمجھانا شروع کر دیا۔ایک ایک شعر کو اتنی وضاحت کے ساتھ اس کی فنی،لغوی اور عروضی خوبیوں کے ساتھ سمجھاتے رہے اور ہم مسحور کو ہر سنتے رہے۔یقین کیجیے قصیدہ کبھی اتنا دلچسپ نہیں لگا تھا۔شاید چھ یا سات اشعار پڑھائے ہوں گے کہ گیارہ بج گئے۔فوراً کھڑے ہو گئے اور معذرت کرتے ہوئے بولے''ہماری کلاس ہے۔آپ لوگ کل ول جب ہمیں فرصت ہو آ جائیں۔''

ایک اچھے استاد کی خوبی یہ ہے کہ وہ پڑھاتے وقت مضمون میں اس قدر جذب ہو جائے کہ طلباء کا انہاک کہیں ٹوٹنے نہ پائے اور دوسرے وہ اپنی علمیت کی بلندی سے اپنے طلباء کی ذہنی سطح تک اتر کر پڑھائے۔شمیم صاحب میں یہ دونوں خوبیاں ہیں۔ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد نہ ان کی روانی رکی اور نہ ہماری توجہ بھٹکی۔

پھر کئی دن گزر گئے۔امتحان قریب تر تھے۔ایک دن پھر شمیم صاحب کو تنہا پا کر ہم نے ہمت باندھی۔صالحہ نے کہا''اب کے آپ کہیے۔اچھے خالو (شہر یار صاحب) کے حوالے سے بار بار دھونس دینا اچھا نہیں لگتا۔''

چنانچہ میں نے ہمت کر کے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔شمیم صاحب نے اپنی مصروفیات سے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا''سر وہ آپ نے فرمایا تھا کہ ذوقؔ کا قصیدہ پھر کسی دن سمجھا دیں گے۔۔۔وہ دراصل امتحان میں پندرہ دن ہیں اور پہلا پرچہ قصیدے کا ہی ہے۔''

شمیم صاحب نے کہا''ہاں بھئی ہمیں یاد ہے لیکن آج تو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔(شمیم صاحب اپنے آپ کو''ہم'' بولتے ہیں) کلاس بھی ہے اور اس کے بعد کچھ ضروری کام سے جانا ہے۔آپ ایسا کریں کہ کل گیارہ بجے آ جائیں۔کل ہماری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔''

پھر صالحہ سے شہر یار کی خیریت پوچھی، جو دو ایک دن سے چھٹی پر تھے۔میرے بارے پوچھا، میں نے اپنے والد صاحب کا نام لیا، جو اس وقت

جامعہ اردو کے رجسٹرار تھے۔شمیم صاحب نے واقفیت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا ''جعفری صاحب تو غالباً میکش صاحبؒ کے بھائی ہیں'' میرے اثبات پر انہوں نے کہا ''جعفری صاحب سے ہمارا سلام کہیے گا۔'' اور ہم چلے آئے۔اگلے دن گیارہ بجنے سے پہلے ہی ان کے کمرے کے آس پاس ٹہلنا شروع کر دیا۔ہمیں گردش میں دیکھ کرانہوں نے خود ہی بلالیا اوربغیر زیادہ تمہید کے پڑھانا شروع کر دیا۔ایسا لگتا تھا کہ علم کا دریا بہہ رہا ہے۔آج ہم پوری تیاری سے آئے تھے۔میں ذرا تیز لکھتی تھی اس لیے کوشش کر کے ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو لکھتی رہی۔دو گھنٹے گزر گئے۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ ہماری دو کلاسیں نکل گئیں لیکن اُس وقت اس قصیدے سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں تھا۔ درمیان میں شعبے کے چپراسی میاں خان چائے لے کر آئے۔سر نے ہم دونوں کے لیے بھی چائے منگوائی۔ہم اس قدر محو ومبہوت تھے کہ تکلف بھی نہ کر سکے۔وہ قصیدہ اس طرح ذہن نشین ہوا تھا کہ برسوں نہیں بھولا۔اس کے بعد بھی ہم لوگ دوسرے قصائد کے چیدہ چیدہ اشعار اُن سے سمجھنے اوراُن کی قابلیت کا سکّہ ہمارے دل ودماغ پر بیٹھ گیا۔نجم،منطق، ریاضی، کیمیا، سیمیا کی اصطلاحات کے بارے میں ان کا علم بے حدوحساب تھا۔

امتحان کے دن جہاں ساری کلاس پریشان تھی وہاں ہم دونوں بے حد مطمئن تھے۔اس پرچے میں اتنے نمبر آئے کہ مجھے خود بھی حیرت اور کچھ ایک کو شک ہوا۔

اگلے سمسٹر میں شمیم صاحب شعبہ میں نظر نہیں آئے۔سنا کہ وہ دہلی چلے گئے ہیں لیکن شمیم صاحب کے شاگرد ہونے کا فخر ہم برسوں محسوس کرتے رہے۔

برسوں بعد جب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میں نے اپنی پی ایچ ڈی کو Revive کرنے کا ارادہ کیا تو مشورے کے لیے شمیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آیا۔اس وقت وہ شعبہ اردو کے صدر تھے۔اپنے شوہر پاشا صاحب کے ساتھ، ذاکر باغ میں واقع ان کے دولت کدے پر حاضری دی۔وہی تہذیب، وہی اخلاق، شخصیت کا وہی دھیما، لیکن رچا ہوا انداز، کئی لوگ بیٹھے تھے، لیکن ازراہِ نوازش اوروں سے معذرت کر کے میری سِنو پسس (Synopsis) پر نظر ڈالی، کچھ مفید مشوروں سے نوازا اور ہمت افزائی کی۔میری خواہش تھی کہ میں اپنی ریسرچ شمیم صاحب کے زیرِ نگرانی مکمل کروں، لیکن یہ ممکن نہیں ہوا۔ایک اور بات جو شمیم صاحب کی شخصیت کا حصہ ہے وہ یہ کہ باوجود تمام تر لکھنوی اخلاق، تہذیب، وضع داری اور مروت کے وہ خلافِ قاعدہ یا قاعدے سے ہٹ کر کوئی Favour نہیں لیتے۔

شمیم صاحب دورِ جدید کے ایک بلند پایہ شاعر، نقاد اور مضمون نگار ہیں۔ادب کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے، جس کا اندازہ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے ان کے سیاسی نوعیت کے مضامین سے ہوتا ہے۔

شمیم صاحب کی شخصیت میں جو ناقدانہ توازن اور ٹھہراؤ ہے وہ ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ان کی کتاب ''ہم نفسوں کی انجمن'' میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جن شخصیات نے انہیں بہت زیادہ متاثر کیا ہے ان کے بارے میں کہیں مبالغے سے کام نہیں لیتے۔ایک نپا تلا انداز ہر جگہ قائم رہتا ہے اور پوری ایمان داری سے وہ شخصیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میری کتاب ''فرہنگ کلیاتِ نظیرا کبرآبادی مع تنقیدی مقدمہ'' پر انہوں نے مختصر لیکن پُر مغز پیش لفظ لکھا ہے۔

شمیم صاحب کا تعلق اتر پردیش کے ضلع سلطان پور سے ہے۔آپ کے اجداد لکھنؤ کے مضافات سے ترکِ وطن کر کے سلطان پور آئے تھے اور یہیں آباد ہو گئے۔یہیں شمیم صاحب کے والد کی پیدائش ہوئی، اس لیے شمیم صاحب کا وطن مالوف بھی سلطان پور ہی ٹھہرا۔شمیم صاحب کے والد سلطان پور میں وکالت کرتے تھے اور والدہ زیب النساء مشرقی تہذیب کی پروردہ پردہ دار خاتون تھیں۔ شمیم صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز سلطان پور سے ہی کیا۔یہاں سے اٹر کرنے کے بعد آپ الٰہ آباد آ گئے۔الٰہ آباد یونیورسٹی سے بالترتیب بی۔اے تاریخ اور اردو میں ایم۔اے اور ڈی فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ملازمت کی ابتدا اندور کے ایک ڈگری کالج سے ۱۹۶۵ء میں کی۔چار سال اندور میں درس و تدریس کے مقدس فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۶۹ء میں شمیم صاحب کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں عارضی لیکچرر کے طور پر ہوا۔اسی دوران آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۷۶ء میں شمیم صاحب جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو میں استاد کے طور پر آ گئے۔جامعہ میں آپ صدرِ شعبہ اردو، ڈین اور اردو correspondence course کے ڈائریکٹر رہے۔۲۰۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر تحقیق وتصنیف کے کام میں مصروف ہیں۔شمیم صاحب نے تقریباً ۴۰ کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں ہیں۔ آپ نے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر اُن گنت مقالے پیش کیے ہیں۔ ماریشس، جرمنی، عراق اور پاکستان میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں اپنے ملک کی قیادت کی ہے۔

یادِ ماضی

یادِ ماضی عذاب ہے کیونکر
اچھے دن بھی ہیں ماضی کا حصّہ
جو بُرے دن تھے اُن کو تم سمجھو
ہیں وہ بس ایک ماضی کا قصّہ

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

اردو تنقید کا آؤٹ سائیڈر

خالد جاوید
(دہلی، بھارت)

ادب انسانی تجربے کے مکمل علم وآگہی کا نام ہے۔نسلِ انسانی نے دُکھ، کرب اور مصائب کا جو طوفان جھیلا ہے، ادب اُسی کی ترجمانی کرتا ہے۔ادب کسی بھی حال میں اقدار سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ہر سچی ادبی تحریر ایک پُر اسرار رُوحانی تجربے کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ عکاسی اپنے وسیع تر مفہوم میں ہی ممکن ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس تجربے کی زیادہ سے زیادہ عکاسی کی بات کی جا رہی ہو، وہی تو دراصل سب سے زیادہ تاریک، دبیز اور پُر اسرار تھا۔ ایسی صورت میں ادب پارے کی تفہیم وتعبیر کا کام صرف چند نکات کی طرف نشان دہی کردینے سے ہی ممکن نہیں ہوجاتا۔ ادب میں ''تنقید'' کا مطلب یقیناً ادب کو جاننے اور سمجھنے کا ہوتا ہے مگر یہ جاننا مخصوص معروضی ہی نہیں، موضوعی بھی ہونا چاہیے۔ یہاں ''جان لینے'' کا مطلب ''ہو جانا'' ہے ۔ اس طرح یہ Being-Becoming کا سفر ہوتا ہے۔تب تخلیق وہ ہوجاتی ہے جو''ہم'' تھے اور ہم وہ جو کہ''تخلیق ہے۔

ہمارے زمانے میں جو تنقید کو ایک دوسرے درجے کی سرگرمی مان لیا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ چند مکتبی نظاروں کی عامیانہ آرا ہیں، ورنہ تنقید اور تخلیق کا رشتہ ایک ایسا فطری عمل ہے،جس کے بارے میں بہت سے بے تکے اور بے معنی سوالات تو قائم ہی نہیں کیے جاسکتے۔تخلیق ردِّعمل کے طور پر اپنی تنقید کو پیدا کرتی ہے۔تخلیق کی تعمیر ہی میں تنقید کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ بے خبر تخلیق کے بطن سے باخبر تنقید کا برآمد ہونا ایک قسم کی بامعنی اور اخلاقی ہلاکت خیزی ہے۔ یہ ایک دوسری تخلیق کا جنم لینا ہے، جس کے لیے گزشتہ تخلیق کے خلیوں کے ہلاکت خیزی کے باعث خون کے چھیتھڑوں کا بھکرنا لازمی ہے۔ ہر قسم کی عضویاتی اکائی کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔جس کے لیے اُسے شرمندہ ہونے کی نہیں بلکہ احساسِ فخر اور طمانیت کی دولت سے مالا مال ہونے کے احساس کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ تاریخ اور تہذیب کا عمل جاری وساری رہنے کی وجہ سے نسلِ انسانی نے بڑے مصائب بھی اُٹھائے ہیں اور بڑی سرشاریاں بھی حاصل کی ہیں۔ادب کی دنیا نے جذبات اور بصیرتوں کو اپنے گونا گوں تجربات کے ذریعے خود میں جذب کیا ہے۔ اس صورتِ حال میں کسی بھی قسم کی سہل پسندی بڑے بڑے مغالطوں کو وجود میں لاسکتی ہے۔ یہ مغالطے صرف مغالطے ہی نہیں رہتے، یہ معاشرے میں ایک بھیانک تخلیقی بانجھ پن بھی پیدا کرتے ہیں۔معاشرے میں یہ تخلیقی بانجھ پن پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہم کسی جامد اور اکہرے حصار میں قید ہوکر خود اپنی ہی نظریے کی فرسودگی عنوانات سے ہی اب جی گھبراتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ایک جامہ کھمبے کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔تنقید اور ادبی تخلیق دونوں کو مل کر ایک نئی اور وسیع تر دنیا کی تشکیل کرنا چاہیے۔

مگر کیا ہمارے یہاں ایسی تنقید کا ارتقا ہوسکا ہے؟ شمیم حنفی کی تنقید کے بارے میں کوئی بات کرنے کے لیے یہی ایک بنیادی سوال ہے جو میرے لیے اس تحریر کے لکھنے کا محرک بن جاتا ہے۔

دراصل وجودی طرزِ احساس اور فکر نے شمیم حنفی کی تنقید کو جس طرح متاثر کیا اُس کی دوسری مثال اُردو میں نہیں پائی جاتی۔ یہ تنقید بجائے خود ایک آوٹ سائیڈر کی تنقید ہے، آوٹ سائیڈر ہمیشہ ہی نابغۂ روزگار رہتا ہے۔وہ اپنے سے قبل چلی آرہی عمومی صورتِ حال کو درہم برہم کردیتا ہے۔ادب،فن،تنقید اور علم کے میدان میں آوٹ سائیڈر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جس صنف سے تعلق رکھتا ہے اس کے بعد اُس کے ارتقا کی راہیں ایک طرح سے روایتی خطوط پر آگے بڑھنے کے لیے مسدود ہوجاتی ہیں۔اُردو میں ادبی تنقید کو شمیم حنفی نے جس بلندی پر پہنچا دیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر اور اعلیٰ تنقیدی کارنامے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔دراصل یہ کارنامہ اس لیے وقوع پذیر ہوا کہ شمیم حنفی اُردو کے وہ واحد نقاد ہیں جو دراصل خود بھی وجودی طرزِ احساس کے مالک ہیں، اس لیے اُن کی تنقیدی نگارشات پر وجودی احساسات اور کیفیات کی جو چھوٹ پڑی ہے وہ اس صداقت پر مبنی ہے جس کا خمیر انسانی وجود ہے۔ادب پارے کی تفہیم وتشریح سائنسی انداز میں نہیں کی جاسکتی ۔ ہر بڑا ادب پارہ اپنے آپ میں ایک مابعد الطبعیات کو دریافت کرے۔

مگر مابعد الطبعیات کو دریافت کرنے کا عمل بجائے خود ایک گہرے وجودی احساس سے تعبیر ہے۔اسے دریافت کرنے کا مطلب اس احساس میں کھوجانا یا اس سے ہم آہنگ ہوجانا ہے جسے دریافت کیا گیا ہے۔دریافت کے معنی نقاد کے لیے نہ تو ٹوپی سے خرگوش نکالنا ہے اور نہ یہ اعلان کردینا کہ چاند پر پانی نہیں پایا جاتا۔

شمیم حنفی کی تنقید فن پارے کی مابعد الطبعیات کو دریافت کرتی ہے، پھر وہ سب کچھ جو دریافت ہوا ہے قاری کو نظر آنے لگتا ہے۔ وہ دکھائی دیتا ہے، ایک زندہ احساس کی طرح شمیم حنفی کی تنقید ایک معجزے سے کم نہیں، کیوں کہ یہ کچھ کہنے اور بتانے سے زیادہ دکھاتی ہے،یعنی Display کرتی ہے۔

یہاں یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ Display کرنے کا یہ عمل تنقید میں کس طرح رونما ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ کارنامہ شمیم حنفی کی زبان نے انجام دیا ہے۔اُن کی تنقید کی زبان مروّجہ تنقیدی اسالیب میں سے کسی بھی ایک سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، اس لیے اِسے آوٹ سائیڈر کہا گیا ہے۔ عسکری صاحب سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود اُن کی تنقید کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ وہ عسکری صاحب کے تنقیدی اسلوب کی بھی تقلید کررہے ہیں۔ دراصل عسکری صاحب کے مزاج میں جو عجلت پسندی تھی اور زیریں سطح پر

ادب کے تئیں جو غیر سنجیدگی تھی، شمیم حنفی کو اُس سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ عسکری صاحب باتوں باتوں میں بڑے بصیرت آموز نکات کا انکشاف کر دیا کرتے تھے مگر یہ بھی ہے کہ عسکری صاحب کی تحریروں کو ترقی پسند نقادوں کی سکہ بند تحریروں کے ردِّعمل کے طور پر ہی زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ شمیم حنفی، عسکری صاحب سے ہی نہیں بلکہ اردو کے تمام نقادوں سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔

دراصل تنقید کے تقریباً تمام اسالیب فن پارے کی جس قسم کی تشریح یا تفہیم کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں، اس کے لیے اُن کے پاس زبان کے سوا دوسرا کوئی آلہ نہیں ہوتا۔ وہ زبان کو ''جاننے'' کا ایک آلۂ کار سمجھتے ہوئے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کے یہاں ''موضوع'' اور ''معروض'' ہمیشہ ایک دوری پر اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ عام طور سے تنقید کا منصب یہی مانا بھی جاتا ہے اور اس قسم کی تنقید ہمیشہ صاف شفاف اور منظم ہوتی ہے مگر ایسی تنقید اپنے وسیع معنی میں صرف ایک آلۂ کار بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ تخلیق کے مقابلے میں ہمیشہ اس لیے دوسرے درجے کی شے ہوتی ہے، کیوں کہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے اُسے تخلیق کے معیار اور اُس کی اقدار کا تعین کرنا پڑتا ہے۔

مگر شمیم حنفی کی تنقید اس زمرے میں نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ ''تخلیق'' کے ساتھ شرکت کرتی ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ سفر پر چل کھڑی ہوتی ہے۔ ہر فن پارہ اپنے پیچھے خون کی کچھ بوندیں چھوڑ جاتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید خون کی ان بوندوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ تخلیقی تجربے کے ساتھ ساتھ سُر لگانے جیسا ہے۔ ایسی تنقید کبھی ''غیر تخلیق'' کے لیے وجود میں نہیں آ سکتی، وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی غیر تخلیقی تجربے کا نوٹس ہی نہیں لے سکتی۔ شمیم حنفی کی تنقید میں موضوع اور معروض میکانکی انداز میں بے جان پتلے بن کر کھڑے نہیں رہ جاتے، وہ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تلاش میں، کبھی ایک دوسرے کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کے مخالف بھی۔ ظاہر ہے کہ شمیم حنفی کی زبان نے ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ زبان کے ذریعے دکھاتے ہیں۔ زبان کو انہوں نے اپنے ''ہونے'' کی زبان بنایا ہے نہ کہ کچھ ''جان لینے'' یا ''بتانے'' کی زبان۔ یہ خالص وجودی طرزِ احساس ہے۔ تنقید میں معروضیت پر بہت زیادہ زور دیا جانا منطقی اعتبار سے غلط ہے۔ ادب میں معروضیت نہیں ہو سکتی۔ ادب کی معروضیت میں موضوعیت شامل ہوتی ہے۔ سماجی علوم میں بھی صرف نصف فیصد ہی معروضیت ہوتی ہے۔ ادب کی تنقید بہرحال ایک دانشورانہ سرگرمی ہے مگر یہ دانشورانہ سرگرمی اپنی عقل کو اس طرح بروئے کار نہیں لاتی جس طرح مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر، انجینئر یا ٹیکنیشین اپنی عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی خاص مقصد کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہ خاص مقصد عام طور پر دنیاوی اور افادی نوعیت کا ہوتا ہے مگر ایک دانشور کا مقصد اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہاں عقل و دانش کی مرکزی اہمیت ہوتے ہوئے بھی، اُس کا مقصد کوئی دنیاوی کارنامہ انجام دینا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں تو عقل یا دانش خود اپنی فطرت سے ہی ہم آہنگ رہتی ہے، یعنی خیال و فکر۔ کسی بھی موضوع پر سوچنے کے ساتھ ساتھ اُس کی حقیقت یا ''سچ'' کا ادراک حاصل کرنا۔ اس ''سچ'' کا ادراک حاصل کرنے کے لیے معروضیت کوئی اوّلین یا حتمی شرط نہیں ہے۔ جب ہم اقدار کی بات کرتے ہیں تو ایک اخلاقی جہت تو خود بخود ہماری دانشورانہ سرگرمی کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہے۔ یہ اخلاقی جہت ایک قسم کے تنقیدی احساس (Critical Consciousness) کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کیا ادبی تنقید اقدار اور اخلاق سے یکسر خالی ہو کر ''عقلِ محض'' کا پتلا بن کر خالص سائنس کی طرح فن پارے کو ٹھونک بجا کر دیکھتے رہنے کا نام ہو سکتی ہے؟ ادب کا کوئی بھی معروضی مطالعہ بغیر موضوعیت کو شامل کیے مکمل نہیں ہو سکتا۔

دوسرے نقادوں کی زبان اور شمیم حنفی کی زبان میں یہی فرق ہے کہ دوسرے نقاد دراصل سائنس داں کے منصب پر فائز ہیں۔ وہ فن پارے سے تقریباً لاتعلق ہو کر اُس کی سرجری کرتے ہیں۔ ایسے نقاد بعد میں اپنی کامیاب ''سرجری'' کے نشے میں ہی گم رہتے ہیں۔ زخمی کٹے پٹے فن پارے کو اُن سے الگ اور دور رہ کر بھی بہت دن جینا پڑتا ہے۔

مگر شمیم حنفی کا مطالعہ اُن کی روحانی واردات کا ہی دوسرا نام ہے۔ اُن کی زبان وجودی تجربے سے روشنی اخذ کرتی ہے۔ اس روشنی میں وہ سب کچھ Display ہو جاتا ہے جو کہا نہیں جا سکتا۔ یہ روشنی اُن کی تمام نگارشات کے ساتھ ساتھ رینگتی ہے، مگر یہ اتنی تیز نہیں کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔ کبھی کبھی تو یہ صرف ایک چمکیلے غبار یا دُھند کی شکل میں ہوتی ہے جس میں اشیاء اپنی تمام پوشیدہ جہات کو بھی پرچھائیوں کی شکل میں Display کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

اس لیے شمیم حنفی کے مطالعے کا مرکز بھی صرف وہ تخلیقات ہی ہوتی ہیں جن سے اُن کا کوئی ذہنی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس لیے فن پارے سے وہ تعلق رہ ہی نہیں سکتے۔ شمیم حنفی کی تنقید میں یہ کرشمہ اس طرح نمودار ہوا ہے کہ فن پارے کے متن میں پوشیدہ وجودی تجربے اور تنقید کی زبان کے درمیان ایک موجودی طرزِ احساس کی ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح فن پارہ اپنی خالی جگہوں کو بھرتا ہے۔ تخلیق ایسی تنقید کی محتاج ہوتی ہے جو اسے مکمل کر دے۔ شمیم حنفی کی تنقید ایسی ہے جو فن پارے کو مکمل کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اسے مکمل کرنے میں ہی تشریح و تفہیم کا وہ مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے جس کی تکمیل کے لیے تنقید وجود میں آتی ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شمیم حنفی کی تنقید تخلیق کے مقابلے میں دوئم درجے کی شے نہیں ہے۔ وہ اپنے وجود کے لیے اسی طور پر کسی ''تخلیق'' کی محتاج نہیں ہے۔ زمانی یا تاریخی اعتبار سے بھلے ہی وہ فن پارے کے وجود میں آنے کے بعد مکمل ہو گئی ہو مگر دراصل ایسی تنقید تخلیق کے تار و پود میں ہمیشہ شامل رہتی ہے، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ خود تخلیق کو بھی اپنی تکمیل کے لیے ایسی تنقید کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جدید تنقید کا ارتقا ایک قسم کے تہذیبی بحران کی

پیداوار ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد ایک ایسا سماج سامنے آیا ہے جسے ہم Mass Society کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ سماج ہے جو انسانوں نے اپنے باہمی رشتوں کے ذریعے تشکیل نہیں کیا ہے بلکہ یہ الگ الگ افراد کا ایک فرقہ ہے جسے حکومت کے اپنی ذاتی اغراض ومقاصد کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے، اس لیے آج لکھنے والا یقیناً اور بھی زیادہ اکیلا ہو گیا ہے۔ قدیم زمانے میں تنقید کا کوئی بہت خاص رول اس لیے نہیں تھا کہ ادیب اور سماج کے درمیان کوئی خلیج نہیں تھی۔ گزشتہ دو تین سو سالوں میں یہ صورت حال بدل گئی ہے، کیونکہ سماج میں فرد ابھر کر آ گیا ہے۔ آج جسے ہم ترسیل کا المیہ کہتے ہیں وہ ادیب اور قاری (سماج) کے درمیان کسی مکالمے کی غیر موجودگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ یوں دیکھا جائے تو یہ سماج کے بکھر جانے کا ہی نتیجہ ہے۔ جدید تنقید نہ صرف اس تہذیبی بحران کی پیداوار ہے بلکہ اس سے ابھر کر باہر آنے کی ایک بیباک اخلاقی کوشش بھی ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید صحیح معنی میں ''جدید تنقید'' کی یہ ذمے داری اپنے سر لینے کی کوشش کی ہے۔ روایتی اور رسمی قسم کی تنقید کے بس کا یہ روگ نہیں کہ وہ اس تہذیبی بحران سے باہر آنے کی اوّلین شرط بھی پوری کر سکے، یعنی وہ اس اخلاقیات کا بوجھ اپنے سر پر نہیں لے سکتی، کیونکہ اس نے معروضیت کو انتہا پسندی کی حد تک اپنا راہ نما بنا لیا ہے، اگر چہ یہاں بھی وہ غلط فہمی اور مغالطے کا ہی شکار ہے۔ صداقت اور معروضیت میں صرف سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے ہی کوئی رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے ورنہ ان میں کوئی منطقی ربط نہیں۔

شمیم حنفی کی تنقیدی زبان بے حد شائستہ اور پُر وقار ہے، مگر اس زبان کے انوکھے پن کا اسرار اس لہجے اور لَے میں پوشیدہ ہے جو بہت ملال انگیز ہے۔ ملال اور افسردگی کی یہ کیفیت آخر تنقید کی زبان میں کہاں سے چلی آتی ہے؟

(۱) ''تنقید نہ تو قانون سازی ہے نہ کسی سیدھی سادھی لسانی ترتیب کی مجرد ترتیب، تخلیقی لفظ کے واسطے ہم جتنا کچھ دیکھ پاتے ہیں اس سے بہت زیادہ ہماری نگاہ سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ تخلیقی لفظ کے مفہوم کی کائنات بے حساب ہوتی ہے اور لامحدود۔ اس سلسلے میں قطعیت کا رویہ اختیار کرنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ وہ علم جو مجرد اصولوں، خیالوں اور رشتوں کی آگہی فراہم کرتا ہے، بقول سارتر کھوکھلا علم ہے۔'' (قاری سے مکالمہ، شمیم حنفی)

(۲) ''ہر انسانی شعور اور آگہی اپنا بامعنی اظہار ایک وسیع اور پُرپیچ انسانی مظہر کے واسطے سے کرتی ہے۔ یہ مظہر تجربہ گاہوں کی چھوٹی سی دنیا کے دائرے میں نہیں سما سکتا۔ ہمارا عہد تخلیقی لفظ کے مفہوم، مطالعے اور تفہیم کے سابقہ تصورات سے انقلابی انحراف کا عہد ہے۔ نئی تنقید اس اعتراف کے بغیر اپنے قیام اور استحکام کی کوششوں میں ناکام رہے گی۔'' (قاری سے مکالمہ، شمیم حنفی)

(۳) ''انسان بجائے خود ایک بھید ہے، اس لیے شاعری بھی کبھی کبھی بھول بھلیاں بن جاتی ہے۔ تخلیقی عمل کے بھید کو پانے کے لیے قاری کو ذہنی، لسانی اور وجدانی سطح پر شعری اظہار اور اپنے مابین دوریوں کو مٹانا پڑے گا۔ بصورت دیگر زندگی کا ایک اصول بہت واضح اور ابہام سے خالی ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی۔'' (قاری سے مکالمہ، شمیم حنفی)

(۴) ''مارسل پراؤست نے جو ایک بات کہی تھی کہ کائنات ہر بڑے فنکار کے ساتھ ایک بار پھر سے بنتی ہے تو منٹو کی کہانی کے ساتھ اصل معاملہ یہی ہے۔ وہ کائنات کی ہر شے کو اور ہر شخص کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اپنی فنکارانہ ضرورت اور طلب کے مطابق اسے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ، اپنی کہانی سے خود کو غائب کر دینے کے بعد بھی وہ ہماری آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا۔ منٹو کے معاصرین میں اور اُس کے بعد بھی کسی دوسرے کہانی کار نے اپنی ہستی اور کہانی میں ایسا انوکھا تال میل پیدا نہیں کیا۔'' (منٹو۔ حقیقت سے افسانے تک، شمیم حنفی)

(۵) ''یہ سب کچھ ایک گہرے تخلیقی درد کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ بیدی کی سجاوٹ سے عاری زبان، زمین سے لگ کر چلتا ہوا اسلوب، ان ہونے واقعات اور ان جانی واردات سے خالی سیدھی سادھی کہانی، ان کہانیوں سے جھانکتی ہوئی زندگی کے مانوس رنگ اور منظر، دھیمے سُروں میں اس تخلیقی درد کا اظہار کرتے ہیں جس کی ڈور میں بصیرت اور ان کے کردار ایک ساتھ الجھے ہوئے ہیں۔ ایک پائے دار لیکن خاموش حزن بیدی کی کہانیوں اور کرداروں کی کھردری سطح کو بڑی ملائمت اور نرمی سے ہم کنار کرتا ہے۔ کہی اور اَن کہی دونوں ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ دوسرے کی سرگرمی میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ یہ کردار نہ تو Types ہوتے ہیں، نہ اپنے مسئلے کے حل کی خاطر کسی بیرونی سہارے کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی ساری کشمکش ان کی اپنی ہستی کے حوالے سے ابھرتی ہے۔'' (بیدی کے کردار، شمیم حنفی)

(۶) ''بنیادی شرط تجربے کی صداقت اور اُس کا ذاتی تاثر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تجربے کی صداقت اور ذاتی تاثر کے اظہار کی مثالیں متقدمین سے تا حال ہر اُس شاعر کے کلام میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جس نے صرف اوڑھی ہوئی زمینوں کو اپنی بصیرت کی جولان گاہ نہ بنایا ہو، چنانچہ کسی نہ کسی پر وجودی فکر کا عمل دخل میر وغالب کے یہاں بھی مل جائے گا۔ متقدمین سے قطع نظر، ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی ایک نوع کی وجودیت کا سراغ ملتا ہے، بلکہ ہربرٹ ریڈ کے خیال میں تو (پہلے میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) مارکس کے پیروؤں سے زیادہ وجودی کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' (نئی شعری روایت، شمیم حنفی)

مندرجہ بالا مثالیں بغیر کسی شعوری کاوش اور تلاش کے شمیم حنفی کے مضامین سے اخذ کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے بے شمار مضامین میں سے کہیں سے بھی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے وقت اُن کے بنیادی سروکار ''انسان'' سے ہی وابستہ ہیں۔ افسردگی اور ملال کی اس کیفیت کا ایک سبب تو یہ انسانی سروکار ہی ہو سکتے ہیں جس کی وجہ سے وجودی طرز احساس کی ایک بامعنی اُداس دھندلی سی روشنی اُن کی تمام نگارشات پر پھیلی رہتی ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید پر اگر کچھ لوگوں کو تخلیقی ادب کا شائبہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ اُن کی یہ افسردہ زبان ہی ہے۔ یہ زبان

دراصل ایک زندہ وجودی تجربے کی بامعنی اداسی ہے، اس لیے یہ تخلیقی افسردگی نہ صرف اپنے آپ میں معتبر ہے بلکہ یہ فن پارے کو بھی اس وجودی وحدت کی جہت عطا کر کے اس کی تشریح اور تفہیم کا وہ بھاری اور بظاہر ناممکن فریضہ بھی انجام دیتی ہے جو دوسری تنقیدی زبانوں یا تنقیدی اسالیب کے ذریعے انجام نہیں دیا جاسکتا۔

آصف فرخی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں شمیم حنفی نے کہا تھا:

''میں اس لمحے میں اپنے حشر سے بہت ڈرتا ہوں جب مجھے نقاد سمجھا جائے۔ مجھے اس بات سے بہت خوف آتا ہے کہ قیامت کے دن مجھے نقادوں میں اٹھایا جائے گا، کیونکہ میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو اس سے ایک تاثر میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کبھی وہ تاثر دھندلا ہوتا ہے، کبھی روشن، کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اسے قلم بند کردوں، کبھی جی چاہتا ہے کہ نہ کروں۔ جب قلم بند کرتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں کہ شاید کوئی دوسرا بھی اس تجربے میں شریک ہوسکے۔ اس لحاظ سے میں کبھی کبھی ایسی چیزیں لکھتا ہوں جنہیں مضامین کہا جاسکتا ہے۔''

شمیم حنفی کے اس بیان سے اگر اُن کی تنقید کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے تو دوسری طرف ہماری سہل پسندی ہمیں مغالطے میں بھی ڈال سکتی ہے۔ نہیں وہ اس طرح کی تاثراتی مکتبی تنقید نہیں ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ تنقید تو عسکری صاحب سے بھی اپنی سمت کی رہنمائی نہیں مانگتی۔ قائل تو شمیم حنفی، نہ صرف عسکری صاب بلکہ فراق صاحب کے بھی ہیں۔ سلیم احمد کے بھی وہ معترف ہیں، مظفر علی سیّد کے بھی قائل ہیں، مگر اُن کی تنقید ان سب سے قطعاً مختلف نوعیت کی ہے۔ وہ صرف ادب کی تشریح کا فریضہ ہی انجام نہیں دیتی وہ قاری کو بدل بھی دیتی ہے۔ جس طرح فن پارہ ہمیں تھوڑا تھوڑا بدل دیتا ہے۔ یہ تنقید ہمیں تاریکی میں چلنا سکھاتی ہے۔ تقریباً بیس سال پہلے میں نے ان کی صرف ایک کتاب ''کہانی کے پانچ رنگ'' پڑھی تھی اور عبداللہ حسین کی کہانیوں کے مجموعے پر اُن کا ایک چھوٹا سا فلیپ، اگر میں نے انہیں نہ پڑھا ہوتا تو آج میں کہیں اور ہوتا۔ ان دو تحریروں نے میری زندگی بدل کر رکھ دی، مگر وہ ایک الگ داستان ہے۔

ادب کا تجربہ دراصل وجودی تجربہ ہے۔ وجودی تجربہ ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک معتبر وجود کا ہونا بھی شرط ہے۔ معتبر وجود کی پہلی شرط بامعنی افسردگی اور بامعنی مایوسی بھی ہے۔ یہ قنوطیت نہیں ہے، یہ وسعت ہے۔ انسان اگر شئے نہیں تو پھر اُسے داس ہونا پڑے گا۔ ادیب کو سب سے زیادہ کیونکہ وجود کے کرب کو برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تو لکھنا بھی پڑتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقید اس لیے منفرد ہے کہ وہ بجائے خود ایک وجودی تجربہ ہے۔ مگر اس زبان کی افسردگی کا ایک سبب اور بھی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے ایک جگہ لکھا تھا:

''ہر ادبی چیز کو سیاسی رنگ مت دیجیے ورنہ آخر میں احتجاج کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ ادب کو سیاست کے اوپر دائر ایک مقدمے کی طرح لکھا جائے اور سمجھا جائے۔''

شمیم حنفی کی تنقید کے بیشتر حصے کو ہم سیاست کے اوپر چلائے جانے والے ایک مقدمے کے بطور بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' اور ''نئی شعری روایت'' میں تو اُن کی تنقید کا واضح رجحان ہی یہ ہے۔ اُن کی یہ اعلیٰ تصنیف اردو ادب کا ایک عہد ساز کارنامہ قرار دیے جانے کے قابل ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ محض فلسفے کے مجرد تصورات اور ادبی تھیوری سے ہی بحث نہیں کرتی بلکہ اس کی ایک مخصوص سیاسی جہت بھی ہے اور جس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ میرے خیال میں جدیدیت کا فلسفیانہ اساس کے سروکار اتنے مابعد الطبعیاتی یا خالص ادبی نوعیت کے نہیں ہیں جتنے کے سیاسی۔

(۱) ''نئی حسیت بنیادی طور پر حنفی معاشرے اور موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام کے خلاف احتجاج سے عبارت ہے۔ احتجاج، برہمی اور غم و غصے کا اظہار بھی نئی شاعری اور جدیدیت کے ایک عنصر کی ترجمانی کرتا ہے، لیکن اس اظہار کی نوعیت متعین نہیں ہے۔ اگر انفرادی آزادی کے تحفظ کو صرف سیاسی احتجاج کا تابع سمجھ لیا جائے تو مسئلہ الجھ جائے گا۔ ہر سیاسی احتجاج پایان کار ایک اجتماعی نتیجے اور نصب العین پر منتج ہوتا ہے، اس لیے ہر جدوجہد سیاسی ہونے کے ساتھ ہی اجتماعی جدوجہد بن جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جدیدیت ہر جبر کی طرح سیاست کے جبر کو بھی تسلیم نہیں کرتی۔ کبھی انیسویں صدی کے انحطاطی شعرا کی طرح جدیدیت سیاسی کے سوقیانہ پن سے بیزار ہو کر اسے یکسر نظر انداز کردیتی ہے۔ کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اس پر طنز اور برہمی کا اظہار بن جاتی ہے۔ کبھی معاصر نظام سے نا آسودگی، گہری اداسی اور بے زاری کے احساس کی شکل میں سیاسی اور اقتصادی حالات کے خلاف ایک بلاواسطہ اور خاموش احتجاج بن جاتی ہے۔ احتجاج کی سطحیں اور ہیئتیں اتنی مختلف النوع اور پیچیدہ ہیں کہ ان پر کوئی قطعی حکم لگانا مشکل ہے۔'' (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، شمیم حنفی)

(۲) ''روایت کی نفی کا مسئلہ نئی جمالیات کے باب میں اس وقت سامنے آتا ہے جہاں معاصر عہد کی یکسانیت، بے رنگی اور دہشت کی فضا اپنے انعکاس کے لیے اظہار کے ایسے سانچوں کی تلاش پر اُکساتی ہے جو اس ابتری اور بدنظمی یا اکتاہٹ کے احساس کو لسانی حرمتوں کی شکست کے ذریعے واضح کرسکیں۔ اس وقت سلیس اور رواں دواں، ترشی ہوئی اور سڈول زبان نیز آراستہ اور خوبصورت صیغۂ اظہار کی جگہ ایک ایسا کھردرا، غیر متوقع جارحانہ اور متشدد اسلوب جنم لیتا ہے جس کی صوتی اور لسانی ترکیب میں پرانے وقتوں کی آسودہ خاطری، غنائیت اور توازن و تناسب کے بجائے نئی تہذیب کے شور شرابے، خوف اور داخلی انتشار کی گونج شامل ہوتی ہے۔ یہ اسلوب نئے انسان کے ذوق جمال کے مسلسل انحطاط، اس کی پریشاں نظری اور فکری اعتبار سے اُس کی بے سروسامانی کی نشان دہی کرتا ہے۔'' (نئی شعری روایت، شمیم حنفی)

(۳) ''لکھنے والے کی شخصیت بڑی ہو یا چھوٹی، اس کے وجود کی سچائی نہیں ہوتی۔ جس وقت ہم زندگی کے کسی مظہر کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ مظہر بھی

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

''تخلیقی شعور کا جمال''

فاروق ارگلی

(دہلی، بھارت)

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ملک کی مقدس و محترم دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے زمانۂ قیام سے ہی اردو زبان، ادب، ثقافت اور تہذیب کے پاسداروں کا معدن و مسکن رہی ہے۔ ملک کے سیاسی و تمدنی مدوجزر اور اردو زبان و تہذیب کی زوال آرائیوں کے باوجود جامعہ کا اپنا علمی و تمدنی تشخص ہر دور میں برقرار رہا۔ موسم کیسے بھی ہوں یہاں کی فضائیں علم و ادب کے گلہائے رنگارنگ سے مہکتی رہتی ہیں۔ یہاں کے در و بام شعور و آگہی کے نور سے جگمگاتے رہے ہیں۔ بہ لحاظ عمر راقم الحروف کے ہم عصروں میں جامعہ ملیہ کے حوالے سے پوری اردو دنیا میں پہچانی جانے والی متعدد محترم شخصیتوں میں پروفیسر شمیم حنفی کا نام نامی بھی اگلی صف کے ان اساتذہ میں شامل ہے جنہوں نے اپنی طویل مدتِ کار میں نہ صرف صدہا اردو طلبہ کو زیور علم و ادب سے آراستہ کیا بلکہ اپنی علمی، تحقیقی، فنی اور فکری ریاضتوں سے شہرت اور قبولیت کی بلندیوں کو تسخیر کیا اور اپنے نام و کام کے دائمی نقوش لوحِ تاریخ پر ثبت کیے اور آج اردو زبان و ادب کا مجھ جیسا ادنیٰ طالب علم بھی یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اردو تنقید کا جلال اور تخلیقی شعور کا جمال اگر یکجا ہو کر کسی ایک پیکر میں ڈھل گئے ہیں تو بلاشبہ وہ پروفیسر شمیم حنفی کی ذاتِ گرامی ہے۔

اردو زبان کے نامور استاد، ادیب، ناقد، ادبی صحافی، ناول نگار، ڈرامہ نویس، مترجم اور مبصر پروفیسر شمیم حنفی کی اب تک کی پوری زندگی بے پناہ ریاضتوں اور جانکاہ محنتوں سے عبارت ہے۔ درس و تدریس کی مصروفیات، خانگی ذمہ داریوں اور علمی و معاشرتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کا قلم ہر آن رواں دواں رہا ہے۔ فکر و شعور کی بالیدگی انہیں نئے نئے راستے دکھا کر آگے اور آگے بڑھتے رہنے پر اکساتی رہی ہے جس کا نتیجہ ہیں ان کی متعدد کتابیں، جن کی اہمیت، معنویت اور متنوع خصوصیات کی بدولت ان کی شخصیت ہمہ صفات اور ہزار پہلو بن چکی ہے اور ہر پہلو اتنا وسیع اور افقی ہے کہ سب کا احاطہ یہاں ممکن نہیں اور نہ ہی ان کی شاندار تدریسی، ادبی اور تہذیبی خدمات کی تفصیل بیان کی جا سکتی ہے لیکن ان کا تعارف اگر ایک فقرے میں کرایا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ پروفیسر شمیم حنفی ہمارے عہد کی علمی و تہذیبی تاریخ کا ایک روشن حوالہ ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی (محمد شمیم) کا وطنی تعلق یو پی کے مردم خیز ضلع سلطان پور سے ہے۔ ان کی پیدائش ۱۷ مئی ۱۹۳۸ء کو سلطان پور کے ایک معزز علمی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد جناب محمد یٰسین لاء گریجویٹ تھے اور علم و ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور، خواجہ احمد عباس اور کانگریسی رہنما صادق علی جیسی ہستیاں ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھیں۔ شمیم صاحب نے علمی و ادبی ماحول میں ہوش سنبھالا۔ انہیں سب سے پہلے جو بزرگ اتالیق ملے وہ ان کے والد کے دوست الہ آباد کے سید معین الدین احمد قادری تھے جو اپنے زمانے کے نامور اہل قلم اور اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کے عالم تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر ''ہادیٔ اعظم'' کے نام سے مشہور کتاب تالیف کی تھی۔ مارٹن لنگس کی کتاب ''محمدؐ'' کا ترجمہ کرنے کے علاوہ مورخ یدوناتھ سرکار کی کتاب شیواجی کو بھی اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ شمیم صاحب کی والدہ محترمہ زیب النساء بیگم کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں پلنے والے بچے پر علم و ادب کے اثرات مرتب ہونے ہی تھے۔ شمیم صاحب کو بچپن ہی سے شعر و ادب کا شوق ہو گیا تھا۔ اسکول کی تعلیم سلطان پور میں ہوئی۔ شہر کے مدھوسودن ودیالیہ سے انٹر کیا اور مزید تعلیم کے لیے الہ آباد بھیجے گئے۔ جہاں انہوں نے بی اے اور ایم اے اردو ادبیات اور ایم اے تاریخ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی فل کیا جو پی ایچ ڈی کا دوسرا نام ہے۔ ڈی فل میں ان کے نگران عظیم نقاد پروفیسر احتشام حسین تھے، جن کی رہنمائی میں ان کا تنقیدی شعور پروان چڑھا۔ شمیم صاحب کو خوش قسمتی سے فراقؔ گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور انگریزی ادبیات کے معروف دانشور پروفیسر ایس سی دیو جیسے اساتذہ ملے جن سے ان کے ذہن کو نہ صرف علم و آگہی کی روشنی ملی بلکہ مستقبل کی راہ متعین کرنے کا حوصلہ بھی ملا۔ الہ آباد یونیورسٹی فی الواقعی اردو اور ہندی کا سنگم ہے۔ یہ شہر ہندی زبان و ادب کا بھی عظیم مرکز رہا ہے۔ شمیم صاحب کو ہندی ادیبوں اور شاعروں کی قربت حاصل ہوئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہندی زبان و ادب پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہوئی بلکہ اس لسانی اور تہذیبی ہم آہنگی نے ان کے ذہن کو کشادگی اور وسیع النظری بخشی۔ آج جب کہ شمیم صاحب اردو کے نامور ادیب اور نقاد ہیں، ان کے حلقۂ احباب میں علم و فن کے شعبوں سے وابستہ غیر مسلم اصحاب کی معتد بہ تعداد شامل ہے۔ وہ احترام کُل مذاہب اور سماجی رواداری کے زبردست حامی ہیں۔ ہندو مسلم، شیعہ سنی، وہابی بریلوی کی تفریق انہیں گوارہ نہیں۔ مثبت اقدارِ انسانی پر اعتماد ان کا مسلک ہے۔

الہ آباد سے ڈی فل کرنے کے بعد شمیم صاحب ۱۹۶۵ء میں اندور یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے اور جلد ہی اردو، فارسی اور عربی کے صدر شعبہ بنا دیے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ان کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ہو گیا۔ علی گڑھ کی علمی فضاؤں نے انہیں نئی قوتِ پرواز عطا کی، یہاں ۱۹۷۶ء میں انہوں نے پروفیسر آل احمد سرورؔ کی نگرانی میں دوہرے امتیازات کے ساتھ ڈی لٹ کی وقاری سند حاصل کی اور اسی سال جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ لیکن یہ ان کی غیر معمولی صلاحیت اور علمی بصیرت ہی تھی کہ

چند ماہ بعد ہی ریڈر کے منصب پر فائز ہوئے اور۱۹۸۴ء میں پروفیسر ہو گئے۔ آپ کئی بار شعبہ اُردو کے صدر رہنے کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز اور اردو کا ریسپانڈینس کورس کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ کچھ عرصے پہلے وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ ذکی صاحب کی عدم موجودگی میں انہوں نے قائم مقام وائس چانسلر کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ ۲۰۰۷ء میں آپ جامعہ کی تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے لیکن ان کی تاریخ ساز خدمات سے جامعہ کو محروم نہ ہونے دینے کی غرض سے انہیں پروفیسر ایمرٹس بنادیا گیا ہے۔ یہ تاحیات اعزازی منصب ہے جس کا مطلب ہے کہ جامعہ کو آخری سانس تک ان کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل رہے گی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تعلیمی وتدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردوادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کی کتابیں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، نئی شعری روایت، غزل کا نیا منظر نامہ، تاریخ تہذیب اور تخلیقی تجربہ، اقبال کا حرفِ تمنا، فراق دیارِ شب کا مسافر، غالب کی تخلیقی حسیّت، انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی اور قاری سے مکالمہ وغیرہ انہیں اپنے عہد کا معتبر ناقد اور مبصر قرار دیتی ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی تنقید اور تحقیق کے دائروں سے الگ ایک بالیدہ تخلیقی ذہن کے مالک بھی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے بہترین ڈراموں کا مجموعہ ''مٹی کا بلاوا'' مختلف یونیورسٹیوں کے ادبی نصاب میں شامل ہے۔ ان کی دوسری کئی کتابیں بھی اردو درسیات کا حصہ ہیں۔ ادبی صحافت کے میدان میں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے پوری اردو دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ان کی ادارت میں سالہا سال تک مسلسل شائع ہونے والے جامعہ ملیہ کے سہ ماہی جریدے ''جامعہ'' کے شمارے ان کی صحافتی لیاقت کا آئینہ ہیں۔ انہوں نے تہذیب، ثقافت، حالاتِ حاضرہ اور مختلف ادبی وسماجی موضوعات پر لاتعداد مضامین لکھے۔ غالب، نہرو، اندرا گاندھی جیسی شخصیتوں کے سوانح، بچوں کے لیے کہانیاں اور تربیتی کتابیں لکھیں۔ انگریزی، ہندی وبنگالی کی کئی اہم کتابوں کو اردو کا لباس پہنایا۔ شعراء کے تذکرے اور کلام کے انتخاب مرتب کیے۔ ہم عصر ادیبوں، شاعروں پر مضامین تحریر کیے۔ شعروسخن سے بھی لگاؤ ہے، بہت سی غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں لیکن مجموعہ نہیں چھپوانا چاہتے۔

عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر قوتِ عمل اور آگے بڑھنے کی رفتار کو مدھم کردیتی ہے۔ ساتویں دہائی پار کر رہے شمیم صاحب کی چستی، پھرتی اور تیزی نوجوانوں کو مات کرتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مصروفیات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ تحقیق، تنقید، سیمیناروں اور جرائد کے لیے مقالات و مضامین، مختلف شہروں میں خطاب وتقاریر کے لیے مسلسل اسفار کے ساتھ ساتھ حکومت ہند کے ادارہ این سی ای آر ٹی کی اردو درسی کتب کی تیاری اور درستگی کے کاموں میں مشاورت، بس کام، کام اور کام، ان کی زندگی کا مشغلہ بھی ہے اور نصب العین بھی۔ شمیم حنفی صاحب کی تازہ کتاب ''رات شہر اور زندگی'' میں ایران، پاکستان، ہندوستان، گجرات اور عراق کے خونچکاں حالات پر عالمی ادبیات کے تناظر میں اتنی مؤثر اور فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ کتاب موجودہ عہد کی سفاک حقیقتوں کی زبردست تنقیدی تاریخ بن گئی ہے۔ اس کتاب کے مشمولات اور بیانیہ صاحبِ کتاب کے عالمی ادب، عصری سیاست، تاریخ اور سماجیت کے گہرے ادراک اور غیر معمولی مشاہدے کے غماز ہیں۔ اردو تنقید کے مروجہ معیارات اور پیمانے غیر ملکی ادبیات اور رجحانات سے وابستہ ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی بھی ایک حد تک اسی پیرائے پر عامل ہیں۔ انگریزی، فارسی اور دوسری زبانوں کے ادب پر ان کی گہری نظر بھی ہے لیکن ان کا تنقیدی طریق کار کسی ازم یا نظریے کا قائل نہیں۔ وہ فن پارے اور فنکار کو ہندوستان کے تخلیقی، سماجی، تمدنی، نفسیاتی اور جمالیاتی پس منظر میں پرکھنے کو ہی تعمیری تنقید تصور کرتے ہیں۔ انہیں حسن عسکری کا تنقیدی انداز پسند ہے جو غیر ضروری مغربیت کے بجائے اپنی حسیات، اپنی جمالیات اور اپنے تخلیقی تناظر میں فن کی قدر وقیمت مقرر کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

ملک کی متعدد درسگاہوں، اکیڈمیوں کے علاوہ بیرونِ ملک بھی ان کے علمی وادبی مقالات وخطبات بے حد معروف ومقبول ہیں۔ ہائیڈل برگ جرمنی میں منعقد عالمی اقبال سیمینار میں آپ اقبالیات پر اپنا گراں قدر مقالہ پیش کر چکے ہیں۔ اس سے قبل علامہ اقبال کے گورنمنٹ کالج لاہور (اب پنجاب یونیورسٹی، پاکستان) میں مقالہ پڑھ چکے ہیں۔ جسے علامہ اقبال کی فکری جہات کی تفہیم میں ایک صحت مند اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ پاکستان کی سرگودھا یونیورسٹی میں جلال الدین رومی اور فیصل آباد یونیورسٹی میں غالب پر پُر مغز تحقیقی خطبات پیش کر چکے ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی شخصی طور پر انتہائی سنجیدہ محتاط اور رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنے والے انسان ہیں۔ استادانہ اور عالمانہ وقار بادی النظر میں انہیں سخت گیر اور ایک حد تک تنک مزاج ظاہر کرتا ہے لیکن یہاں ان کی شخصیت کا خارجی پہلو ہے۔ داخلی پہلو یہ ہے کہ وہ بے حد نرم، منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان کی شخصیت ہے، جو بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت اور دوستوں سے محبت سے محبت کا آبشار ہے۔ خاموش رہیں تو مہر بند شیشے کی طرح سرد اور سخت، کھل جائیں تو گفتگو کی خوشبو سے ساعتیں معطر ہو جائیں۔ گھریلو طور پر ایک عام دنیادار آدمی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی اہلیہ محترمہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جامعہ ملیہ میں ہی درس وتدریس سے وابستہ رہ کر سبکدوش ہوئی ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں جنہیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ ایک صاحبزادی جامعہ ملیہ میں انگریزی کی معلّمہ ہیں۔ ایک بیٹی کے شوہر انجینئر ہیں یہ بھی انگریزی کی ٹیچر ہیں۔ دوسری بیٹی کے شوہر میڈیکل ڈرگس کالج میں پڑھاتے ہیں۔ ان کے بھائی علیم حنفی برجر پینٹس میں سینئر ایگزیکٹو ہیں۔ ایک بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ تین بہنیں ہیں۔ ایک گوا یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں، ان کے شوہر آئی اے ایس افسر ہیں۔ دوسری بہن جوان سے چھوٹی ہیں درس و

تدریس کے شعبے سے ریٹائر ہو چکی ہیں۔ تیسری سب سے چھوٹی بہن بھی ٹیچر ہیں۔ ان کے خاندان کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است''

پروفیسر شمیم حنفی کو مصوری اور کلاسیکی موسیقی و لوک سنگیت سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کی بہت سے آرٹسٹوں اور گلوکاروں سے دوستی ہے۔ ادیبوں سے زیادہ ان کے تعلقات غیر ادیبوں سے ہیں جو اپنے اپنے شعبۂ حیات میں کامیاب لوگ ہیں۔ ادیبوں میں وہ قرۃ العین حیدر مرحومہ کے بہت قریب رہے۔ اسی طرح مرحوم عمیق حنفی سے ان کی گہری دوستی رہی ہے۔ عینی آپا اور عمیق صاحب کا ذکر وہ بڑی عقیدت سے کرتے ہیں، چونکہ ان کی ادبی زندگی کی شروعات ہندی زبان میں لکھنے سے ہوئی تھی اس لیے متعدد نامور ہندی ادیبوں سے ان کا دوستانہ برقرار ہے۔ آج بھی مشہور آرٹسٹ اے رام چندرن، پرم جیت سنگھ، ارپنا سنگھ، ویدنیر، نامور مصور خاتون گوگی سروج پال اور مشہور اداکارہ نندتا داس کے والد جتن داس ان کے قریبی دوستوں میں ہیں۔ اردو ادیبوں میں ان کی سب سے زیادہ قربت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم اور شہرۂ آفاق افسانہ نگار انتظار حسین اور بلراج مین را کے علاوہ انگریزی کے پروفیسر اور سابق صدر شعبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سید وقار الحسن سے ہے۔ ان کی گھریلو زندگی میں بناوٹ اور نام و نمود کی نمائش کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ سادگی اور خوش سلیقگی ان کے گھر کی زینت ہے۔ انہیں کھلے آسمان کے نیچے سونا اور پیدل چلنا بہت پسند ہے، لیکن سواری پر چلنا تو اس زمانے میں مجبوری بن گیا ہے۔

☆

- بقیہ -

اردو تنقید کا آؤٹ سائیڈر

ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے اور ہماری ہستی ایک ساتھ دیکھنے اور دیکھے جانے کے تجربے سے گزر رہی ہوتی ہے۔ بلاشبہ آج کی دنیا میں اپنے ملک، معاشرے، بستی خاندان میں رہتے ہوئے بطور فرد ہم اپنے ماحول کے درجہ حرارت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، مگر اس درجہ حرارت تک اپنے ماحول کو پہنچانے میں کوئی نہ کوئی حصہ ہمارا ابھی تو ہو سکتا ہے۔'' (ناول، تاریخ اور تخلیقی تجربہ، شمیم حنفی)

تو اس زبان کی افسردگی کا دوسرا سبب کیا ہے؟

دراصل یہ افسردگی وہ ایمانداری بھی ہے جس کے بغیر کوئی ادیب اپنے عہد کے مصائب کا چشم دید گواہ بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

یوں تو فی زمانہ مابعد جدیدیت کے تحت پوسٹ کلونیلزم، فیمینزم، نیٹو ادب صارفیت اور گلوبل ویلیج یا انفارمیشن ایکسپلوژن وغیرہ کا تنقید میں بہت چرچا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں لکھی جانے والی بیشتر ادبی تنقید بے حد تصنع آمیز اور آلودگی سے بھری ہوئی ہے۔ یہ تنقید سوائے تخلیقی تجربے کے اور ہر شے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس تنقید نے تخلیقی تجربے کو جلا وطن کر دیا ہے اس لیے یا تو یہ ایک نئے قسم کی مکتبی تنقید سے تعبیر کی جا سکتی ہے یا پھر سماجی علوم میں سے کسی قطعاً نئی شاخ سے، مگر ایسی شاخ جو نقلی ہے اور بے ایمانی اور عیش پرستی بلکہ لذت کوشی کا دوسرا نام ہے۔

اس لیے میرے خیال میں شمیم حنفی کی تنقید کا کوئی سانچہ اردو میں نہ تو پہلے تھا اور نہ ہی آج اس کا موازنہ اردو میں لکھی جا رہی دوسری تنقیدی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔

پولینڈ کے شاعر میووش نے کہا ہے کہ ''ممکن ہے کہ ادب یا شاعری ہمارے عہد میں ضمیر کی ایک آواز ہو، مگر پھر بھی اس پر ہمیشہ شک کیا جانا چاہیے اور اس کی عظمت کے قصیدے سے انکار۔''

شمیم حنفی کی کوئی بھی تحریر محض ادبی تنقید نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسے ہم اپنے اجتماعی ضمیر کی آواز پر کیے گئے شک اور اُس کی اخلاقی عظمت سے انکار کے ایک اعلان نامے کے بطور بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس تنقید کے بنیادی سروکار صرف انسانی ضمیر سے ہی وابستہ ہیں۔ اُن کی زبان میں افسردگی اور ملال کی جس لَے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ بڑی معتبر اور قابل احترام ہے۔ اس کا راز اس نکتے میں پوشیدہ ہے کہ وہ فن پارے کے باطن میں چھپے ہوئے لگاؤ اور درد کی تلاش میں سرجری کرنے کے لیے نہیں اُترے ہیں، اسی لیے اس تنقید کے ہاتھوں میں دستانے نہیں ہیں اور اسی لیے یہ ایک آؤٹ سائیڈر کی تنقید ہے۔

''ہر سمت اُجالا''

(انتخاب اختصار)

نندکشوروکرم (دہلی، بھارت)

پھر لوٹ کے اس بزم میں آنے کے نہیں ہیں
ہم لوگ کسی اور زمانے کے نہیں ہیں

اک دور کنارا ہے وہیں جا کے رکیں گے
جتنے بھی یہاں گھر ہیں ٹھکانے کے نہیں ہیں

یوں جاگتے رہنا ہے تو آنکھوں میں ہماری
جو خواب چھپے ہیں نظر آنے کے نہیں ہیں

دل ہے تو یہ دولت کبھی معدوم نہ ہوگی
یہ درد کسی اور خزانے کے نہیں ہیں

کل رات خموشی نے عجب رنگ دکھائے
یہ شعر اگر ہیں تو سنانے کے نہیں ہیں

ہر سمت اجالا بھی ہے سورج بھی ہے لیکن
ہم اپنے چراغوں کو بجھانے کے نہیں ہیں

دنیا نے بھی کچھ ہم کو بہت گھیر لیا ہے
کچھ ہم بھی اسے چھوڑ کے جانے کے نہیں ہیں

○

ہر نقش نو لوٹ کے جانے کے لیے تھا
جو بھول چکا ہوں وہ بھلانے کے لیے تھا

کچھ بھید زمانے کے بھی مجھ پر نہ کھلے تھے
کچھ میں بھی ریاکار زمانے کے لیے تھا

کچھ میں نے بھی بے وجہ ہنسی اس کی اڑائی
کچھ وہ بھی مری جان جلانے کے لیے تھا

کچھ لوگ جزیروں پہ کھڑے تھے سو کھڑے ہیں
سیلاب سفینوں کو بہانے کے لیے تھا

پیاسا جو نہ ہوتا تو سمندر سے نہ ملتا
دریا جو مری پیاس بجھانے کے لیے تھا

گرنی ہی تھی اک روز یہ دیوار بدن کی
یہ راہ کا پتھر بھی ہٹانے کے لیے تھا

سب میری اداسی میں تجھے ڈھونڈ رہے تھے
ہنسنا بھی مرا تجھ کو چھپانے کے لیے تھا

اک لہر کہ بس خاک اڑانے پہ بضد تھی
اک رنگ کہ پلکوں میں سجانے کے لیے تھا

اک لمحۂ خالی کی صدا سب نے سنی تھی
اک شور خموشی کو بڑھانے کے لیے تھا

خیرہ ہیں نگاہیں تو نہ کچھ دیکھ سکیں گی
منظر جو یہاں تھا نظر آنے کے لیے تھا

آپ اپنی جسارت سے تہہ آب ہوا ہے
وہ ڈوبنے والے کو بچانے کے لیے تھا

''چہار سُو''

☆

سمجھ سکے نہ جسے کوئی بھی سوال ایسا
بنا ہے سانس کے دھاگوں نے ایک جال ایسا
کبھی دماغ تھا مجھ کو بھی خود پرستی کا
پلٹ کے ذہن میں آیا نہ پھر خیال ایسا
میں آسماں تو نہ تھا جس میں چاند چھپ جاتے
ہوا نہ ہوگا کسی کا کبھی زوال ایسا
تمام عمر نئے لفظ کی تلاش رہی
کتاب درد کا مضموں تھا پائمال ایسا
کنار اب نہ پہنچے گی جان کی کشتی
بہت دنوں سے ہے پانی میں اشتعال ایسا

...... O ......

O

شام آئی صحن جاں میں خوف کا بستر لگا
مجھ کو اپنی روح کی ویرانیوں سے ڈر لگا
ایک لمحے کی شرارت تھی کہ ہر لحہ مجھے
آپ اپنی سمت سے آتا ہوا پتھر لگا
دھند سی پھیلی ہوئی تھی آسماں پر دور تک
موج ؟ ریگ رواں مجھ کو ترا پیکر لگا
خانۂ دل کو سجانا بھی ہے اک شوق فضول
کون جھانکے گا یہاں یہ آئینے باہر لگا
جاگنے والوں کی بستی سے گزر جاتے ہیں خواب
بھول تھی کس کی مگر الزام راتوں پر لگا
خامشی کی چار دیواری بھی شاید گر چکی
آج جانے کیا ہوا وہ شخص بھی بے گھر لگا

☆

O

شعلہ شعلہ تھی ہوا شیش؟ شب سے پوچھو
یا مرا حال مری تاب طلب سے پوچھو
جانے کس موڑ پہ ان آنکھوں نے موتی کھوئے
بستیاں دید کی ویران ہیں کب سے پوچھو
راستے لوگوں کو کس سمت لیے جاتے ہیں
کیا خبر کون بتا پائے گا سب سے پوچھو
دن نکلتے ہی ستاروں کے سفینے ڈوبے
دل کے بجھنے کا سبب موج طرب سے پوچھو
وہی دن رات وہی ایک سے لمحوں کا حساب
سخن آغاز کروں عمر کا جب سے پوچھو
خامشی بھی تو سناتی ہے فسانے اکثر
کس تماشے میں ہوں یہ بندش لب سے پوچھو

☆

عالیہ باجی

شمیم حنفی

عالیہ باجی بچپن ہی سے اس عجیب کامپلکس کا شکار تھیں۔اماں مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ جس دن انہوں نے دونوں پیروں پر کھڑے ہوکر ایک ذرا کھسکنا شروع کیا تھاایک دم سے عالیہ باجی بن بیٹھی تھیں۔مجھ سے عمر میں صرف ڈیڑھ سال بڑی تھیں لیکن میری صورت دیکھتے ہی ایسی بزرگی کے خول میں چھپ جاتیں کہ مجھے سچ مچ ان سے ڈرسامحسوس ہونے لگتااور میری ہمت نہ پڑتی کہ دوسرے بچوں کی طرح صرف چھیڑنے ہی کے لیے انہیں عالیہ باجی کے بجائےصرف عالیہ کہہ کر پکاروں۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی میرے دل میں عالیہ باجی کے لیےایک عجیب سی ہمدردی بلکہ ترس کا جذبہ ابھرنے لگا۔شاید یہی وجہ تھی کہ جس سال میں نے بی اے پاس کیا اور خالہ جان نے اماں مرحومہ سے میری شادی کی بات چھیڑتے ہوئے اچانک چپکے سے عالیہ باجی کا نام لے لیا تو مجھے ایسا لگا کہ انہوں نے میری سوچ کے صدیوں پرانے بُت کے ٹکڑے کرڈالے ہیں۔عالیہ باجی کے ساتھ شادی!یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔میں اپنی ہی نظروں میں گستاخ ہوگیا۔آخر کار میری ہٹ دھرمی کے آگے کسی کی ایک نہ چلی اور اماں مرحومہ عالیہ باجی کو اپنی بہو بنانے کی آرزو سینے سے لگائے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

اماں مرحومہ کی لاش پر آخری نظر ڈالتے ہوئے مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں نے ان کی اتنی سی بات پوری کردی ہوتی تو کون سی قیامت آجاتی۔لیکن چالیسویں کے بعد جب میں پھر شہر پہنچا تو کچھ ہی دنوں میں یہ سب کچھ بھول گیا۔ابا اپنے خطوں میں کبھی کبھی مجھے یہ بات یاددلا دیتے تھے اور ان کا خط دیکھتے ہی مجھے ایسا لگتا تھا کہ اماں مرحومہ کفن کی جالی سے آنکھیں لگائے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔لیکن وقت کا دھارا ابا کے خط کو جلد ہی تنکے کی طرح بہا لے جاتا اور میں سب کچھ بھول کر پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔ابا کو دیکھ کر ایک دھچکہ سا لگا۔اماں مرحومہ کی موت نے انہیں بالکل ویران کردیا تھا۔اجڑے اجڑے دکھائی دیتے تھےاور سارا گھر خالی خالی سا کچھ سویا سویا سا،کچھ ڈوبا ڈوبا سا نظر آتا تھا جیسے محرومیوں کی کمند نے اسے چاروں طرف سے اچھی طرح جکڑ لیا ہو۔اسی دوران میں میرا نتیجہ نکل آیا۔اس دن ابا نے پاس پڑوس کے سارے گھروں میں مٹھائی تقسیم کی لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑے شدید درد کا احساس ہوا کہ اس دن وہ کچھ اور بوڑھے ہوگئے تھے۔گھر کے کونوں کھدروں پر اس طرح نظریں ڈال رہے تھے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں۔

ایک بارگی مجھے اماں مرحومہ کی یاداس طرح آئی کہ آتی ہی چلی گئی اور جی اداس ہوگیا۔آخر ابا سے نہ دیکھا گیا اور انہوں نے زبردستی مجھے پھوپھی امی کے یہاں بھیج دیا جو میرے گھر سے دومیل دور ایک گاؤں سلامت پور میں رہتی تھیں۔

پھوپھی امی کے یہاں میرا جی بہل گیا۔وہ بھی شاید اسی گھڑی کی تاک لگائے بیٹھی تھیں۔ایک دن مجھے خوش دیکھ کر اچانک اپنے مطلب پر آگئیں۔

''آخر وہ کب تک تیرے لیے بیٹھی رہے گی؟''انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''کون؟''میں جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''ارے وہی عالیہ اور کون؟''وہ رازدارانہ لہجے میں بولیں۔

''اوہ!عالیہ باجی!''میں دھیرے سے بڑبڑایا اور پھوپھی امی کا چہرہ چولھے میں جلتی آگ کی طرح لال ہوگیا۔وہ ایک بارگی پھٹ پڑیں۔۔۔

''غضب خدا کا!ماں بیچاری یہی ارمان لئے چلی گئی اور بیٹے کا اب تک وہی حال ہے۔عمر عمر۔۔۔آخر پیارے رسولؐ اور خدیجہ بی بی کی عمر میں بھی تو۔۔۔۔''

وہ اسی طرح جانے کیا کیا بکتی رہیں۔اماں مرحومہ کا نام سنتے ہی میرا جی بھر آیا تھا۔میں کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر خدا جانے کیا سوچ کر اٹھتے اُٹھتے ہاں کردی۔پھوپھی امی اس طرح کھِل اٹھیں جیسے قارون نے اپنا سارا خزانہ ان کے قدموں میں ڈال دیا ہو۔سلامت پور میں آٹھ دس دن گزار کر میں گھر واپس آگیا۔اس دوران میں پھوپھی امی نے میری رضامندی کی اطلاع ابا کو بھیج دی تھی کیوں کہ اب ابا کی بوڑھی آنکھوں میں ایک بے نام سی چمک آگئی تھی اور وہ دن رات گھر کی مرمت اور سامان کی خریداری میں لگے ہوئے تھے۔

میں چپ چاپ یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن زبان بند تھی۔پھر بھی دل میں کوئی کانٹا سا چبھنے لگتا تھا۔تین چار روز بعد خالو جان کا خط آگیا کہ میں دیہات میں چھٹیاں گزارنے کے بجائے لکھنؤ چلا آؤں۔ابا پرانے خیال کے آدمی تھے۔میں سوچ رہا تھا کہ عالیہ باجی کے گھر جانے سے وہ مجھے خود ہی روکیں گے لیکن مجھے سخت حیرت ہوئی جب روکنے کے بجائے وہ مجھے مجبور کرنے لگے کہ میں چند دنوں کے لیے لکھنؤ چلا جاؤں۔ان کے بار بار کہنے سے میں ایک صبح لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا۔راستے بھر مجھے یہی خیال کچوکے لگا رہا تھا کہ اس واقعے کا ردعمل عالیہ باجی پر کیا ہوگا؟خدا جانے وہ کیا سوچیں گی؟میرے پہنچنے پر وہ خوش ہوں گی یا اداس؟ہو سکتا ہے شرما جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بور ہو جائیں۔

لکھنؤ پہنچا تو خالہ جان کے گھر کی دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دی۔اماں مرحومہ کی موت پر خالہ جان اپنے خاندان سمیت ہمارے گھر آئی تھیں۔اس بات کو دوسال کا عرصہ ہو چکا تھا۔لیکن یہ دوسال مجھے صدیوں کی پگڈنڈی پر بکھرے ہوئے،لانبے،بھولے بھٹکے دکھائی دیتے تھے۔ان دو برسوں میں سبھی تو بدل گئے تھے۔مجھے اکیلا پا کر رئیسہ کھلکھلاتی ہوئی پاس آئی اور دولہا بھائی کہہ کر زور سے ہنس

دی۔ ننھا خالد اب خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کا کنٹھا پھوٹ رہا تھا اور عجیب گھوں گھوں سی آواز ہو گئی تھی۔ لیکن میری نظریں تو عالیہ باجی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کن پردوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ یوں میں سوچ رہا تھا کہ لکھنؤ کی زندگی اور گرلز کالج کے ماحول نے انہیں شاید اب کچھ بدل دیا ہو۔ اس سال وہ بی ایس سی میں پڑھ رہی تھیں اور وہ بھی بڑا ہو کر ڈاکٹرنی بننے کے شوق کا جس نے انہیں برقعے کی دیوار کے اس پار کھڑا کر دیا تھا ورنہ عالیہ باجی ایسی نہ تھیں کہ اتنی آسانی سے منہ کھولے باہر آجائیں۔

لیکن عالیہ باجی پر نظر پڑتے ہی میں بوکھلا گیا۔ وہ ہو بہو ویسی ہی تھیں۔ وہ چپ چپ سے ہونٹ، حیران حیران سی آنکھیں، کھویا کھویا سا چہرہ اور جوان جسم پر بوڑھی سوچ کی پرچھائیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں شکایتوں کا ایک طوفان امڈ آیا۔ ان کی ساری بزرگی اور وقار اپنی ہار پر آنسو بن کر آنکھوں کے کٹوروں میں بھر گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ یہ کٹورے بس اب چھلکے تب چھلکے۔

اسی دن شام کو میں نے حضرت گنج سے گھوم پھر کر واپس آیا تو رئیسہ کے کمرے میں چلا گیا۔ عالیہ باجی اس کے ساتھ کیرم کھیل رہی تھیں۔ میرے پاؤں کی چاپ سنتے ہی انہوں نے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔۔۔ تم کچھ دنوں کے لیے تو مجھے اکیلا چھوڑ دو!

میں الٹے پاؤں واپس آنے کے لیے کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ رئیسہ چلائی ''ارے ارے کہاں چل دئے؟''

''میرا آنا کسی کو اچھا نہیں لگا شاید!'' میں نے اداس لہجہ میں کہا۔

''آخر کس کو؟'' رئیسہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اپنی بجیا سے پوچھ لو!'' میں دھیرے سے بولا۔

اور یہ سنتے ہی عالیہ باجی نے جواب تک کیرم بورڈ کے پتلے سے گھتے میں سما جانے کی کوشش کر رہی تھیں ایک پل کے لیے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ ان کے ہونٹ ایک دوسرے میں گڑے ہوئے تھے اور کہیں کہہ رہی تھیں۔۔۔

''میں رئیسہ کی بجیا ہوں۔ کیا تمہاری بجیا نہیں ہوں!''

میرا جی بری طرح اچاٹ ہو گیا۔ دوسرے دن خالہ جان کی ڈانٹ ڈپٹ اور رئیسہ کی ساری ضد کے باوجود میں گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ گھر پر اسی زور وشور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں نے دو چار دن تو صبر کیا لیکن ایک دن بڑی ہمت کر کے پھوپھی امی سے اتنا کہہ ہی دیا۔۔۔ ''میں ابھی شادی نہیں کروں گا!''

''کیوں؟'' پھوپھی امی نے یہ کہتے ہوئے میری طرف یوں دیکھا جیسے اچانک مجھے پاگل سمجھ بیٹھی ہوں۔

''ابھی مجھے نوکری مل جانے دیجئے!'' میں نے ٹالنا چاہا۔

پھوپھی امی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ ''بیٹا! آج کو تمہاری اماں ہوتیں تو۔۔۔'' انہوں نے وہی آزمایا ہوا نسخہ نکال لیا تھا۔ میری کنپٹیاں جل اٹھیں۔ اماں مرحومہ کی کمندیں تو موت کے بعد اور مضبوط ہو گئی تھیں۔

''ایسا ہی ہے تو میری شادی رئیسہ سے کر دیجئے!'' یہ کہتے کہتے میں نے دل پر ایک پتھر کا بوجھ محسوس کیا۔ پھوپھی امی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اٹھ کر ابا کے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے ابا سے اس سلسلے میں کیا باتیں کیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ ابا مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔ دو چار روز بعد جب میرا موڈ کچھ ٹھیک ہوا تو دھیمے لیکن سخت لہجے میں بولے۔۔۔ ''تمہاری شادی عالیہ ہی کے ساتھ ہوگی! لیکن میں اس وقت کا انتظار کروں گا جب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔۔۔''

اس دن پہلی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں ساری عمر یوں ہی بے روزگار پڑا رہوں۔ لیکن قسمت بھی مجھ سے شاید کوئی بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس واقعے کے ٹھیک دس دن بعد معلوم ہوا کہ ریلوے میں ایک تین سو روپئے کی نوکری مجھے مل گئی ہے اور دو ہفتے کے اندر ہی مجھے جوائن کر لینا ہے۔

اب زندگی کا ایک نیا موڑ سامنے آ گیا۔ میں سب کچھ بھول کر ایک ٹرنک اور بستر لیے ہوئے ایک شام الٰہ آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ اچھی خاصی نوکری مل جانے کی وجہ سے میں مستقبل کی طرف سے اب بے پروا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ جب قسمت ہی مجھے اور عالیہ باجی کو ایک رشتے میں جوڑنا چاہتی ہے تو میں اماں مرحومہ کی ایک آرزو پوری ہی کیوں نہ کر دوں۔ سچ تو یہ ہے کہ دھیرے دھیرے عالیہ باجی میرے دل میں ایک نئے روپ کے ساتھ جگہ بناتی جا رہی تھیں۔

لیکن ایک روز اچانک ابا کے خط کو دیکھ کر میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میری شادی بائیس دسمبر کو رئیسہ کے ساتھ ہوگی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب ہر بار مجھے عالیہ باجی کے بجائے رئیسہ ہی کا نام دکھائی دیا تو میری آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بڑی کرب ناک الجھن تھی۔ آخر کار میں نے بیماری کا بہانہ کر کے تین روز کی چھٹی لی اور گھر چلا آیا۔

نائٹرک ایسڈ کے کچھ چھینٹے بھک سے اڑ کر عالیہ باجی کی آنکھوں میں پڑ گئے تھے اور وہ ہمیشہ کے لیے اندھی ہو گئی تھیں۔ یہ بات مجھے گھر پہنچتے ہی معلوم ہو گئی جسے سنتے ہی میرے پاؤں ڈگمگانے لگے اور حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا۔ میں نے سوچا کہ دنیا جہان کے سر پر ہاتھ رکھنے والی عالیہ باجی کا ہاتھ اب کون تھامے گا؟ بڑی مشکل سے میں نے چلتے چلتے ابا سے بس اتنا کہا کہ میری شادی بائیس دسمبر کو ہوگی لیکن عالیہ باجی کے ساتھ!

پھوپھی نے میری بات سن لی تھی جیسے ہی میں ان کے قریب سے گزرا وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔۔۔ ''یوں جان بوجھ کر کون

جیتی مکھی نگلتا ہے؟''
''لیکن پھوپھی امی۔۔۔'' میں نہ معلوم کیا کہنا چاہتا تھا لفظ حلق میں ڈوب کر رہ گئے۔
''لیکن ویکن کچھ نہیں۔عالیہ جنم جنم کی ایسی ہی تھی جب دیکھو بسورتی سی صورت!'' پھوپھی امی تیز لہجے میں بولیں اور مجھے غصہ آ گیا لیکن بڑے ضبط سے کام لے کر میں نے بس اتنا کہا۔۔۔''اماں مرحومہ کی آرزو کا تو خیال کیجیے پھوپھی امی!''
پھوپھی امی کچھ نہ بول سکیں۔میں نے انہیں کا حربہ ان پر آزمایا تھا۔ ابا چپ رہ کر بھی سب کچھ کہہ گئے۔میری ہٹ دھرمی کے آگے سب کو جھکنا پڑا اور بالآخر یہ طے ہو گیا کہ دسمبر کی بائیس کو میری شادی عالیہ باجی کے ساتھ ہوگی۔
کیلنڈر کے ورق دھیرے دھیرے پھٹتے گئے اور دسمبر آ گیا۔ایک مہینے کی چھٹی لے کر میں گھر چلا آیا۔بہت سارے رشتے دار جمع تھے ہر شخص مجھے بڑی گھٹیا ترس آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔میں سب کچھ سمجھ کر بھی خوش اور مطمئن تھا۔یہ خوشی کیا کم تھی کہ بچپن سے اپنی بڑائی کا رعب جمانے والی عالیہ باجی پلک جھپکتے میں مجھ سے چھوٹی ہو گئی تھیں اور قسمت کی ایک معمولی سی شرارت نے ان کی بزرگی کا اونچا پہاڑ فرش پر ڈال دیا تھا۔
نکاح کے دو بول پڑھ کر میں نے عالیہ باجی کی خود ساختہ بزرگی کا بت ہمیشہ کے لیے توڑ دیا اور وہ رخصت ہو کر میرے گھر آ گئیں۔
رات کو شاید بارہ بجے یا ایک بجے، مجھے وقت یاد نہیں جب سب کے سب سو گئے تو کلثوم بھابھی نے مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھا لی۔
عالیہ باجی پھولوں سے سجے پلنگ پر گول مول سی گٹھری بنی پڑی تھیں۔لال جوڑا عطر میں بسا ہوا تھا اور کمرے میں سارے جہان کی خوشبوئیں سما گئی تھیں۔
''آج بڑی ٹھنڈک ہے عالیہ با۔۔۔'' کہتے کہتے میں اچانک رک گیا۔پھر اپنے آپ ہنسی آ گئی۔عالیہ باجی اسی طرح دم سادھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں پلنگ پر جیسے ہی چڑھا ایسا لگا کہ عالیہ باجی کے بدن سے ابلتی مہک میرے وجود پر چھائی جا رہی ہے۔میں بڑے جذباتی انداز میں بولا۔۔۔عالیہ! میری جان! میری عورت! دیکھو میں تم سے کتنا بڑا ہوں۔میں۔۔۔'' اور میں نے گھونگھٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔لیکن میرا جی دھک سے ڈوب گیا۔عالیہ باجی کہاں تھیں؟ایک بے جان جسم بڑی بڑی کٹوروں جیسی آنکھوں پر پپوٹوں کی چادر تانے سو رہی تھیں اور ادھ کھلے ہونٹ جیسے کہہ رہے تھے۔۔۔''یہ سب کہتے تجھے شرم نہیں آئی؟ دیکھ میں تجھ سے بڑی ہوں نا؟''
میں دھیرے سے بڑبڑایا۔۔۔''تم ٹھیک کہتی ہو عالیہ باجی۔زندگی نے ایک موڑ پر لا کر تمہیں مجھ سے چھوٹا کر دیا تھا۔مر کر تو تم اور بڑی ہو گئیں!''
اور ان کی چھاتی سے لپٹ کر میں ہچکیاں لینے لگا۔

مثنوی

زوالِ آدم

دشت سالوس

دشت سالوس میں مندر بھی کلیسا بھی ہے
روئے باریش بھی ہے، زلف مقطّع بھی ہے
آسماں گیر اذانوں کی صدائیں بھی ہیں
قل ہو اللہ کا آفاق میں چرچا بھی ہے
گیرواجبّہ بھی ہے ہاتھ میں مالا بھی ہے
گردن زہد و عبادت میں چلیپا بھی ہے
دست بے فیض میں تسبیح بھی دھاگا بھی ہے
زیر انگشت طلب سلک مطلّا بھی ہے
فرق مختوم پہ پر پیچ عمامہ بھی ہے
روبرو وید بھی، انجیل بھی، گیتا بھی ہے
لیک اطوار ہیں کچھ مطمحِ اطوار کچھ اور
لفظ کچھ اور ہیں اور مقصد گفتار کچھ اور
رمز اقرار ہے کچھ معنیٔ انکار کچھ اور
نفس مضمون ہے کچھ لہجہ اظہار کچھ اور
پیش دیوار ہے کچھ اور پس دیوار کچھ اور
نسخۂ درد ہے کچھ، حالت بیمار کچھ اور

فضا اعظمی
(کراچی)

ڈرامہ

چوراہا

شمیم حنفی

آوازیں:

۱۔چچامیاں   عارف اور آصف کے والد، بوڑھے، چالاک، دنیادار بزرگ
۲۔چچی امی   عارف اور آصف کی والدہ
۳۔عارف   جذباتی خواب پرست نوجوان
۴۔آصف   نوجوان، کالج کا طالب علم
۵۔ججن میاں   چچامیاں کے دوست۔ چرب زبان۔ گھاگ
۶۔ظہیر خالو   عارف اور آصف کے خالو
۷۔رحیمن   ملازمہ
۸۔مقرر
۹۔قلی

کمار گندھرو کی آواز میں کبیر داس کا بھجن: ''کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو''
ابتدائی موسیقی۔۔۔(دھیمی اور حزینہ)
فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی دور سے چچامیاں کی آواز آتی ہے۔

چچامیاں: آصف! او آصف:

آصف: (دور) آرہا ہوں۔(بھاگتا ہے)

چچامیاں: (جھنجھلا کر) آرہا ہوں! لاٹ صاحب کہیں کے۔ کتنی بار کہا کہ بڑوں کو جواب اس طرح نہیں دیا جاتا۔

آصف: (دھیرے سے) جی!

چچامیاں: اب جی جی کیا کہہ رہے ہو! جب کوئی پکارے تو کہنا چاہیے ''حاضر ہوں'' یہ کیا لٹھ مار جواب ہے ''آرہا ہوں''۔ اے میاں تمیز تہذیب سب دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب تم لوگوں کو بھلے آدمیوں کی طرح بولنا آتا ہے، نہ اُٹھنا بیٹھنا!

آصف: جی!

چچامیاں: اور تمہاری چچی کیا کر رہی ہیں؟

آصف: بورچی خانے میں ہیں۔

چچامیاں: جاؤ! کہو ہم انہیں یاد فرمارہے ہیں۔ ذرا پل بھر کو سن لیں۔

آصف: جی اچھا (جاتا ہے) (دور سے) چچی امّی! آپ کو چچامیاں بلا رہے ہیں۔

(دونوں آتے ہیں)

چچامیاں: (بگڑ کر) لاحول ولاقوۃ۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ''چچامیاں بلا رہے ہیں!'' تم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یاد فرمارہے ہیں؟ ہاتھ پانو گز بھر کے ہو گئے مگر بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔

چچی امّی: ہے ہے۔ میں کہتی ہوں ایسی کیا قیامت آگئی۔

چچامیاں: قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ سب تباہی کے آثار ہیں چچامیاں بلا رہے ہیں۔ ہونہہ۔

چچی امّی: تم بھی خامخواہ بات کا بتنگڑ بنائے دیتے ہو! میں کہتی ہوں ایسی کون سی چھت ٹوٹ پڑی۔ بچہ ہے دھیرے دھیرے سیکھ جائے گا۔

چچامیاں: (طنزاً) جج جی ہاں۔ یہ لمڈھیک ہو گیا۔ ابھی بچہ ہی بنا ہوا ہے۔ اور عارف کہاں ہے۔

چچی امّی: ہوگا کہاں! وہیں چھت پر۔ شام کا وقت ہے۔ کتنا کہا بیٹا دونوں وقت مل رہے ہوں تو یوں منہ چھپائے کمرے میں نہ پڑے رہا کرو۔ مگر اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔

آصف: کمرے میں نہیں ہیں بھائی جان۔

چچامیاں: پھر کہاں ہے؟

آصف: چھت پر۔

چچی امّی: اے لو! چھت پر کیا کر رہے ہیں؟ میں تو سمجھتی تھی کمرے میں گھسے پڑھ رہے ہوں گے۔

آصف: بھائی جان تو روز شام کو دیر تک چھت پر بیٹھے رہتے ہیں۔

چچامیاں: کیا کرتا رہتا ہے وہاں!

آصف: آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔(ہنستا ہے)

چچامیاں: دماغ سنک گیا ہے اس کا۔ ہونہہ، جاؤ کہو میں بلا رہا ہوں۔

(آصف جاتا ہے)

چچی امّی: اب تم ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے نہ پڑ جانا۔

چچامیاں: افوہ! تم تو سمجھتی ہو میری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ میں بھلا اس کے پیچھے کاہے کو پڑوں کا۔ لیکن میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی بات ہوئی آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ کسی سے نظر بازیاں ہو رہی ہوں گی۔

چچی امّی: اے لو! اب یہ ایک نئی بات نکالی تم نے۔

چچامیاں: تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟

چچی امّی: اور نہیں تو کیا؟ اپنا عارف ایسا نہیں ہے۔

چچامیاں: ایسا تو عارف کا باپ بھی تھا۔ یاد کرو! تم بھی تو روز شام کو چھت پر آ جاتی تھیں اور میں اپنی چھت سے۔۔۔(ہنستے ہیں)

چچی امّی: ختم کرو یہ چونچلے۔ بوڑھے ہونے کو آئے۔۔۔نوج۔

(عارف اور آصف کے قدموں کی چاپ)

چچامیاں: ششش شی۔

(دونوں اندر آتے ہیں)

چچامیاں: تو میاں! یہ تم چھت پر کیا کرتے رہتے ہو؟
عارف: کچھ بھی تو نہیں۔ یونہی بیٹھا تھا۔
چچامیاں: میں بھی تو سنوں۔۔۔ یونہی بیٹھے کیا کر رہے تھے؟
عارف: (کھوئی ہوئی آواز میں) پرندے۔ پرندے لوٹ رہے تھے۔
چچامیاں: یہ دیکھو! میں نہ کہتا تھا۔ پرندے۔ پرندے آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟
عارف: کچھ بھی نہیں چچامیاں۔
چچامیاں: لل لیکن۔ پرندے
چچی امّی: اُفّوہ! چھوڑو بھی۔ تم تو بات کا بتنگڑ بنانے کے عادی ہوگئے ہو۔
چچامیاں: (ایک طویل سانس لے کر) اچھا خیر۔۔۔ تو تم یہ کرو کہ آصف کو لے کر حکیم ابن صاحب کے پاس چلے جاؤ، میرا اسلام عرض کرنا۔ پھر کہنا کہ جو نسخہ اب تک چل رہا تھا اس سے تو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔
عارف: مگر اسے دواؤں کی ضرورت ہی کیا ہے؟
چچامیاں: (بگڑ کر) تو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟
چچی امّی: ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ ایسی کون سی بیماری اس کی جان کو لگی ہوئی ہے جو تم نسخے پر نسخہ گھول کر پلائے جا رہے ہو۔ اے یہی نا کہ ذرا غائب دماغ رہتا ہے۔ بچپن ہے عمر کے ساتھ یہ بات جاتی رہے گی۔
چچامیاں: خدا کے لیے تم ان باتوں میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ عارف! تم لے جاؤ اسے۔
عارف: جی اچھا۔

(دور دروازے پر دستک)

چچی امّی: اے ذرا دیکھو تو بیٹا کون ہے یوں کواڑ پیٹے جا رہا ہے۔ ہونہ ہو وہی جمّن میاں ہوں گے! اُٹھائی گیرے۔

(عارف جاتا ہے)

چچامیاں: (دھیرے سے) اری نیک بخت۔ تمہاری زبان کو کیا ہوگیا ہے۔ میں کہتا ہوں غریب گھڑی دو گھڑی کے لیے آجاتے ہیں۔ میرا دل بھی بہل جاتا ہے۔
چچی امّی: ہونہہ۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے! آتے ہیں تو بس چپک جاتے ہیں۔ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔
چچامیاں: (ٹالتے ہوئے) اچھا تو تم یہ کرو کہ ذرا پان بنا دو۔ اور آصف تم ذرا حقہ تازہ کر دو اور عارف سے کہو کہ ذرا شطرنجی بھی بچھا دیں۔
چچی امّی: ابھی تو حکیم صاحب کے ہاں جانے کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اب سب کچھ چھوڑ کر موئی جوئے بازی کا چکر شروع ہوگیا۔ جمّن میاں کا کیا ہے؟ جورو نہ جاتا، آوارگی سے ناطہ۔
چچامیاں: اے بی بی کچھ تو سمجھو تمہاری یہ بکواس اس غریب نے سن لی تو۔
چچی امّی: میں بکواس کر رہی ہوں۔
چچامیاں: (زچ ہو کر) نن نہیں نہیں۔ بیگم۔ بیگم۔ تم جو فرما رہی ہو۔ سوچو تو گھر آئے مہمان کی توہین۔
چچی امّی: تو اب وہ مہمان بھی ہوگئے ہیں۔ لاکھ برس یہ نہ ہونے دوں گی۔ مجھ سے یہ رت جگا نہ ہوگا آدھی آدھی رات تک موئی بازیاں لگ رہی ہیں۔ چالیں چلی جا رہی ہیں۔ حقّے کی گڑگڑی لگی ہوئی ہے۔ پان پر پان بنائے جا رہے ہیں۔ یہ سب کرنا ہے تو کہہ دو کہ اپنے گھر۔
چچامیاں: (بگڑ کر) تو دروازے بند کر دوں۔ ٹکا سا جواب دے دوں۔ ساری بستی میں اپنی ہنسی اڑواؤں کہ بڑے رئیس زادے بنتے ہیں اور گھر آئے مہمان کو۔۔۔
چچی امّی: میں کہتی ہوں وہ مہمان کب سے ہوگئے ہمارے؟ ان کا گھر نہیں ہے؟
چچامیاں: اچھا تو ٹھیک ہے۔ میں ہی چلا جاتا ہوں ان کے گھر۔۔۔ آجاؤں گا گھنٹے بھر میں۔
چچی امّی: میں کہے دیتی ہوں۔ نہ تمہیں جانے دوں گی نہ انہیں یہاں ٹکنے دوں گی۔ یہ گھر ہے کوئی سرائے نہیں ہے۔ مسافر خانہ نہیں ہے چوپال نہیں ہے۔ سمجھے۔

(ملے جلے قدموں کی آواز قریب آتی ہے)

عارف: یہ ظہیر خالو آئے ہیں۔
چچی امّی: (حیرت سے) ایں ارر ظہیر میاں۔
چچامیاں: کک کون جمّن میاں۔ جمّن میاں نہیں آئے۔ ظ ظ۔ ظہیر میاں۔
ظہیر خالو: (تنک کر) آتے ہی بے آبروہی ہوئی۔ میں واپس جاتا ہوں۔ رات مسجد میں کاٹ لوں گا۔
چچی امّی: اے ہے۔ تم سمجھو تو۔۔۔ ہم اصل میں۔۔۔
ظہیر خالو: جانے دیجیے آپا۔ میں نے سب سُن لیا ہے۔ یہ مسافر خانہ نہیں ہے۔ سرائے نہیں۔ چوپال نہیں۔ اب میں ایسا بے غیرت تو نہیں کہ۔۔۔
چچامیاں: ارے بھائی۔ یہ سب تمہارے لیے تھوڑی کہا جا رہا تھا۔
ظہیر خالو: اب باتیں نہ بنائیے بھائی صاحب۔
چچامیاں: یقین جانو۔ واللہ۔۔۔ وہ تو ایک اور صاحب ہیں۔ اٹھائی گیرے جب دیکھو وارد ہو جاتے ہیں۔ نہ دن دیکھیں نہ رات اور میں ٹھہرا مروّت والا آدمی۔ کوئی اور تو منہ لگاتا نہیں۔
ظہیر خالو: کون صاحب ہیں؟
چچامیاں: ارے ہیں ایک صاحب، بگڑے نواب۔ جمّن میاں۔
ظہیر خالو: وہی تو نہیں جو حسن پور کے تعلقہ دار تھے۔
چچی امّی: ہاں ہاں وہی! تو تم انہیں جانتے ہو۔
چچامیاں: ارے شیطان کی طرح مشہور ہے وہ شخص۔ سنا ہوگا نام کسی سے۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ تمہاری آپا کو تو خدا جھوٹ نہ بلوائے اس کے نام سے نفرت ہے۔ یہ اسی کو سمجھ کر اول فول بک رہی تھیں۔

چچی امّی: کیا کہا؟ اول فول بکیں میرے دشمن۔

چچا میاں: ارے بھائی تم نے جو کہا سو فی صدی سچ کہا۔ میں خود اس شخص کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ میرا تو بس یہ ہے کہ گھر کوئی بھی آ جائے، کیسے دھتکار دوں اسے!

(دروازے پر دستک)

چچی امّی: اے ہے۔ بیٹا عارف، ذرا دیکھو تو پھر کوئی ٹپک پڑا۔ خدا جانے کون ہے؟

(عارف جانے لگتا ہے)

چچا میاں: اور پھر آصف کو حکیم ابّن کے پاس لے جاؤ، سمجھے اور کہنا اس نسخے سے کوئی خاص۔

چچی امّی: اوں ہوں، پہلے اسے دیکھنے تو دو کون آیا ہے۔ جاؤ عارف۔

(عارف جاتا ہے)

وقفہ

(عارف واپس آتا ہے)

چچا میاں: کون ہے۔

عارف: نواب مجّن آئے ہیں۔

چچا میاں: مم مجّن میاں۔ مجّن میاں۔ بٹھا دیا انہیں۔

چچی امّی: آ گئے پھر اپنی اوقات پر۔

ظہیر میاں: کیا بات ہے آپا جان۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

چچا میاں: عارف۔ بیٹے جاؤ بٹھاؤ انہیں دیوان خانے میں۔ اور حقہ اور بیگم تم ذرا پان۔۔۔

چچی امّی: سُن رہے ہو ظہیر! ابھی ان کے نام پر صلواتیں بھیجی جا رہی تھیں۔ اب آنکھیں بچھائی جا رہی ہیں۔

چچا میاں: اور ظہیر میاں ہاتھ منہ دھولو۔ کھانا میں ذرا دیر سے کھاتا ہوں۔ سمجھیں بیگم۔ عارف اور آصف کے ساتھ کھانا کھلا دو انہیں، بھائی معاف کرنا۔ میں ذرا دیکھ لوں۔ خدا جانے کس ضروری کام سے اس وقت آ گئے ہیں مجّن میاں۔

چچی امّی: ضروری کام؟ مجھے سب پتا ہے۔ وہ ضروری کام تم بھی دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے ظہیر میاں!

چچا میاں: اچھا تو میں ذرا دیوان خانے میں چلتا ہوں۔

(جاتے ہیں)

موسیقی

(موٹر کے ہارن۔ سڑک پر ٹریفک کا شور)

عارف: آصف!

آصف: جی بھائی جان

عارف: یہ کھڑکی بند کردو۔ شور بہت ہے۔

(کھڑکی بند کرتا ہے)

عارف: کیا ہوا؟ آج کوئی خط آیا گھر سے

آصف: جی یہ ڈاک آئی ہے۔

عارف: (خط پڑھتے ہوئے) ہم لوگ اگلی جمعرات کو نکلیں گے۔ جمعہ کی صبح کو تمہارے پاس آ جاویں گے۔ اسٹیشن یا تو خود آ جانا یا پھر آصف کو بھیج دینا نہیں تو مشکل پیش آئے گی۔ باقی سب خیریت ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ ہمارے ساتھ اسباب بہت ہوگا اس لیے کسی یکّے والے سے بات کر لینا۔ (ہنستا ہے)

آصف: کیا ہوا بھائی جان۔

عارف: چچا میاں نے لکھا ہے کسی یکّے والے سے بات کر لینا۔ شاید وہ اسی گمان میں ہیں کہ یہاں یکّے چلتے ہیں۔ جمعہ کی صبح کو آ رہے ہیں۔ اسٹیشن تم چلے جانا۔ مجھے تو دفتر پہنچنے کی جلدی ہوگی۔ ویسے میں اس روز جلدی ہی لوٹ آؤں گا۔

آصف: اور ہاں، چچا میاں کبوتروں کی جوڑی بھی تو لا رہے ہیں اپنے ساتھ۔ ان کا انتظام بھی کرنا ہے۔

عارف: (دروازہ کھولتے ہوئے) ارے آپ مجّن چچا!

مجّن میاں: ہاں میاں! کب سے تمہارا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا تو خیر میں نے تمہارا خط ملنے سے پہلے ہی لے لیا تھا۔

عارف: تو آپ آئے کب؟

مجّن میاں: کوئی ہفتہ بھر ہوا۔

عارف: ٹھہرے کہاں ہیں؟ خیر اندر تو آیئے۔ (دونوں اندر آتے ہیں) تو آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟

مجّن میاں: ایک ننہالی عزیز رشتے دار ہیں وہ کیا نام ہے کرشنا کالونی میں۔ انہیں کے ساتھ قیام ہے۔ اب سوچ رہا ہوں اپنا کاروبار؟

عارف: کاروبار؟ کیسا کاروبار؟

مجّن میاں: وہ جو ہم سے چل سکے۔ یہ ٹیکسیوں کا کاروبار کیسا رہے گا۔

عارف: ٹیکسیاں؟

مجّن میاں: ہاں! اگر دو گاڑیاں خرید لوں تو گزارا ہو جائے گا۔ میرے وہ عزیز بھی یہی کرتے ہیں۔ ان سے مشورہ کیا تو یہی سمجھ میں آیا۔ باہر ٹیکسیاں چلیں گی۔ ہم آرام سے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔

عارف: (کچھ سوچتے ہوئے) گھر سے چچا میاں کا خط آیا ہے۔ وہ اور چچی امّی جمعہ کی صبح کو آ رہے ہیں۔ (ہنس کر) چچا میاں نے لکھا ہے کہ کسی یکّہ بان سے بات کرلوں، انہیں اسٹیشن سے گھر لانے کے لیے۔

مجّن میاں: جواب نہیں بھائی صاحب کا بھی۔ میں نے جب گھر چھوڑا تو کہتے تھے کہ شہر ہی اصل میں رہنے کی جگہ ہے۔ گانو میں اب رکھا کیا ہے؟ اور یہ بھی کہتے تھے کہ شہر میں سواری کے نام پر بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ پھر یکّے کا خیال انہیں کیسے آیا۔

عارف: وہ تو ٹھیک آیا مجن چچا۔سب کچھ بھول جانا بھی اچھا نہیں۔

مجن میاں: ارے میاں دیکھنا! شہر آ کر سب کچھ بھول جائیں گے۔

عارف: پرندے دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں۔راستہ بھول تو نہیں جاتے۔

مجن میاں: (حیرت سے) پرندے؟ یہ پرندے اچانک کیسے یاد آ گئے۔

عارف: (ہنس کر) چچا میاں کبوتروں کی ایک جوڑی بھی ساتھ لا رہے ہیں۔

مجن میاں: (حیرت سے) کبوتر؟ یعنی کہ کبوتر؟

عارف: ہاں! کبوتر۔وہ سفید کبوتروں کی جوڑی۔

مجن میاں: تو گویا کہ کبوتر بھی سفر کریں گے ان کے ساتھ! ریل گاڑی میں؟

عارف: ہاں۔زمین کا سفر۔اس میں کیا حرج ہے؟

مجن میاں: حرج کی تو کوئی بات نہیں مگر یہاں ان کا بندوبست۔

عارف: سب ہو جائے گا۔جب چچا میاں یہاں رہ سکتے ہیں تو کبوتر بھی رہ سکتے ہیں۔

مجن میاں: (اکتا کر) اچھا تو میاں میرا ایک کام بھی کر دو۔ٹیکسیوں کا لائسنس۔

عارف: اور ڈرائیور۔

مجن میاں: وہ تو بعد کی بات ہے۔پہلے تو لائسنس ملنا چاہیے۔موٹریں تو میں آج خرید لوں! سیکنڈ ہینڈ آسانی سے مل جاتی ہیں۔جب سے پٹرول مہنگا ہوا ہے لوگ دھڑا دھڑ اپنی گاڑیاں بیچ رہے ہیں۔میرے وہ عزیز جن کے ساتھ میں ٹھہرا ہوا ہوں شاید دو چار آدمیوں سے بات بھی کر چکے ہیں۔کہتے تھے ہاتھ کے ہاتھ موٹریں مل جائیں گی۔

عارف: لائسنس میں بنوا دوں گا۔اس دفتر میں میری جان پہچان ہے۔

مجن میاں: اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں۔تمہارا دفتر بھی تو اسی بلڈنگ میں ہے۔

عارف: تو آپ کو سب کچھ معلوم ہے (ہنس کر) آپ شہر میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔

مجن میاں: اجنبی تو ہم دیہات میں بھی نہیں تھے۔جیسا دیس ویسا بھیس۔شہر کو سمجھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔میں نے تو اپنے تعلقے کی بربادی سے اس آبادی کا بھید سمجھا ہے۔اس آبادی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا بھائی۔(ایک لمبی سانس بھرتے ہیں)

عارف: (کچھ سوچتے ہوئے) دیکھیے چچا میاں کا کیا حال ہوتا ہے۔میں تو اب تک اس آبادی کو سمجھ نہیں سکا۔سفر ٹھیک ہے! مگر صرف دن بھر کا شام ہوتے ہوئے گھر لوٹ آنا چاہیے جیسے پرندے لوٹ آتے ہیں۔

مجن میاں: (حیرت سے) پھر وہی پرندے۔پرندے (پرخیال انداز میں) مگر پھر مجھ میں لوٹنے کی خواہش کیوں باقی نہیں۔

عارف: شاید اس لیے کہ آپ کا کوئی گھر نہیں تھا! آپ ہمیشہ آرام سے رہیں گے مجن چچا بربادی تو ہماری ہے۔

مجن میاں: (ہنستے ہیں) ارے میاں یہ تم کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

عارف: چائے منگواؤں آپ کے لیے۔

مجن میاں: چائے نہیں۔کولڈ ڈرنک چل جائے گی۔

(پس منظر سے ہارن کی آواز۔ٹریفک کا شور)

آصف: یہ کھڑکی بند کر دوں بھائی جان؟ اپنے آپ کھل گئی۔

عارف: نہیں۔۔۔کھلی رہنے دو۔اور مجن چچا کے لیے کوکا کولا کی ایک بوتل لے آؤ۔

مجن میاں: خوب ٹھنڈی۔ڈیپ فریز۔(ہنستے ہیں)

مضحکہ خیز موسیقی

منظر بدلتا ہے

(شام کا وقت۔دور مسجد سے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے)

چچا میاں: آموختے کی طرح پڑھتے ہوئے۔آر۔او۔اے۔ڈی۔روڈ۔روڈ معنے سڑک۔آر۔او۔اے۔ڈی۔روڈ۔آر۔او۔اے۔ڈی۔

چچی امّی: (قریب آتے ہوئے) واہ بھئی واہ۔بڈھے طوطے آسانی سے نہیں سیکھ سکتے۔تم یہ کیا روڈ روڈ لگائے ہوئے ہو۔

چچا میاں: شہر میں رہنا ہے تو یہ سب سیکھنا ہوگا۔دیکھ رہی ہو یہ نقشہ؟ تمام سڑکوں، علاقوں اور تاریخی جگہوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

چچی امّی: (جھکتے ہوئے) اسے ذرا میں بھی تو دیکھوں۔اپنا عارف کہاں رہتا ہے؟

چچا میاں: (پراعتماد انداز میں) ابھی بتاتا ہوں۔یہ دیکھو۔۔۔یہ رہی کارنواس روڈ۔یعنی کہ سڑک! اس کے پیچھے یہ رہا بی بی کا مقبرہ۔بس مقبرے کے پہلو میں عارف میاں کی بستی ہے۔

چچی امّی: بستی کا نام کیا ہے؟

چچا میاں: نام تو کچھ بے ڈھنگا ہے۔سریندر پرتاپ کو۔لو۔نی، کو۔لو۔نی سمجھیں، کو۔لو۔نی کا مطلب ہے بستی۔نئی بستی ہوگی۔

چچی امّی: چلو اچھا ہے۔بستی میں گھر لیا۔پاس پڑوس ہوگا۔مگر آبادی کس قوم کے لوگوں کی ہے، کچھ پتا چلا۔

چچا میاں: اب یہ تو اس نقشے میں نہیں لکھا ہے، مگر نام سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔سریندر پرتاپ وہ جو مڈل اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے یہاں آتے ہیں۔مہندر پرتاپ۔وہ تو ٹھاکر ہیں۔ہو سکتا ہے اس بستی میں زیادہ تر وہی لوگ آباد ہوں۔شہر کا حال ہمارے یہاں سے بہت الگ ہے۔

چچی امّی: الگ کیا؟ اے عارف کو گھر لینا تھا تو ایسی جگہ جہاں آس پاس اپنوں کے گھر ہوتے ہیں۔موت زندگی کا کیا بھروسا۔وقت ناوقت کوئی ضرورت آن پڑے۔

چچا میاں: اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم ان معاملات میں حجت نہ کیا کرو۔تم کیا جانو شہر کیا ہوتا ہے۔وہاں چوڑی چوڑی روڈیں، کو۔لو۔نیاں۔یہ سب ہوتا ہے۔عارف نے لکھا ہے یکّے تانگے کچھ قدیمی علاقوں میں چلتے ہیں۔مگر وہ تو نئے

علاقے میں رہتا ہے۔

چچی امّی: اسٹیشن سے کتنی دور ہے اس کا گھر؟

چچا میاں: (نقشے پر جھکتے ہوئے) نقشے کے مطابق تو کافی دور ہے، عارف نے لکھا تھا اسٹیشن سے گھر تک بس سے کوئی پون گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ قریب قریب اتنا ہی وقت جتنا ہمارے یہاں سے پرتاب گڑھ شہر تک لگتا ہے۔

چچی امّی: (حیرت سے) اللہ۔۔شہر نہ ہوا ملک ہو گیا۔ بھلا آبادی کیا ہوگی اس شہر کی۔

چچا میاں: بھرا پُرا شہر ہے۔ کچھ نہیں تو تیس چالیس لاکھ نفوس بستے ہوں گے۔

(دروازے پر دستک)

چچی امّی: اے ذرا دیکھو تو۔۔۔کون ہے۔۔۔بوا رحیمن۔۔۔اے رحیمن!

رحیمن: (دور سے) آئی بی۔ (آتی ہیں) (دروازے پر دستک)

چچی امّی: اے ذرا دیکھو تو کون ہے؟ (جاتی ہیں۔ پھر آتی ہیں)

رحیمن: وہ سلطان میاں کا لونڈا تھا۔ کہہ گیا ہے کل ان کی بچی کا عقیقہ ہے۔ دن کے کھانے کا بلاوا ہے۔

چچا میاں: کھانا یعنی کہ دعوت۔ مم مگر۔۔۔ یہ سب کیا فضول خرچیاں ہیں۔ ارے بھئی وہ زمانے اب نہیں رہے جب بیس پچیس میں ایک فربہ جانور مل جاتا تھا۔ پتا ہے اب بکرے کا گوشت پندرہ روپے سیر بک رہا ہے۔ خیر بلایا ہے تو چلا جاؤں گا۔

چچی امّی: اے گرانی سی گرانی ہے۔ بس آدمی کی جان سستی ہو گئی۔ سبزی ترکاری کے بھاؤ میں پہلے مرغ آ جاتا تھا، دیسی گھی اب آنکھ میں لگانے کو بھی مہنگا ہے۔

چچا میاں: میں کہتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کم کھاؤ، معمولی کھاؤ۔

چچی امّی: تمہاری ان باتوں سے تو جی الجھتا ہے۔ ابا مرحوم کے زمانے تک گھر میں پانچ پانچ نوکر تھے۔ اب لے دے کے ایک رحیمن۔ روز کھانے پینے میں کیا اہتمام ہوتا تھا اور اب بس پیٹ بھر لیا چوپایوں کی طرح۔

چچا میاں: تو اس میں برائی کیا ہے؟ کیا بزرگوں کی ساری کمائی اڑا دوں۔ لٹا دوں۔ گنوا دوں سب کچھ! دیکھتی نہیں ہو! اب بھی حیثیت بنی ہوئی ہے۔ چار پیسے جیب میں ہیں تو دنیا دبتی ہے۔ وجّو بھائی کا بیٹا عرب چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے کاروبار میں خدا نے برکت دی۔ اب وطن آتا ہے تو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔ اچھے بھلے طرّم خاں جو بنتے تھے اب اس کا حقہ بھرتے ہیں۔ اس کی مصاحبت میں رہتے ہیں۔

چچی امّی: بھلا کیا کاروبار ہے اس کا؟

چچا میاں: وہ تو کچھ اور بتاتا ہے مگر زبان خلق کچھ اور کہتی ہے۔

چچی امّی: کیا؟ بھلا میں بھی تو سنوں!

چچا میاں: تم نہیں سمجھو گی۔ اسمگلنگ۔ یہ ایک نئی وضع کا کاروبار ہے اور اس میں بڑی برکت ہے۔ بس ذرا پھنس جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

چچی امّی: کہاں پھنس جانے کا؟

چچا میاں: یہی قانون کا ڈر (لاپروائی سے) مگر اس میں کیا ہوتا ہے؟ پیسا پاس ہو تو سب غلام! قانون بھی غلام۔ لوگ ہاتھ لگاتے گھبراتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ افیون بیچتے ہیں۔ دروازے پر موٹریں جھولتی ہیں۔ ملازموں کی بھیڑ ہے اچھے اچھے سلامی دینے کو حاضر۔

چچی امّی: (حسرت آمیز انداز میں) سچ ہے، پیسا ہی سب کچھ ہے۔

چچا میاں: کوڑی نہ ہو تو آدمی کوڑی کا تین ہو جاتا ہے۔ سمجھیں! اسی لیے میں نے پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ جمّن میاں کو دیکھو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لنڈورے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ مگر زمانے کا رنگ سمجھتے تھے۔ شہر چلے گئے۔ کہتے تھے کوئی کاروبار سنبھالیں گے۔ گھر کی جمع پونجی اُڑانے پر آتے تو دو چار برس میں سب کچھ ہوا جاتا۔ پیسا تو پکڑنے سے رکتا ہے۔

چچی امّی: مگر تمہاری طرح بھی نہ پکڑے اسے کوئی۔ آدمی آرام سے کھا پی تو لے۔

چچا میاں: (بگڑ کر) ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے باوا جان نے اسی کھانے پینے کے چکر میں سب پھونک دیا نا! جہاں دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے اب مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

چچی امّی: (چمک کر) مکھیاں بھنبھنائیں ان کے دشمنوں کے گھر! رئیسانہ جیے۔ سانپ لوٹتا تھا لوگوں کے سینے پر جہیز میں گھر بھر گیا تمہارا۔

چچا میاں: (مصالحت کے انداز میں) وہ تو ٹھیک ہے مگر بی بی، میں کہتا ہوں آدمی کو آگے کی بھی کچھ فکر ہونی چاہیے۔ میں نے اگر یہ سب سنبھالا نہ ہوتا تو اپنا حال بھی وہی ہوتا جو ماموں صاحب کا ہوا۔ یہ سہی ہے کہ رئیسانہ جیے۔ مگر موت آئی تو گھر خالی تھا۔ عزیز رشتے دار بھی سب اچھے دنوں کے دوست ہوتے ہیں۔ سوائے ہمارے کسی نے مدد کی ان کی!

چچی امّی: (روہانسی ہو کر) تم ہی نے کون سا خزانہ لٹا دیا۔ ابّا جانی صبح ناشتے میں اک مرغ کا شوربہ پیتے تھے۔ تم نے انہیں مہمان رکھا جب بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک مرغ۔۔۔

چچا میاں: کیا مرغ مرغ لگا رکھا ہے۔ پتا ہے کتنے کا آتا ہے۔ دس روپے کا تو چوزہ ملتا ہے۔

چچی امّی: اور یہ جو اپنے یہاں پلے ہوئے تھے!

چچا میاں: تو کیا سب کٹوا دیتا۔ اری نیک بخت۔ ایک مرغ سے عارف کی ایک مہینے کی اسکول کی فیس ادا ہو جاتی تھی۔

چچی امّی: اور یہ حوصلہ نہیں ہوا کبھی کہ بچوں کو ایک آدھ بار کھلا بھی دیتے۔ لڑکپن میں عارف کی آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔

چچا میاں: تو کیا؟ چشمہ تو پڑھے لکھے ہونے کی نشانی ہے۔ تمہیں کچھ پتا بھی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین تک چشمہ لگاتے تھے اور وہ مولانا محمد میاں صاحب دیکھا ہے تم نے کیسی موٹی کمان کا چشمہ چڑھائے رہتے ہیں۔ خیر۔۔۔اب یہ قصہ بند کرواور یہ بتاؤ کہ کیا کیا انتظام کر لیے ہیں تم نے۔ دالوں کی بوریاں سی لیں۔

چچی امّی: سی لی؟ مگر اتنا اسباب جائے گا کیسے؟

چچا میاں: جائے گا کیسے نہیں؟ میں لے جاؤں گا۔ پتا بھی ہے شہر میں چھے روپے سیر بک رہی ہے۔ ایک بوری بیچ دوں تو سفر کا پورا خرچ نکل آئے۔

چچی امّی: تو کیا اب دالیں بیچو گے۔

چچا میاں: اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کچھ گھر کے لیے رکھ لیں گے۔ کچھ بیچ دیں گے۔

چچی امّی: دنیا کیا کہے گی۔ عارف کیا کہے گا؟

چچا میاں: جس کا جو جی چاہے کہے۔ میں کسی سے دبتا ہوں۔ عارف کو کھلا پلا کر میں نے جوان کیا ہے۔ شہر پہنچ کر اگر ایسا ہی ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے تو وہ جانیں۔ گیہوں کے بورے بھی تیار ہیں نا۔ اور ہاں ایک کنستر تیل۔ ایک ٹوکری کھٹائی اور دس پان سیر گڑ بھی رکھ لینا۔ بس نمک مرچ سبزی ترکاری کی محتاجی ہوگی۔ وہ خرید لیں گے۔

چچی امّی: یہ سب لے کر جاتے ہوئے اچھا لگے گا؟ لوگ کیا کہیں گے۔

چچا میاں: کہیں گے کیا؟ کوئی چوری کا مال ہے؟

چچی امّی: ہمارے ابا جان نے کبھی چھتری بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اُٹھائی۔ ایک خادم ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

چچا میاں: اور ہمارے دادا حضور تو رومال بھی اپنی جیب میں رکھنے کے روادار نہ ہوتے تھے جب چھینک آئی ایک مصاحب رومال پیش کر دیتا تھا۔ پھر؟

چچی امّی: پھر کیا؟ وضع داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

چچا میاں: بھاڑ میں گئی وضع داری زمانے کو دیکھوں کہ ان چونچلوں کو! تمہیں کچھ پتا بھی ہے۔ دلدار نگر کے تعلقہ دار کے گھر کی عورتیں اب چکن کی کڑھائی کر کے پیٹ پالتی ہیں۔

چچی امّی: خدا نہ کرے۔ اب ایسے دن تو نہیں آئے ہم پر۔

چچا میاں: تمہاری سنتا تو یہ دن بھی آ جاتے۔ آج جیب میں چار پیسے ہیں اسی لیے یہ مان دان ہے۔ کلکٹر سے ملنے جاتا ہوں تو اُٹھ کر مصافحہ کرتا ہے۔ سرکاری اسپتال کا بڑا ڈاکٹر تھرمامیٹر دھوئے بغیر اس خاکسار کے منہ میں نہیں دیتا۔ ڈپٹی مزّل صاحب جب دورے پر ادھر آتے ہیں وضو کا لوٹا اسی ڈیوڑھی سے منگواتے ہیں۔

چچی امّی: اچھا صاحب! تم جیتے میں ہاری۔ اب زبان نہ کھولوں گی جو جی چاہے کرو۔ اپنا کیا ہے، تین چوتھائی گزر گئی باقی دو چار برس تقدیر میں ہیں تو وہ بھی گزر جائیں گے۔

چچا میاں: ہاں ہاں بڑی مصیبتوں میں گزارے ہیں یہ دن تم نے۔

چچی امّی: تم تو جان کو آ گئے۔ میں نے تو سب کچھ ہمیشہ چپ چاپ جھیلا ہے۔

چچا میاں: کیا جھیلا ہے، کہو جو جی میں ہو! ذرا سنوں تو!

چچی امّی: اب مجھے کچھ نہیں کہنا (روہانسی ہو کر) اب کیا کہوں گی کہ کر بھی کیا لوں گی (رونے لگتی ہیں)

فیڈ آؤٹ

فیڈ ان۔ موسیقی۔ فیڈ آؤٹ

(فیڈ ان: باہر ٹریفک کا شور۔ دور سے آتی ہوئی لاؤڈ سپیکر پر کسی مقرر کی آواز)

مقرر: (جذباتی انداز میں) تو بھائیو اور بہنو! ہم آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اُدّیشیہ اس دیش کو آرتھک اور اڈیوگک انّتی دینا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اس دیش کے کونے کونے میں، ہر گانو میں ہر نگر میں کارکھانے اور ملیں استھاپت ہوں۔ وگیان کی جیوتی گھر گھر پہنچے۔ ہم ایک نئی پرمپرا کو پُردتساہت کریں۔ گریبی اور اندھ وشواس سے ہمیں چھٹکارا مل جائے۔ پچھم کے مہانگروں میں جو کھشحالی دکھائی دیتی ہے وہ گانو گانو میں پھیل جائے۔ ہم مل جل کر ایک نئے بھوشیہ کی اور بڑھیں۔ (مقرر کی آواز تالیوں میں ڈوب جاتی ہے)

(اسی وقت کال بیل بجتی ہے۔ اندر عارف ٹیپ ریکارڈ پر ایک گیت سن رہا ہے۔ دھیرے دھیرے باہر کی آواز ٹیپ ریکارڈ میں دب جاتی ہے۔ کال بیل پھر بجتی ہے۔۔۔)

عارف: آصف! اے آصف! ذرا دیکھو تو۔

(آصف جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور پھر ججن میاں اور آصف ساتھ ساتھ اندر آتے ہیں۔ عارف گیت سن رہا ہے۔)

ججن میاں: (کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے) بھئی واہ! میاں باہر اس زور و شور کی تقریر ہو رہی تھی اور تم یہاں بکواس سن رہے ہو۔

عارف: تقریر؟

(ٹیپ ریکارڈر کی آواز دھیمی کر دیتا ہے)

ججن میاں: ہاں میاں! کیا شعلہ بیان مقرر تھا۔ کہتا تھا ہمیں اپنی تمام بیل گاڑیوں کو ٹرکوں میں تبدیل کرنا ہے۔ یکّوں کی جگہ ملک کے کونے کونے میں ٹیکسیاں چلیں گی۔ کنوئیں کے غلیظ پانی کی جگہ سب کو نلوں کا پانی ملے گا۔

عارف: (پُر خیال انداز میں) کب تک؟ (ہنستا ہے) اور یہ سب پانے کے لیے جو کچھ کھونا پڑے گا اس کا کسی کو خیال نہیں؟

ججن میاں: میاں گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ یہ سب مل جائے تو پھر ضرورت ہی کس چیز کی رہ جائے گی؟

عارف: گاڑی بانوں کے گیت اور پنگھٹ اور پٹرول کی بو اور دھوئیں سے آزاد فضا!

ججن میاں: اے میاں ہوش کی باتیں کرو، پڑھ لکھ کر الٹی منطقیں بگھار رہے ہو۔

عارف: یہ زمانہ ہی الٹی منطق کا ہے چچا۔ الٹی ترقی۔ اُلٹے آدرش، الٹی باتیں خیر چھوڑیے اس قصے کو۔

ججن میاں: نہیں ہرگز نہیں۔ تم مجھے قائل کر دو! مان جاؤں گا!

عارف: میں بھلا آپ کو کیسے قائل کر سکتا ہوں۔

مجّن میاں: کیوں؟ قائل کیوں نہیں کرتے؟

عارف: (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) آپ عمر میں ہی نہیں ہر معاملے میں مجھ سے آگے ہیں (ٹیپ ریکاڈر بند کر دیتا ہے۔ باہر سڑک پر گزرتی ہوئی کسی موٹر کا ہارن بجتا ہے) اور شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں مجّن چچا، میں ہی غلطی پر ہوں۔

مجّن میاں: (خوش ہو کر) مان گئے نا! میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ بھائی سائنس کا زمانہ ہے، مشینوں، کارخانوں کا زمانہ ہے۔

عارف: ہاں! اور آدمی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ جی ہاں! آدمی پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔

مجّن میاں: (کھی کھی کرتے ہوئے ہنستے ہیں) پیچھے! اماں تو کیا ساری چیزیں آسمان سے ٹپکتی ہیں؟ آخر خدا نے آدمی کو جو عقل کی دولت دی ہے کیا یہ سب اس کا کرشمہ نہیں ہے؟

عارف: (ہنس کر) کرشمہ نہیں فتنہ کہیے۔

مجّن میاں: دیکھو میاں! پھر تم نے بات ہنسی میں اڑا دی۔

عارف: (سنجیدگی سے) یہی تو ستم ہوا مجّن چچا کہ آدمی نے مشینیں بنائیں اور پھر ان کا محکوم ہو گیا۔ خیر جانے دیجیے۔ اپنی کہیے۔

مجّن میاں: موٹریں تو خرید لیں۔ دو عدد۔۔۔ چالیس ہزار میں۔ بس معمولی اوور ہالنگ کی ضرورت ہے۔ اب تم لائسنس دلوا دو جلدی سے آج دلوا دو کل ہی سے چالو ہو جائیں گی۔ میرے عزیز وہی جن کے ہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں کہتے تھے کہ ڈرائیور بھی ہاتھ کے ہاتھ مل جائیں گے۔

عارف: تو آپ بھی اب ایک دم شہری آدمی بن گئے۔

مجّن میاں: میاں یہ کہو کہ آدمی بن گیا۔ میری شامت کہ اتنے دنوں بعد ہوش آیا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا ہوتا تو آج کاروبار جم چکا ہوتا۔ خیر۔۔۔ اب بھی کون سی دیر ہوئی ہے۔ میرے وہ عزیز دس برس پہلے شہر میں آئے تھے۔ موٹر میکینک بن گئے پھر ٹیکسی ڈرائیور بن گئے۔ پھر اب ٹیکسیوں کے مالک ہیں، ایک نہ دو پوری چار گاڑیاں ان کے پاس ہیں اور چھ عدد اسکوٹر رکشے ٹھاٹ ہیں۔ گانو میں تھے تو ایک گھوڑی پالنے کی حیثیت بھی نہیں تھی۔

عارف: (اکتا کر) کل صبح آپ دفتر آ جایئے۔ خانہ پُری کا کام ہو جائے پھر دیکھتے ہیں۔

مجّن میاں: (راز دارانہ لہجے میں) میاں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت آ جائے تو اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ یوں تو جانتا ہوں کہ تمہارے رہتے ہوئے اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ ماشاء اللہ تمہارے تعلقات افسروں سے ہیں مگر تم جانو! پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ پھر تنخواہ دار ملازم۔ گنی بوٹی نپا شوربہ۔ کوئی کچھ مانگ ہی بیٹھے تو پیچھے مت ہٹنا۔ خدا کا دیا ہوا اپنی جھولی میں جو کچھ بھی ہے کس دن کام آئے گا۔

عارف: (اکتا کر) ٹھیک ہے آپ چائے پییں گے۔

مجّن میاں: چائے۔ خیر چائے ہی پی لیں گے! اور لائسنس مل جائے تو پھر ایک شاندار دعوت کیا کہتے ہیں ڈنر۔۔۔ لاؤ ہاتھ (ہنستے ہیں)

عارف: (بیچارگی کے انداز میں) ٹھیک ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ (آصف سے) آصف! چائے بناؤ!

مجّن میاں: دیکھو بھائی! یہ غلط ہے خود چائے بنانی ہے تو پھر نیچے دکان سے کوکا کولا منگوا لو یہ تم کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے۔

عارف: (ہنس کر) ملازم! آپ کو پتا بھی ہے ایک ملازم رکھنے پر کیا خرچ اُٹھے گا؟

مجّن میاں: (سوچتے ہوئے) ہوں ں ں ں۔ یہ بات تو ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے پارٹنر بن جاؤ۔ ایک موٹر اور خرید لیتے ہیں۔ حساب کتاب میں دیکھوں گا۔ دفتر کچہری تمہارے ذمے۔ میرے عزیز کہتے ہیں اس کاروبار میں یہ چکر بہت ہوتا ہے۔

عارف: میں اس لائق کب ہوں مجّن چچا۔ یہ ملازمت ہی بہت ہے (آصف سے) آصف! مجّن چچا کے لیے ڈرنک لے آؤ!

آصف: جی اچھا! (آصف جاتا ہے)

مجّن میاں: اور بھائی صاحب اور بھابھی صاحبہ کب آ رہے ہیں؟ کون سا دن بتایا تھا تم نے؟

عارف: جمعہ کی صبح کو۔

مجّن میاں: یعنی کہ پرسوں نہیں ترسوں!

عارف: ہاں!

مجّن میاں: بھئی واہ۔ کل لائسنس مل جائے تو مزا آ جائے۔ اپنی ٹیکسیاں لے کر اسٹیشن چلیں گے۔

عارف: آپ اس کی فکر نہ کیجیے وہ انتظام ہو جائے گا۔

مجّن میاں: (کھسیا کر) وہ تو ہو ہی جائے گا۔ مگر میں تو چاہتا ہوں اسی روز ہماری ٹیکسیوں کا افتتاح ہو جائے۔

(آصف کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آتا ہے۔ مجّن میاں کو دیتا ہے)

مجّن میاں: صرف میرے لیے؟

عارف: ہم لوگ ابھی ابھی چائے پی چکے ہیں۔

مجّن میاں: (ہنس کر) خیر، کوئی بات نہیں! میں تو سمجھا کہ تم بھی بھائی صاحب کی طرح ذرا اقتصادی آدمی ہو!

عارف: اقتصادی آدمی؟

مجّن میاں: میرا مطلب ہے کفایت شعار۔ (ہنس کر) ارے بھائی۔ تنخواہ دار آدمی کو ہونا ہی پڑتا ہے۔ مہنگائی بھی تو غضب کی ہے۔ مکھن کی سو گرام کی ٹکیہ چار روپے کی۔ خدا کی پناہ (پھر ہنستے ہیں) مگر مکھن بازی کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ میاں اب تو نوکری میں بھی ترقی چاہیے ہو تو مکھن بازی کرنی پڑے گی۔

عارف: (بیزاری سے) معاف کیجیے گا جمّن چچا۔ میں آج بہت تھکا ہوا ہوں۔

جمّن میاں: ارے بھائی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟ خیر! میں چلتا ہوں ۔(اٹھتے ہیں) کل صبح ٹھیک دس بجے تمہارے دفتر میں حاضری دوں گا۔(جاتے ہیں)

عارف: (خودکلامی کے انداز میں) الّو کے پٹھے!

آصف: آپ نے کچھ کہا بھائی جان!

عارف: (چونک کر) نن نہیں! تم جاؤ اپنا کام کرو۔(آصف چلا جاتا ہے)

عارف: (اپنے آپ سے) یہ کیسا تماشہ ہے۔لوگ بدل جاتے ہیں یا بدلتے نہیں بس بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ یہ دوہری زندگی گزار رہے تھے؟ یا یہ کہ ان کا سفر ہمیشہ ایک ہی سمت میں ہوتا ہے۔آگے۔۔۔اور آگے۔۔۔اور آگے۔ پرندے شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں مگر یہ لوگ۔۔۔ ہر صبح کے ساتھ اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ واپسی کا خیال بھی ختم ہو جاتا ہے۔اس شہر میں کتنی سڑکیں ہیں، اور کتنے چوراہے۔۔۔ اور ہر چوراہے سے نکلنے والی سڑک ایک دوسرے چوراہے میں گم ہو جاتی ہے۔ یہ کیسا جال ہے۔ایک سلسلہ۔۔۔سازش۔۔۔راستوں کی سازش۔۔۔پورب، پچھّم، اتّر، دکھّن۔۔۔ اب کوئی سڑک اُن بستیوں کی طرف نہیں جاتی جہاں یکّے چلتے ہیں اور دُھول اڑتی ہے اور جہاں کوئلیں کوکتی ہیں۔ وہ ساری کچی سڑکیں دھیرے دھیرے شہر کے راستوں میں گم ہوتی جاتی ہیں۔۔۔۔

(ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتا ہے۔ بھجن کی دُھن اور بول رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں)

کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
جگ سے ناتا ٹوٹل ہو
کون ٹھگوا۔۔۔

فیڈ آؤٹ

منظر بدلتا ہے

(اسٹیشن کا شور۔ گاڑی آتی ہے۔شور)

(اسی شور کے پس منظر میں)

چچا میاں: بھئی واہ! جمّن میاں بھی یہیں ہیں!

جمّن میاں: جناب! عارف میاں کی کوششوں سے لائسنس مل گیا۔

چچا میاں: لائسنس؟

جمّن میاں: جی جناب۔ دو ٹیکسیوں کا۔ یہ خاکسار خدمت کے لیے حاضر ہے۔ آپ کو اپنی ہی گاڑی پر گھر لے چلیں گے۔

عارف: آپ لوگوں کا سفر تو اچھا رہا؟

چچا میاں: ہاں بیٹے! بس تمہاری چچی ذرا نڈھال ہوگئیں۔ سفر لمبا تھا! مگر لمبا بھی کتنا ایک رات!

عارف: آپ تو لگتا ہے پورا گھر یہاں اُٹھا لائے۔

چچا میاں: بھائی گھر کی چیزیں تھیں ہم نے سوچا لیتے چلیں۔

عارف: اور وہ کبوتروں کی جوڑی؟

چچا میاں: اوہ! ہاں پہلے تو سوچا تھا مگر پھر خیال آیا کہ اُلجھن رہے گی ۔ظہیر میاں کے سپرد کر آیا۔

جمّن میاں: اچھا ہی کیا آپ نے! یہاں کبوتروں کا کیا ذکر، آدمی کے لیے جگہ مشکل سے ملتی ہے۔دو کمروں کا فلیٹ ہے عارف میاں کا۔

چچا میاں: میاں اب آ گئے ہیں تو سب جھیل جائیں گے۔رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی۔ یہ اچھا ہے کہ تم بھی ہو۔شام کو شطرنج بچھے گی۔

جمّن میاں: (ہنس کر) اب خلیل خاں کے فاختہ اڑانے کا زمانہ گزر گیا بھائی صاحب! جب سے آیا ہوں لگتا ہے مرنے کی بھی فرصت مشکل ہی سے ملے گی۔ ایسی بھاگم بھاگ ہے کہ کیا بتاؤں؟ مگر سچ پوچھیے تو یہی زندگی ہے۔

عارف: (اکتا کر) اب آگے بڑھیں۔گھر چل کر باتیں ہوں گی۔(پکارتے ہوئے) قلی! او قلی!

چچا میاں: عارف میاں کچھ ہم بھی اُٹھا لیتے ہیں۔

عارف: پھر بھی! کم سے کم تین قلیوں کی ضرورت پڑے گی۔

چچا میاں: آج تمہاری چھٹی ہے؟

عارف: جی نہیں! پہلے تو سوچا تھا آصف کو بھیج دوں۔مگر اچانک اسے ایک مصروفیت نکل آئی۔ میں نے آج چھٹی لے لی۔(قلی سے) قلی! تم۔تم یہ گٹھر اٹھاؤ! آئیے

چچا میاں: دیکھو! کچھ چھوٹ تو نہیں گیا!

جمّن میاں: ہاں میاں! اچھی طرح گن لو۔۔۔ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے، چھے عدد تو قلیوں کے ساتھ ہیں۔ یہ سامان ایک ایک دو دو ہم اٹھا لیتے ہیں۔۔۔ چلو!

(اسٹیشن کا شور غالب آجاتا ہے)

فیڈ آؤٹ

موسیقی

(منظر بدلتا ہے)

چچا میاں: (کھانستے ہوئے) ارے بھئی سنتی ہو! ارے بھائی میں نے کہا۔سنتی ہو۔

چچی امّی: (دور سے) آ رہی ہوں، آ رہی ہوں۔(بڑبڑاتے ہوئے قریب آتی ہیں) تمہاری تو عادت ہے گلا پھاڑنے کی۔دو بالشت کا گھر۔ یہاں اس کی ضرورت کیا ہے؟ کیا ہے؟ کس واسطے چیخ رہے تھے؟

چچا میاں: ٹھیک سے بیٹھو تو کہوں! (بیٹھ جاتی ہیں)

چچامیاں: ہفتہ بھر ہو گیا آئے ہوئے۔

چچی امّی: مجھے معلوم ہے پھر؟

چچامیاں: پُر رونق شہر ہے۔

چچی امّی: (اسی انداز میں) وہ تو دیکھ رہی ہوں، پھر؟

چچامیاں: عارف نے گھر بھی اچھی جگہ لیا ہے۔ رات گئے تک چوراہا آباد رہتا ہے۔ وہاں کتنا سنّاٹا تھا۔ سرِ شام ہی بستی پر مردنی چھا جاتی تھی۔

چچی امّی: (کچھ سوچ کر) مگر مجھے تو یہاں ہول اٹھتا ہے۔ جی الجھتا ہے۔

چچامیاں: اصل میں گھر چھوٹا ہے ذرا۔

چچی امّی: تو بدل لو!

چچامیاں: بدل لوں، مگر کیسے؟ عارف کی تنخواہ۔

چچی امّی: عارف کی تنخواہ ہی پر بھروسا کیوں ہے۔ خدا کا دیا ہوا۔۔۔

چچامیاں: (بات کاٹ کر) اگر اسے ابھی سے اُڑانا شروع کر دیا تو کتنے دن کام چلے گا۔

چچی امّی: پھر چپ بیٹھو۔

چچامیاں: (پرخیال انداز میں) ہوں ں ں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔

چچی امّی: کیا؟

چچامیاں: یہ کہ کیوں نہ کوئی کام سنبھال لوں۔

چچی امّی: تمھیں یہاں کون سی نوکری مل جائے گی۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چچامیاں: ضرورت۔ ضرورت کیوں نہیں۔ تو کیا عمر بھر اس گھروندے میں بند رہیں۔ ذرا دیکھو۔ چاروں طرف کیسی کیسی شاندار عمارتیں ہیں۔ ابھی کل ہی میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا۔ آصف کو لے کر۔ یہاں سے کوئی چار پانچ میل کے فاصلے پر جارج ٹاؤن نامی بستی میں رہتے ہیں۔ اپنی کوٹھی بنوالی ہے۔ ارے وہی مجیب میاں مرادآباد والے

چچی امّی: پھر؟

چچامیاں: پھر کیا؟ وہ مراد آبادی برتن اور بھانت بھانت کی فینسی چیزیں ولایت بھیجتے ہیں ہزاروں کی یافت ہے۔ دسیوں تو ان کے کارندے ہیں۔ خدا نے بڑی برکت دی۔

چچی امّی: پھر؟

چچامیاں: افوہ! تم تو بس پھر پھر لگائے ہوئے ہو۔ میں سوچتا ہوں میں بھی یہی کام شروع کر دوں۔ ایکسپورٹ لائسنس لینا ہوگا۔

چچی امّی: ایکسپورٹ۔۔۔ کیا کہا؟ کیا لینا ہوگا؟

چچامیاں: سرکاری اجازت نامہ سمجھو، میں نے ساری معلومات جمع کر لی ہیں۔

(کال بیل بجتی ہے)

چچامیاں: یہ ناوقت کون آمرا۔ آصف ابھی تک آیا نہیں۔ عارف کیا کر رہا ہے؟

چچی امّی: دوسرے کمرے میں لیٹا ہے۔ عارف۔ او عارف! دیکھو تو بیٹا کوئی ہے؟

(عارف دروازہ کھولتا ہے۔ جگّن میاں آئے ہیں)

عارف: (باہر سے) جگّن چچا ہیں۔

چچامیاں: تم ہٹ جاؤ۔۔۔ جگّن میاں آئے ہیں۔

(چچی امّی وسرے کمرے میں جاتی ہیں)۔

چچامیاں: آؤ آؤ بھائی جگّن میاں۔ خوب آئے۔

جگّن میاں: آداب عرض بھائی صاحب!

چچامیاں: آداب عرض۔۔۔ تسلیمات۔۔۔ آؤ آؤ!

(جگّن میاں بیٹھ جاتے ہیں)

چچامیاں: عارف! بیٹے تم بھی بیٹھو، ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

عارف: جی اچھا۔۔۔ (بیٹھ جاتا ہے)

چچامیاں: (رازدرانہ انداز میں) کل میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا نا آصف کے ساتھ۔

عارف: جی!

چچامیاں: ماشاء اللہ کیا شاندار کاروبار جمایا ہے محل ہے محل۔ بڑے بیٹے کو امریکہ بھیج دیا ہے۔

عارف: جی!

جگّن میاں: امریکہ۔۔۔ بہت خوب۔ صاحب۔ امریکہ کی بھی کیا بات ہے۔ فسٹ نمبر ہے اس ملک کا۔

چچامیاں: سوچتا ہوں آصف کو بھی بھیج دوں۔ کیوں عارف!

عارف: بہت اچھا ہے مگر ابھی اس کا جانا۔۔۔ دو سال بعد ہی ٹھیک ہوگا۔

چچامیاں: دو سال کیوں؟

عارف: ایم اے کا کورس پورا ہونے میں دو سال لگیں گے۔

چچامیاں: ارے میاں کیا رکھا ہے ایم۔ اے میں۔ کتنا کمالے گا ایم۔ اے کر کے۔

جگّن میاں: ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب! کیا رکھا ہے ایم۔ اے میں۔

عارف: میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

چچامیاں: وہی تو سمجھا رہا ہوں میاں! وہ مجیب میاں مراد آبادی برتنوں کا ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ سمجھ لو عیش کرتے ہیں۔ بڑے بیٹے کو بھی اسی کاروبار میں لگا لیا ہے۔ پہلے تو بس وہ سال دو سال پر وہاں جاتا تھا اور اپنے سامان کا آرڈر لاتا تھا۔ اب وہیں بس گیا ہے۔ وہاں دکان کھول لی ہے۔

عارف: تو آصف کیا کریں گے وہاں۔

چچامیاں: ارے میاں کوئی ابھی تھوڑے ہی بھیجے دے رہا ہوں۔ ابھی تو پہلے یہاں کاروبار جمانا ہے۔ پھر خدا نے چاہا تو وہ دن بھی آجائے گا۔

منجن میاں: (جلدی سے) جب ہمارے آصف میاں امریکہ جابسیں۔

چچامیاں: انشاءاللہ العزیز۔

منجن میاں: اور سچ پوچھیے تو آپ کی حیثیت بھی۔

چچامیاں: (جلدی سے) بھائی منجن میاں حیثیت تو بنانے سے بنتی ہے۔ مانا کہ مجیب میاں گھر کے کھاتے پیتے آسودہ حال تھے مگر اب تو دولت کی ریل پیل ہے۔ دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جب وہ کر سکتے ہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

منجن میاں: انشاءاللہ، انشاءاللہ۔

چچامیاں: تو بیٹے عارف!

عارف: جی!

چچامیاں: ایکسپورٹ لائسنس کی جگاڑ کرو۔

منجن میاں: ارے بھائی صاحب! یہ تو عارف میاں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ماشاء اللہ سے وسیع تعلقات، پھر ذہانت، فطانت، متانت بس ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

چچامیاں: میں نے سب معلومات یکجا کر لی ہیں۔ (رازدرانہ انداز میں) مجیب میاں کا ایک پرانا کارندہ بھی واقف کار نکلا۔ واقف کار کیا سمجھو کہ لنگوٹیا یار جس کے باپ میں اور میرے تایا مرحوم میں بڑا یارانہ تھا۔ تایا مرحوم کے گھر جب بھی جاتے میں اور وہ خوب دھوم مچاتے۔ پاس پاس حویلیاں تھیں اور وہ بن کے رہ گیا غریب۔ باپ نے ساری دولت جائداد ناعاقبت اندیشی میں اڑا دی۔ وہ تو کہو کہ دو حرف پڑھ لیے تھے جو آج کارندہ بھی بن گیا ہے۔

منجن میاں: (آہ بھر کر) ہاں بھائی صاحب۔ دنیا بڑی بے اعتبار جگہ ہے۔

چچامیاں: تو پھر عارف میاں! تم کل ہی سے بھاگ دوڑ شروع کر دو۔ خدا نے چاہا تو اپنے آصف میاں بھی ایک روز امریکہ پہنچ جائیں گے۔

منجن میاں: ان سے ایک مسالہ پیسنے کی مشین منگوانی ہے مجھے۔ صاحب امریکیوں کا جواب نہیں! کیا چیزیں بناتے ہیں۔ آصف میاں سے کہوں گا کہ۔۔۔

چچامیاں: (جلدی سے) ارے بھائی پہلے وقت تو آنے دو۔ سب کچھ منگوا لینا۔ ٹرین زسٹر، ریڈیو گرام۔ مجیب میاں کے ہاں کیا کیا عجائبات جمع ہیں۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں۔

منجن میاں: جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔ کیا بات کہی ہے شاعر نے موقع کی!

چچامیاں: ارے صاحب! (پرجوش انداز میں) اسی لیے تو آج رشیا بھی امریکہ کو مانتا ہے۔ ویسے رشیا بھی آگے جا چکا ہے۔ اپنی کتیا تک چاند پر بھیج رہا ہے دونوں میں خوب لاگ ڈاٹ رہتی ہے۔ کیوں بیٹے۔۔۔ ہے نا؟

عارف: جی! (رک کر) تو میں چائے بنوادوں آپ دونوں کے لیے۔

چچامیاں: ارے میاں بیٹھو تو دو گھڑی۔ میں چاہتا ہوں بات آج طے ہو جائے۔

منجن میاں: طے کیا کرنا بھائی صاحب! پیسہ ہاتھ میں اور دماغ ذرا چلتا ہو تو کاروبار جمنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھی کو دیکھئے۔

چچامیاں: تمہیں کتنی یافت ہو جاتی ہے روزانہ۔

منجن میاں: کم سے کم ڈیڑھ سو۔

چچامیاں: گویا کہ ڈیڑھ سو کو تیس سے ضرب دو تو۔۔۔ کتنا ہوا، کتنا ہوا ساڑھے چار ہزار؟

منجن میاں: (اترا کر) جناب!

چچامیاں: (مرعوب ہو کر) کمال ہے بھئی۔ ساڑھے چار ہزار۔ تو کیوں نہ میں ٹیکسیوں ہی کا کاروبار جما لوں۔

منجن میاں: ہاں ہاں کیوں نہیں؟ اور چاہیں تو کسی چلتی ہوئی چیز کی ایجنسی لے لیں۔

چچامیاں: اجنسی۔ یہ کیا چیز ہے؟

منجن میاں: مگر اس میں پہلے دکان کے لیے جگہ کا چکر ہوگا۔

چچامیاں: جگہ تو مل ہی سکتی ہے۔ مگر یہ اجنسی کیا بلا ہے؟

منجن میاں: یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے کارخانے ہیں۔ چیزیں تیار کرتے ہیں۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ، پلاسٹک کی چیزیں۔۔۔ یا جیسے بلب، پنکھے، ریڈیو۔۔۔ ہزاروں چیزیں ہیں۔

چچامیاں: ہاں ہاں! سمجھ رہا ہوں۔ پھر؟

عارف: (اکتا کر) میں چائے بنوادوں۔

چچامیاں: ہاں ہاں! جاؤ! جب تک میں منجن میاں کی بات سنتا ہوں۔ ہاں تو جیسے بلب، ریڈیو، پنکھے ہزاروں یعنی کہ ہزاروں چیزیں ہیں۔

(عارف اٹھتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے)

چچامیاں: اور بیٹے! ذرا چار مینار سگریٹ کی ایک ڈبیا بھی منگوا دو۔

عارف: (باہر سے) جی اچھا!

(پس منظر سے ٹریفک کا شور ابھرتا ہے۔ اس شور کے ساتھ لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے)

وقفہ

فیڈ ان:

چچی امّی: بیٹے آصف!

آصف: جی چچی امّی!

چچی امّی: یہ عارف دفتر سے لوٹ کر کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ پہلے شام کو کھلی ہوا میں چھت پر بیٹھتا تھا۔ اب جب دیکھو کمرے میں۔

آصف: تو کیا بلا دیں انہیں۔

چچی امّی: نہیں۔ آرام کرنے دو۔ مگر آخر بات کیا ہے بیٹے!

آصف: یہاں کھلی چھت تو ہے نہیں!

چچی امّی: پھر کہیں باہر ہی ہو آیا کرے۔ گھڑی دو گھڑی دوستوں سے ہنس بول

لے۔ میں نے اسے کسی کے ہاں آتے جاتے کبھی نہیں دیکھا۔
آصف: (متانت سے) بھائی جان بس اپنے ساتھ رہتے ہیں اور ٹھیک ہی رہتے ہیں۔
چچی امّی: ایں!
آصف: جی کچھ نہیں!
چچی امّی: کمرے میں بند کیا کرتا رہتا ہے۔
آصف: گیت سنتے رہتے ہیں۔
چچی امّی: یہ نیا شوق لگا ہے اسے۔ گانو میں تو یہ شوق نہیں تھا۔
آصف: وہاں پرندے تھے۔ (دھیرے سے) اور خاموشی!
چچی امّی: ایں؟ کیا کہا؟
آصف: تھک جاتے ہیں دن بھر۔ بھائی جان کا مزاج ہی کچھ دوسرا ہے۔
چچی امّی: میں تو سمجھتی ہوں اس کا جی یہاں لگتا نہیں۔ چپ چاپ تھا۔ تمہارے باوا اب کاروبار کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ جّن میاں اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ عجب افراتفری ہے۔ سب پیسے کے غلام۔ یا اللہ یہ کیسا دیس ہے۔
(کال بیل بجتی ہے)
آصف: (چلا کر) آیا! حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)
(دروازہ کھلتا ہے۔ چچا میاں اندر آتے ہیں)
چچا میاں: (ہانپتے ہوئے) آج تو جان ہی لے لی اس چکر نے (بیٹھ کر کھانستے ہیں) ذرا پانی لاؤ بیٹے۔
آصف: جی اچھا! (جاتا ہے۔ پھر آتا ہے)
چچی امّی: کچھ کھالو پھر پانی پیو!
چچا میاں: نہیں! بھوک قطعاً نہیں۔ دن میں وہیں دفتر کے سامنے ایک اسٹال پر وہ کیا کہتے ہیں دو چھولے بھٹورے کھا لیے تھے۔ مزے کی چیز تھی (ہانپتے ہوئے) خیر خدا کا شکر ہے کام آدھا تو ہو گیا۔
چچی امّی: مگر ایسا بھی کیا کام کہ آدمی ہلکان ہو جائے۔
چچا میاں: (غٹ غٹ پانی پیتے ہیں) ارے دیکھ لینا خدا نے چاہا تو سال دو سال میں کاروبار چمک اُٹھے گا، میں تو کہتا ہوں بس ذرا چل نکلے تو آصف کو امریکہ بھیجتا ہوں۔ ایک چکّر تو لگا ہی آئے اور کاروبار کا تو یہ ہے کہ اشرف صاحب، وہی جن کے یہاں مجیب میاں کا سمدھیانا ہے، کسی زمانے میں بندر پکڑوا کر ولایت بھیجا کرتے تھے۔ خدا نے اُسی میں برکت دے دی۔ اب اچھا خاصا چڑیا گھر جما لیا ہے۔ سانپ، بچھو، مینڈک، بندر، چوہے، خرگوش، مچھلیاں قسم قسم کے جانور بیچتے ہیں۔
چچی امّی: سانپ، بچھو، بندر، چوہے، مینڈک یہ خریدتا کون ہے۔
چچا میاں: تم کیا جانو۔ بڑے بڑے اعلا کالجوں بلکہ یونیورسٹیوں میں ان کی کھپت ہے۔ طلبہ طالبات ان پر عجب تجربات کرتے ہیں۔ چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ جبھی تو ڈاکٹر بنتے ہیں۔ کیوں آصف!

آصف: جی!
چچا میاں: میں نے مرادآبادی برتنوں کا ارادہ چھوڑ دیا۔ سوچتا ہوں کپڑے سلوا کر باہر بھجواؤں۔
چچی امّی: کس کے کپڑے؟
چچا میاں: لوگوں کے پہننے کے لیے! تم کیا جانو؟ گارمنٹس ایکسپورٹ کا بہت چلن ہے ان دنوں! کوئی درجن بھر درزی تو اپنی ہی طرف کے یہاں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سب پتا کر لیا ہے۔
چچی امّی: یہ دن بھر جو مارے پھرتے رہتے ہیں تو کیا۔۔۔
چچا میاں: (جھنجھلا کر جلدی سے) تم اسے مارا مارا پھرنا کہتی ہو۔ مجھے لائسنس بھی مل گیا۔ اب دیکھنا بس دو چار دنوں میں۔۔۔ کیوں آصف!
آصف: جی!
چچا میاں: عارف میاں ہیں کہاں؟ دفتر سے تو آ گئے ہوں گے۔
آصف: کمرے میں ہیں۔ بلا لاؤں!
چچا میاں: ہاں ہاں بلاؤ! ذرا ان سے مشورہ تو کروں۔
(آصف جاتا ہے، پھر آتا ہے)
چچی امّی: کیوں کیا ہوا؟
آصف: بھائی جان شاید کہیں چلے گئے ہیں۔ آس پاس کہیں چلے گئے ہوں گے کسی ضرورت سے۔
چچی امّی: کب نکل گیا چپکے سے؟ خبر بھی نہیں ہوئی۔
آصف: میں نے کچھ آہٹ تو سُنی تھی۔ مگر دھیان نہیں دیا۔
چچا میاں: چلے گئے ہوں گے کہیں گھومنے پھرنے۔ اچھا ہے۔ آ جائیں گے ابھی۔ بچے تھوڑی ہیں۔
(کال بیل بجتی ہے۔ آصف دروازہ کھولتا ہے ملے جلے قدموں کی آوازیں قریب آتی ہوئی)
آصف: (باہر سے) جّن چچا ہیں۔
چچا میاں: بھئی واہ، خوب آئے۔ بیگم تم اندر جاؤ۔ (چچی امّی اندر جاتی ہیں) آؤ بھئی جّن میاں آؤ۔ موقعے سے آئے۔
جّن میاں: آداب عرض بھائی صاحب!
چچا میاں: آداب، کتنے دنوں بعد صورت دکھائی۔
جّن میاں: کیا کہوں بھائی صاحب! فرصت ہی نہیں ملتی! کئی منصوبے ہیں۔ انہی کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ پھر فاصلے۔
چچا میاں: تمہارا گھر بھلا کتنی دور ہو گا یہاں سے۔
جّن میاں: کم سے کم دس میل۔ خدا کا شکر ہے گھر اچھا مل گیا۔
چچا میاں: خدا کا شکر ہے۔
جّن میاں: سوچا دو چار کرسیاں پلنگ ڈال لوں۔ گھر گرہستی کے انتظام میں کوئی

اور تو ہاتھ بٹانے والا ہے نہیں۔

چچا میاں: ہو جائے گا، سب ہو جائے گا (آصف سے) بیٹے آصف! ذرا چائے بنوا دو!

آصف: جی اچھا! (جاتا ہے)

چچا میاں: بھائی میں نے ایک اور بات سوچی ہے۔ وہ مراد آبادی برتنوں کا کام بعد میں سوچیں گے۔

ججن میاں: پھر؟

چچا میاں: سوچتا ہوں گارمنٹس ایکسپورٹ۔

ججن میاں: (جلدی سے) بہت خوب۔ بہت خوب۔ کیا بات آئی ہے ذہن میں۔ اس میں بڑی برکت ہے۔

چچا میاں: ہاں بھائی۔۔۔ بڑی برکت ہے۔ خدا نے چاہا تو چل نکلے گا۔

ججن میاں: میرے پڑوس میں ماتھر صاحب رہتے ہیں۔ اتفاق سے یہی کاروبار ہے ان کا۔ اپنا کارخانہ ہے۔ کم سے کم بیس تو کاریگر ہیں۔

چچا میاں: بیس عدد۔ یہ تو کچھ بھی نہ ہوئے۔ میاں میں تو آج ایک ایسا کارخانہ دیکھ کر آیا جہاں کم سے کم سو کاریگر رہے ہوں گے۔

ججن میاں: سو کاریگر؟

چچا میاں: ہاں! سو کاریگر! یقین مانو! بخدا!

ججن میاں: کمال ہے!

چچا میاں: تو سوچ رہا ہوں کہ یہ کام ٹھیک رہے گا۔ چل نکلا تو آصف کو۔۔۔

ججن میاں: (جلدی سے) امریکہ! ہاں صاحب! امریکہ کی کیا بات ہے!

چچا میاں: اصل میں محنت کی جائے تو ہر جگہ کامیابی ہے۔ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ خدا کے فضل سے اتنا تو ہے ہی۔ سوچتا ہوں وہ آموں والا باغ جو گھر کے پاس ہے اسے بھی فروخت کر آؤں۔

ججن میاں: بیچ دیجیے۔ کیا رکھا ہے اس میں؟

چچا میاں: خیر یہ تو نہ کہو۔ ایک سے ایک لاجواب پھل ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہاں کہاں سے قلمیں منگوائی تھیں؟ دربھنگہ، ملیح آبادی، شاہ آباد، کلکتہ، پورا ملک چھان مارا تھا۔ ہر فصل میں کیا بہار آتی تھی۔

ججن میاں: وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ اس سے یافت کیا ہوتی تھی۔

چچا میاں: یہ تو ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار۔ اصل میں ہماری طرف ریلوے اسٹیشن بن گیا ہوتا تو بات بنتی۔ ریل گاڑی پر آم ڈھونا حماقت ہے۔

ججن میاں: وقت بہت لگتا ہے صاحب! اور یہ زمانہ!

چچا میاں: اور نہیں تو کیا۔ میرے وہ ماموں زاد بھائی ہیں نا، سخاوت میاں۔ ان کا سکھ پور والا باغ بس اڈے سے قریب تھا۔ خوب آمد و رفت ہوتی تھی۔ پھل ہمارے باغ سے کچھ کم ہی ہوتے تھے مگر یافت، ہم سے پانچ گنا۔ گھر بھر لیا۔ دو دو ٹریکٹر خرید لیے۔ چار چار ٹیوب ویل لگوا لیے۔ کوٹھی کھڑی کر لی۔ حد تو یہ ہے کہ موٹر بھی خرید لی مگر اسی دکھاوے کے چکّر میں خرچ بھی کیا بے حساب۔۔۔

ججن میاں: تو آپ کب شروع کر رہے ہیں۔

(آصف چائے لے کر آتا ہے)

چچا میاں: لاؤ بیٹے! ججن میاں یہ لو۔ چائے پیو بھئی اور آصف بیٹے تم بھی بیٹھو! ذرا مشورہ کر لیا جائے معاملہ اچھا ہوا کہ ججن میاں بھی آ گئے۔ ان کا دماغ خوب چلتا ہے مشوروں میں۔

ججن میاں: (ہنس کر) مگر آپ سے کم بھائی صاحب۔ خدا کی قسم۔ جائے استاد خالی است۔

چچا میاں: بھائی کہاں کی استادی۔ کچھ چل نکلے کام تو بات بھی ہے۔ خیر۔۔۔ تو۔۔۔ (دور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز۔ اچانک رکتے ہوئے)

چچا میاں: کیا وقت ہوا ہے۔ ذرا دیکھو تو گھڑی۔

آصف: نو بجے ہیں۔ نو بج کر پانچ منٹ۔

چچا میاں: ایں؟ نو بج کر پانچ منٹ! اور عارف میاں اب تک لاپتا ہیں۔

ججن میاں: کہاں گئے ہیں آخر؟

چچا میاں: نہ جانے۔ آصف! بیٹے ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھو تو۔۔۔ چوراہے پر کہیں کھڑے تو نہیں ہیں۔

آصف: (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے۔ ٹریفک کا دبا دبا سا شور سنائی دیتا ہے) بھائی جان کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں؟

چچا میاں: کسی سڑک پر نہیں؟ دیکھو شاید کسی طرف سے آ رہے ہوں۔

آصف: (ذرا رک کر) نن نہیں! جی نہیں! نہیں دکھائی دیتے۔

ججن میاں: کمال ہے؟ کہاں رہ گئے۔

چچا میاں: ہاں! عجیب بات ہے۔ کہاں تو ہر وقت کمرے میں گھسے رہتے تھے کہاں آدھی رات تک غائب۔

ججن میاں: نو بج کر دس منٹ ہونے کو ہیں۔

چچا میاں: آصف! ذرا اندر دیکھو۔ پوچھو تو۔

آصف: جی اچھا!

(باہر نکل جاتا ہے۔ وقفہ۔ واپس آتا ہے)

چچا میاں: کیوں کچھ پتا چلا؟

آصف: بھائی جان آ گئے۔۔۔ اندر ہیں۔

چچا میاں: کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟

آصف: نہا رہے ہیں۔۔۔

چچا میاں: نہا رہے ہیں۔ اس وقت؟

آصف: جی، دیر سے نہا رہے ہیں۔ چچی امّی کہتی ہیں بہت دیر سے نہا رہے ہیں۔

(حزمیہ موسیقی کی ایک لہر۔۔۔ ابھرتی ہے پھر بہت دھیرے دھیرے ڈوب جاتی ہے)

''سبیلِ کرم''

حمدِ باری تعالیٰ

پھیلی ہے ہرسو اک صدا توُ لاشریک و لامکاں
تیرا کرم ہے جابجا توُ لاشریک و لامکاں

میرے سجودِ شوق کا , مجھ کو معافی دے صلہ
فضل و کرم کر اے خدا توُ لاشریک و لامکاں

ستّار بھی غفّار بھی بندوں کا ہے مختار بھی
واحد توُ ہی حاجت رَوا توُ لاشریک و لامکاں

سب ذکر کرتے ہیں ترا ,شام وسحر ,قلب ونظر
کہتی رہوں میں یہ سدا توُ لاشریک و لامکاں

رہتا ہے ہرسو ہر جگہ ,شہ رگ سے بھی نزدیک تر
ہر شے میں تیری ہی ادا توُ لاشریک و لامکاں

دریائے رحمت ہے رواں عرشِ بریں سے فرش تک
مخلوق سب تیری گدا توُ لاشریک و لامکاں

میں بھی سبیلہؔ ایک دن حج کی سعادت پاؤں گی
لبّیک کی ہوگی صدا توُ لاشریک و لامکاں

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

نعتِ رسول ﷺ

جتنے بھی دُکھ ملیں ہمیں اغیار کے سبب
سب کا ازالہ ہوتا ہے سرکار ﷺ کے سبب

دُنیا میں جس جگہ بھی، جہاں بھی ہے روشنی
لاریب، ہے وُہ آپ ﷺ کے انوار کے سبب

انگشتری میں جیسے نگینہ جَڑا ہوا !
طیبہ کی شان روضۂ سرکار کے سبب

نوعِ بشر پہ سِرِّ جہاں جس قدر کھُلے
سرکار ﷺ ہی کے دیدۂ بیدار کے سبب

طیبہ میں ہے سبیل کرم کی لگی ہوئی !
دَر کے سبب کہیں، کہیں دیوار کے سبب

جو بھی ملی ہیں اُمّتِ مسلم کو عظمتیں
میرے نبی ﷺ کی سیرت و کردار کے سبب!

انصافِ بے مثال کی قائم ہوئی مثال
اِک کھُردری چٹائی پہ دربار کے سبب

کوئی عجب نہیں کہ نسیمِ سحؔر مری
بخشش ہو اپنے نعتیہ اشعار کے سبب

نسیمِ سحر
(راولپنڈی)

لنگی

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

شعبہ میں نئی لڑکی کا داخلہ ہوتا تو ابو پٹّی لنگی پہنتا۔اس کے پاس رنگ برنگ کی لنگیاں تھیں۔لال پیلی نیلی ہری.....ایک نہیں تھی تو سفید۔

سفید لنگی سے ابو پٹّی کو چڑ سی تھی۔پہنی بھی نہیں کہ میلی نظر آتی ہے۔بھلا یہ بھی کوئی رنگ ہے کہ داغوں کو چھپا نہیں پاتا ہے۔اس اعتبار سے اس کو سیاہ لنگی پسند تھی کہ گرد خور تھی۔لیکن ایک جیوتشی نے کہا تھا کہ سیاہ شنی کا رنگ ہے جو نا امیدی کا ستارہ ہے اور ابو پٹّی نے بھی محسوس کیا تھا کہ سیاہ رنگ کے استعمال سے اس کو اکثر خسارہ ہوا ہے۔اس دن اس نے سیاہ لنگی بیگ میں رکھی تھی جب زر بہار اس کے ہاتھوں سے صابن کی طرح پھسل گئی تھی اور پروفیسر راشد اعجاز کی جھولی میں جا گری تھی۔

زر بہار ایک مقامی شاعر کی دختر نیک اختر تھی۔اس نے ایم اے کیا تھا اور اب ایم فل میں داخلہ لینا چاہ رہی تھی۔ابو پٹّی ان دنوں شعبہ کا چیئر مین تھا۔وہ داخلے کا فارم لیئے چیمبر میں داخل ہوئی تو اس نے عجیب سی بے چینی محسوس کی۔بے چینی تو وہ ہر اس لڑکی کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا جو ایم فل کے لیئے داخلہ لیتی تھی۔لیکن زر بہار کی ادائیں کچھ الگ سی تھیں۔گفتگو کے دوران زلفوں کی ایک لٹ اس کے رخسار پر لہرا جاتی جسے ادائے خاص سے پیچھے کی طرف سرکاتی رہتی۔وہ گداز جسموں والی لڑکی تھی۔رخسار پھولے پھولے سے تھے۔خوبصورت نہیں تھی لیکن کہیں کچھ تھا جو ابو پٹّی کو لنگی پہننے پر اکسا رہا تھا۔

چمبر میں داخل ہوتے ہی اس نے ادب سے سلام کیا اور پھر دو قدم چل کر اس کے ایک دم قریب کھڑی ہو گئی۔عموماً طلبا چیمبر میں داخل ہوتے ہیں تو ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔لیکن زر بہار کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے برسوں کی شناسا ہو۔اس نے پہلے اپنے والد کا نام بتایا جو شاعر ہوا کرتے تھے۔ابو پٹّی نے متاثر ہونے کی اداکاری کی۔

''ماشااللہ...کیا کہنے۔

زر بہار خوش ہو گئی اور والد محترم کی شان میں رطب السان ہوئی کہ مشاعرے میں کہاں کہاں جاتے تھے اور کیسے کیسے اعزازات سے نوازے گئے۔ پھر چہرے کے قریب اک ذرا جھک کر مسکراتی ہوئی بولی۔

''سر.....میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں۔''

ابو پٹّی مسکرایا۔ایک ہی بار میں پی ایچ ڈی...؟ پہلے ایم فل کرتے ہیں۔''

اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دانتوں تلے زبان دبائی.....!

ابو پٹّی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی.

''کس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتی ہو؟''

''کچھ بھی.....''

''کس صنف میں؟ شاعری، افسانہ، ناول، تنقید....'' ابو پٹّی کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی لیکن اس کی مسکراہٹ برقرار تھی۔

''شاعر کی بیٹی ہوں تو شاعری پر ہی کرونگی۔''

نئی شاعری پر کرو۔اقبال غالب میر پر تو بہت تحقیق ہوئی۔''

''جی سر۔''

کسی کو پڑھا ہے.....شہریار، ندافاضلی، عالم خورشید.....خورشید اکبر.....؟''

''آپ پڑھا دینگے سر.....''

''میں....؟ میں تو بہت کچھ پڑھا دونگا...... ہے...... ہے...... ہے''

ابو پٹّی ہنسنے لگا۔زر بہار بھی ہنسنے لگی۔بالوں کی لٹ رخسار پر جھول گئی۔گالوں میں گڈھے سے پڑ گئے۔

چیمبر میں ثاقب داخل ہوا اور ابو پٹّی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''آپ بغیر اجازت اندر کیسے چلے آئے؟''

''سر.....میری تھیسس.....!''

''جانتا ہوں آپ نے تھیسس مکمّل کر لی ہے۔لیکن بے ادبی سے پیش آئیں گے تو تھیسس دھری رہ جائیگی۔''

''غلطی ہوئی سر...معاف کیجئے گا۔'' ثاقب سر جھکائے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی ابو پٹّی کا غصّہ کم نہیں ہوا۔

''یہی وجہ ہے کہ میں چیمبر اندر سے بند کر دیتا ہوں۔لڑکے بہت ڈسٹرب کرتے ہیں۔''

''صحیح کہا سر۔بغیر اجازت تو اندر آنا ہی نہیں چاہیئے۔''

پردے کے پیچھے سے کوئی دوسرا لڑکا جھانک رہا تھا۔

''دیکھو پھر کوئی جھانکنے لگا۔'' ابو پٹّی کی جھنجھلاہٹ بڑھ گئی۔

''دروازہ بند کر دوں سر....؟''

''رہنے دو۔کچھ طلبا ملنا چاہ رہے ہیں۔تم کل دس بجے آو۔فارم بھی بھر دونگا۔سمجھا بھی دونگا کیسے کیا کرنا ہے اور موضوع بھی طے کر دونگا۔''

''شکریہ سر۔میں کل آتی ہوں۔''

زر بہار چلی گئی ابو پٹّی نے طلبا کو اندر طلب کیا۔

چار لڑکے...... چھ لڑکیاں......!

ابو پٹّی نے لڑکوں پر طائرانہ سی نظر ڈالی۔لڑکیوں کو گھور گھور کر دیکھا۔وہ یقیناً فیصلہ کر رہا تھا کہ کس کو اپنی نگرانی میں رکھے اور کس کو دوسرے اساتذہ کو سونپ دے۔

''آپ فارم بھرنے آئے ہیں؟''

''جی سر......!''

''تو میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ فارم جمع کر دیں.

آپ کا ٹیسٹ ہوگا۔ جو زیادہ نمبر لائینگے وہ سیدھا پی ایچ ڈی بھی کرسکتے ہیں ورنہ ایم فل میں داخلہ ہوگا۔ چھ مہینے کلاسیس کرنے ہونگے۔ اس کے بعد پھر امتحان ہوگا۔''

''سر، ہمیں موضوع کے انتخاب کی آزادی تو ہے۔'' کسی لڑکے نے پوچھا تو ابو پٹّی نے اسے گھور کر دیکھا۔

''بالکل ہے لیکن اس موضوع کا علم بھی آپ کو ہونا چاہیئے۔''

لڑکا سہم گیا۔ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

طلبا چلے گئے تو ابو پٹّی کلاس لینے چلا گیا۔

زر بہار باہر نکلی تو بہت خوش تھی۔

''نئی مرغی۔'' لڑکوں نے اسے سر سے پاوں تک گھورا۔

''آپ ایم فل کے لیئے آئی ہیں۔''

''میں سیدھا پی ایچ ڈی کروں گی۔'' نئی مرغی مسکرائی

ثاقب یہ سوچ کر دل ہی دل میں حقارت سے مسکرایا کہ ان کی پی ایچ ڈی تو لنگی میں ہوگی۔

''آپ کا موضوع کیا ہے؟''

''جدید شاعری۔''

''جدید شاعری میں کیا؟''

''یہ سر طے کرینگے۔''

''کمال ہے۔ آپ پی ایچ ڈی کر رہی ہیں اور آپ کو موضوع کا پتہ نہیں ہے۔'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ثاقب کے جی میں آیا کہہ دے ''ہوشیار رہیے گا.... سر کمرہ اندر سے بند کر لیتے ہیں۔ لیکن خاموش رہا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ابو پٹّی کو اگر بھنک مل جاتی تو کیریئر تباہ ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ پھر بھی اس نے دبی زبان میں کہا۔

''سر آپ لوگوں پر پر مہربان رہتے ہیں اور ہمیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔''

لڑکوں کو واقعیٔ کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ لیکن لڑکیوں کو پریشانی نہیں تھی۔ ان پر خاص توجہ دی جاتی۔ اساتذہ آپس میں الجھ جاتے کہ کون سی طالبہ کس کی نگرانی میں تحقیق کرے گی۔ ان کے درمیان لڑکیاں مال مفت کی طرح بٹ جاتی تھیں۔ لیکن کوئی طالبہ پروفیسر راشد اعجاز کو پسند آجاتی تو چیئرمین سے بھڑ جاتا اور اس کو اپنے حصّے میں لے کر ہی دم لیتا۔ اس کی لنگی کا رنگ زیادہ پختہ تھا۔ اس نے الگ سے ایک کمرے کا فلیٹ لے رکھا تھا اور دروازے پر ''دارالمطالعہ'' کی تختی لگا رکھی تھی۔ وارڈروب میں لنگیاں سجی رہتیں۔ کچن بھی سجا رہتا...... طالبات کو دارالمطالعہ میں بلاتا۔ چائے کا دور چلتا اور پروفیسر لنگی میں قیلولہ فرماتا۔ جو لڑکی فلیٹ کا رخ نہیں کرتی اسے پی ایچ ڈی میں کئی سال لگ جاتے۔ لیکن وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ پہلے طالبہ کو یقین دلاتا کہ اس کے بغیر وہ پی ایچ ڈی نہیں کرسکتی۔ وہ پہلا باب خود لکھ دیتا۔ بیچ بیچ میں ڈکٹیشن دیتا۔ ڈکٹیشن کے دوران لڑکی کے پیچھے کھڑا ہو جاتا اور جھک کر دیکھتا کہ املا کی غلطیاں کہاں کہاں ہیں؟ پھر اس کے شانے کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر غلط الفاظ پر شہادت کی انگلی رکھتا اور کہتا اسے صحیح کرو۔ اس طرح ہاتھ بڑھانے میں اس کے بازو لڑکی کے رخسار کو چھونے لگتے۔ لڑکی ہٹ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی تو اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔'' بچّی...... تم میری مدد کے بغیر پی ایچ ڈی نہیں کرسکتی۔''

تب کچھ دیر کے لیئے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا اور کہتا۔ ''آگے لکھو....''

لیکن چند سطور لکھانے کے بعد پھر پیچھے کھڑا ہو جاتا اور رخسار سہلاتے ہوئے کہتا۔

''پیاری بچّی.... اس طرح غلطیاں کروگی تو تھیسس کا ستیا ناس ہو جائے گا۔''

جب فضا سازگار ہو جاتی تو کمرہ اندر سے بند کرتا اور لنگی......!

راشد اعجاز اسے ''پہلا اپی سوڈ'' کہتا تھا۔ پہلا اپی سوڈ ہمیشہ چیمبر میں ہوتا۔ باقی کے دارالمطالعہ میں......

پروفیسر راشد اعجاز سے سبھی خائف رہتے۔ اس کی پہنچ وی سی تک تھی۔ منسٹر سے بھی اس کے روابط تھے۔ بلکہ افواہ تھی کہ بہت جلد کسی اردو یونورسٹی کا وائس چانسلر ہونے جا رہا ہے۔

لڑکوں کے لیے کوئی جھک جھک نہیں تھی۔ وہ آزاد تھے۔ جسے چاہتے اپنا سپر وائزر بنا سکتے تھے۔ پھر بھی پروفیسر منظر حسنین کے پلّے کوئی پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چہرے پر سفید داغ تھے اور مقطع داڑھی تھی۔ تکونی ٹوپی پہنتے تھے جو پیشانی کو ڈھک لیتی لیکن داغ چھپ نہیں پاتے۔ کسی نے کوئی سوال پوچھ لیا تو حسنین اسے ٹارگیٹ کر لیتے اور اس کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ لیکن پنج گانہ نماز پڑھتے اور اخلاقیات کا درس دیتے۔ ایک دو لنگی ان کے پاس بھی تھی۔ جہاں لنگی میسّر نہیں ہوتی تو سوٹ کا اشارہ کرتے۔

''ریمنڈ کا سوٹ بہت اچھا ہوتا ہے۔''

''سوچتا ہوں ایک سوٹ سلوا لوں''

''لیکن سلائی بہت مہنگی ہے۔''

''آپ لوگوں کو کمی کیا ہے۔؟ جی آر ایف سے وظیفہ ملتا ہے۔''

عقلمند کے لیئے اشارہ کافی ہوتا ہے اور پریشانی کون مول لے۔؟ ہر سیزن میں دو چار سوٹ وہ سلوا ہی لیتے۔

اور پروفیسر ہاشمی.....؟

آنحضرت نے حرم سجا رکھا تھا۔ بیوی چھوڑ کر جا چکی تھی۔ آزاد تھے۔ لڑکیاں کچن سمبھالتی تھیں۔ کوئی چوکا برتن کرتی، کوئی سبزیاں کاٹتی۔ گل بانو کپڑے دھوتی اور ڈکٹیشن لیتی۔ علی گڑھ سے فکشن کا ایک بڈّھا بادشاہ آیا تو حرم سے دور سرچ اسکالر بھیجی گئیں۔ پرانا عہد نامہ میں آیا ہے.....

''اور داود بادشاہ بڈّھا اور کہن سال ہوا اور وہ اسے کپڑے اُڑھاتے

پر وہ گرم نہ ہوتا تھا۔ سواس کے خادموں نے اس سے کہا کہ ہمارے مالک بادشاہ کے لیے ایک جوان کنواری ڈھونڈی جائے جو بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اس کی خبر گیری کیا کرے اور تیرے پہلو میں لیٹ رہا کرے تا کہ ہمارے مالک بادشاہ کو گرمی پہنچے۔"

مالک بادشاہ نے آنحضرت کی سیمناروں میں پیروی کی اور انعام و اکرام سے نوازا۔

ثاقب نے قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر کام کیا تھا۔ اس کی تھیسس مکمل ہو چکی تھی وہ چاہتا تھا انٹرویو کی تاریخ مل جائے لیکن چیئر مین کا دستخط باقی تھا۔ وہ جب بھی تھیسس کی بات کرتا ابوپٹی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اسے سینئر لڑکوں سے معلوم ہوا تھا کہ تاریخ یوں ہی نہیں مل جاتی۔ بھاری رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ثاقب کسی امیر باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ جی آر ایف کا جو وظیفہ ملتا اس سے اپنی پڑھائی اور ہاسٹل کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اور اب تحقیق مکمّل ہو گئی تھی تو وظیفہ بھی بند ہو چلا تھا۔

ثاقب انگریزی ادب کا بھی مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کے سبھی معترف تھے۔ پروفیسر راشد اعجاز اس کے سپر وائزر تھے۔ سب جانتے تھے کہ ثاقب کا مقالہ اس کی اپنی محنتوں کا ثمر ہے۔ کسی کو پیسے دے کر نہیں لکھوایا۔ لیکن ثاقب غریب تھا۔

غریب ہو تو دکھ اٹھانا پڑے گا۔

اور سکینہ وہاب......؟ موزن کی لڑکی......؟

گوبھی کے پھول میں بھی تازگی ہوتی ہے لیکن سکینہ کے چہرے پر تو خزاں کا رنگ مستقل وہم کی طرح چھایا رہتا۔ آنکھوں میں درد کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتا تھا۔ ناک کی نوک اچانک بدھنے کی ٹوٹی کی طرح اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ نظر پہلے ناک کے سراخوں پر پڑتی۔ پستہ قد تھی اور جسم تھل تھل تھا۔ اسے کون پوچھتا۔ اساتذہ میں اس کے لیئے کبھی تکرار نہیں ہوئی۔ اور ثاقب کڑھتا تھا۔ وہ سکینہ وہاب کے لیئے عجیب سی ہمدردی محسوس کرتا جو الجھن بھری تھی۔ کیوں چلی آئی پی ایچ ڈی کرنے؟ کون پوچھے گا اس کو؟ لکچرر تو زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔ کوئی پیروی نہیں کرے گا۔؟ نہ تو اساتذہ کے پہلو گرم کر سکتی ہے نہ کمیٹی کے ممبران کی مٹھی۔ پھر یہاں آئی کیوں؟ غریب موزن کی لڑکی کو استانی ہونا چاہیئے۔ گھر گھر میں اردو اور قران پڑھائیگی تو گذارہ ہو جائیگا۔ لیکن پی ایچ ڈی کرلیگی تو نکمّی ہو جائیگی۔ لیکن موزن کی لڑکی ذہین تھی۔ اس نے نفسیاتی کہانیوں پر تحقیق کی تھی۔ پروفیسر امجد اس کے نگراں تھے۔ وہ شاعری پڑھاتے تھے۔ فکشن سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ انہیں نفسیاتی ادب کی شدبد بھی نہیں تھی۔ افسانہ "انوکھی مسکراہٹ" ضرور پڑھ رکھا تھا اور اسی کا بار بار حوالہ دیتے تھے۔ وہ سکینہ کی رہنمائی کیا کرتے؟۔ لیکن سکینہ نے بہت محنت کی۔ دن بھر لائبریری میں بیٹھی پڑھتی رہتی۔ ثاقب نے اس کی مدد کی تھی۔ اس نے پچاس سے زائد نفسیاتی افسانوں کی ایک فہرست تیار کی تھی اور سکینہ کو سب کی فوٹو کاپی مہیا کرائی تھی۔ ثاقب کی مدد سے سکینہ وہاب نے اپنا مقالہ مکمّل کیا تھا۔ اس کا مقالہ یونورسٹی میں جمع بھی ہو گیا تھا لیکن وایوا کی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی۔

ثاقب کی نظر سکینہ وہاب پر پڑتی اور وہ کڑھنے لگتا۔ ابھی ابھی وہ پروفیسر امجد کے چیمبر سے نکلی تھی۔

حسب معمول اس کے چہرے پر ٹوٹے پتّوں کا دکھ تھا لیکن کہیں سورج کی روپہلی کرنوں کا ہلکا سا رنگ بھی غالب تھا جو ثاقب کو نظر نہیں آیا۔

"کاٹتی رہو چکّر ڈپارٹمنٹ کے....."

"تاریخ مل گئی۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔ لیکن اس طرح مسکرائی جیسے رو رہی ہو.

"ارے واہ۔۔ مبارک!" ثاقب خوش ہو گیا،

"لیکن ایک الجھن ہے۔" خزاں کا رنگ پھر غالب ہو گیا۔

"اب کیا ہو گیا؟

سکینہ نے ایک پرچہ ثاقب کی طرف بڑھایا۔ اس نے ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ یہ تیس ناموں کی فہرست تھی۔

یونورسیٹیاں بھی صارفی کلچر کا حصّہ ہیں۔ رسرچ اسکالر پر واجب ہے کہ وایوا کے لیئے باہر سے استاد اعظم تشریف لائیں تو پنچ ستارہ ہوٹل میں ضیافت کا اہتمام ہو ورنہ تھیسس ردّ ہو سکتی ہے۔

وایوا لینے جامعہ سے استاد اعظم تشریف لا رہے تھے۔ وہ صرف لیگ کباب تناول فرماتے تھے۔ شعبہ سے فرمان جاری ہوا کہ حضرت کے لیئے پر تکلّف دعوت کا نظم کیا جائے۔ پروفیسر راشد نے مہمانوں کی فہرست بنائی ان میں رسرچ اسکالر اور شعبے کے دیگر اراکین کے نام بھی شامل تھے۔

تیس آدمیوں کی ہوٹل الکریم میں ضیافت... ؟ بٹر نان...... بریانی......لیگ کباب......چکن تکّہ......چکن بون لیس......فش فرائی......!

غریب ہو تو الجھن میں مبتلا رہو گے۔

اور ثاقب غصّے سے کھول رہا تھا......

"تمہیں پتہ ہے اخراجات کیا ہونگے......؟"

سکینہ خاموش رہی۔

"پچاس ہزار خرچ ہونگے...... پچاس ہزار۔"

"سر کہہ رہے تھے اس سے شعبے کا وقار بڑھے گا۔"

"تم شعبے کا وقار بڑھاؤ گی۔؟ اساتذہ اپنا وقار بڑھا رہے ہیں اور تم استعمال کی جا رہی ہو احمق اسکالر۔

"تو کیا کروں؟"

"مرو!" ثاقب جھنجھلا گیا۔

سکینہ آبدیدہ ہو گئی۔

تم نے وظیفہ کی رقم سے پیسے کاٹ کاٹ کر اپنی شادی کے لیئے جمع کیئے ہیں لیکن صارفی کلچر تمہارا پیسہ اپنے تصرّف میں لائے گا اور تم وہیں کھڑی رہوگی۔ کیا ضرورت تھی تمہیں پی ایچ ڈی کرنے کی دختر موزن......؟ اپنے سسٹم سے باہر جینا چاہ رہی ہو تو مرو......طبقہ اشرافیہ کو تم قبول نہیں ہو۔ تم موزن کی لڑکی ہو۔ معاشرہ موزن کو

موزن کہتا ہے۔موزن صاحب نہیں کہتا۔صاحب کا لفظ امام کے لیئے ہے۔''
''ثاقب تم بھی.....!''موزن کی لڑکی سسک پڑی۔
ثاقب خاموش رہا۔اسے ندامت ہو رہی تھی۔ وہ اپنا غصہ اس معصوم پر کیوں اتار رہا ہے؟ خود اس کی تھیسس تو لنگی دار بکس میں بند ہے۔
ثاقب نے معافی مانگی۔
''ساری سکینہ.....معاف کر دو۔''
''کیریئر کا سوال ہے ثاقب۔''
''ہم احتجاج بھی درج نہیں کر سکتے.....''ثاقب ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔
سکینہ نے آنچل کے کونے سے اپنے آنسو خشک کیئے.
ابو پٹّی نے دوسرے دن سیاہ لنگی خریدی، بیگ میں رکھا اور دس بجے اپنے چیمبر میں داخل ہوا۔وہ اپنی کرسی کے بازو میں الگ سے ایک کرسی رکھتا تھا۔
زر بہار سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ابو پٹّی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کو بغل کی کرسی پر بٹھایا۔
''فارم کی خانہ پری کر لی؟''
''جی سر!''زر بہار نے فارم اس کی طرف بڑھایا۔
''ادھر آو.اس کرسی پر۔''ابو پٹّی نے بازو والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔زر بہار کرسی پر اس طرح بیٹھی کہ دونوں کے بازو آپس میں مس ہو گئے۔ابو پٹّی نے فارم پر سرسری سی نظر ڈالی۔
''یہ کیا...؟صرف نام اور پتہ درج کیا ہے۔''
''سوچا آپ سے پوچھ کر بھروں گی۔''
''بچّی ہو تم.....!''ابو پٹّی نے مسکراتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔
زر بہار ہنسنے لگی۔زلفوں کی لٹ رخسار پر جھول گئی۔ابو پٹّی خوش ہوا کہ رخسار نے سہلانے کا برا نہیں مانا...اب آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ابو پٹّی نے ایک قدم آگے۔
اصل میں اس کے ہاتھ جسم کی دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگتے تھے۔چھپکلی کی نظر جس طرح پتنگے پر ہوتی ہے اسی طرح ابو پٹّی کی نظر''بچّی'' کے چہرے پر ہوتی کہ تاثّرات کیا ہیں؟ کس طرح شرما رہی ہے...برا تو نہیں مان رہی.....؟ جھنجھلاہٹ کے آثار تو نہیں ہیں؟ بھنویں تو نہیں تن رہی ہیں...کسی سے کچھ کہے گی تو نہیں؟ اگر سپردگی کے آثار نظر آتے تو دوسرا قدم بڑھاتا.....چہرے کا دونوں ہاتھوں سے کٹورہ سا بناتا اور پیشانی چومتا...کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کر موضوع سمجھانے کی کوشش کرتا اور پیاری بچّی کہہ کر آنکھیں چومتا...پھر رخسار...اور رینگتے رینگتے جھٹ سے تتلی پکڑ لیتا۔اگر ذرا بھی شبہہ ہوتا کہ بدک رہی ہے اور کسی سے شکائت کر سکتی ہے تو پیش قدمی روک دیتا اور ڈکٹیشن دینے لگتا۔
''دیکھو یہ ایک مشکل موضوع ہے۔میں لکھا دیتا ہوں۔''
اسے یقین دلاتا کہ وہ ایک بچّی ہے اور وہ اس کا بہت بڑا بہی خواہ ہے۔ایک دو ابواب خود لکھ دیتا اور پھر دیوار پر رینگنے لگتا۔چھپکلی اگر مستقل رینگتی رہے تو ایک دو پتنگے پکڑ ہی لیتی ہے۔

لیکن زر بہار تو خود مکڑی کے جال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ابو پٹّی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔اس کے جی میں آیا فوراً دروازہ بند کرے اور لنگی پہن لے۔اس نیّت سے وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسی پل سکندر طوفانی دھڑ دھڑاتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔زر بہار فوراً اٹھ کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی.
''السلام وعلیکم۔''
''وعلیکم السّلام''
''خاکسار کو سکندر طوفانی کہتے ہیں۔''طوفانی نے مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھایا۔
ابو پٹّی کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ہمّت نہیں ہو رہی تھی کہ بغیر اجازت اندر آنے پر طوفانی سے باز پرس کرتا۔
''یہ میری چھوٹی بہن ہے۔''طوفانی نے زر بہار کی طرف اشارہ کیا۔
''ماشاءاللہ بہت ذہین بچّی ہے۔''
''اک ذرا خیال رکھیے گا حضور.....!اور آپ مجھے تو جانتے ہی ہیں۔''
طوفانی نے مسکراتے ہوئے کہا
وہ طوفانی کو جانتا تھا۔اس نے ایک بار شعبہ انگریزی کے ایک پروفیسر کی اس کے چیمبر میں پٹائی کر دی تھی۔وجہ تھی پروفیسر نے ایک طالبہ کے گال سہلائے تھے جو طوفانی کی گرل فرینڈ تھی۔
خطرے کی گھنٹی.....
ابو پٹّی نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ زر بہار کو کوئی بھی لے جائے.....وہ خود کو الگ رکھے گا۔
زر بہار ٹسٹ پاس کر گئی۔سبھی پاس کر گئے۔ان کا بٹوارہ ہوا۔پروفیسر راشد اعجاز کو زر بہار پسند آ گئی۔اس نے فوراً اس کو اچک لیا۔اب اس کا میدان فکشن تھا۔پروفیسر نے اس کے لیئے موضوع کا انتخاب کیا۔''قرّۃالعین حیدر کی ناول نگاری۔''
دن گذرتے رہے۔ثاقب کی تھیسس اسی طرح شعبے میں پڑی رہی۔
ایک دن معلوم ہوا کہ پروفیسر اعجاز چیرمین سے اس کی تھیسس مانگ کر لے گئے ہیں۔
''اس میں ترمیم کرنی ہو گی۔''
''کیسی ترمیم سر!''
آپ نے قرّۃالعین کو ورجینیا اُولف سے متاثر بتایا ہے کہ شعور کی رو تکنک قرّۃالعین نے ورجینیا سے مستعار لی ہے۔
''جی سر!''
''لیکن آپ نے دلائل نہیں دیئے ہیں۔اولف کے ناولوں کا نام لیجیئے اور وہ عبارت کوٹ کیجیئے جس میں اس تکنیک کا استعمال ہوا ہے، ساتھ ہی قرّۃالعین حیدر کے ناول کا بھی اقتباس پیش کیجیئے جس سے شعور کی رو کا پتہ چلے۔ ریسرچ اسی کو کہتے ہیں ورنہ سوئیپنگ ریمارک سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بات کسی سے سن لی اور لکھ دیا۔

''لیکن سر یہ بات آپ نے پہلے نہیں بتائی۔''

''اب بتا رہا ہوں۔اس وقت یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی۔''

''لیکن سر تھیسس تو آپ نے او کے کردی تھی۔اس کا ایک ایک باب آپ پڑھ چکے ہیں۔''

''آپ میں یہی خرابی ہے۔اپنے استاد کی بات نہیں سنتے ہیں۔یہ تھیسس اگر ایکسپرٹ کے پاس بھیجی گئی اوراس نے خامیاں نکال دیں تو......؟

ثاقب نے حسب خواہ ترمیم کر دی لیکن راشد ایاز گھاس نہیں ڈال رہے تھے۔وہ جب بھی ملنے جاتا کمرہ اندر سے بند ملتا۔ایک باراس نے تہیہ کرلیا کہ مل کر ہی جائے گا۔باہر ٹول پر بیٹھا رہا۔دروازہ کھلا تو زر بہار دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ ثاقب نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ ہے. پروفیسر بھی پینٹ کا بیلٹ کس رہے تھے۔ ثاقب کی نظر فرش پر رکھے ہوئے بیگ پر پڑی جس کا زپ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔زپ کے کونے پر بیگ آدھا کھلا ہوا تھا جس سے گلابی رنگ کی لنگی جھانک رہی تھی۔

''سر....میں نے اس باب کو ری رائٹ کیا ہے۔''

''ابھی مصروف ہوں کل دکھائیے گا۔''

''سر...ایک نظر دیکھ لیتے۔''

''آپ میں یہی خرابی ہے۔استاد کی بات نہیں مانتے۔''

ثاقب سر جھکائے کمرے سے نکل گیا۔

استاد اعظم جامعہ سے تشریف لائے۔شعبہ میں چہل پہل تھی۔تیس آدمیوں کے لنچ کے لیئے الکریم بک ہوگیا۔مہمانوں کے آنے جانے کے لیے سکینہ کو کار کا انتظام بھی کرنا پڑا۔

دن کے گیارہ بجے سے وایوا شروع ہوگیا۔شعبہ کے سمینار ہال میں کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ایک صف اساتذہ کی تھی۔درمیان میں استاد اعظم جلوہ فگن تھے۔سامنے کی کرسی پر سکینہ بھیگی بلّی کی طرح بیٹھی تھی جیسے جائے مقتل پہنچ گئی ہواور اب فرماں روا حکم صادر کرینگے۔سکینہ کے پیچھے بھی کرسیوں کی قطار تھی جن پر طلبا براجمان تھے۔ان سے الگ طالبات کی قطار تھی۔استاد اعظم کے ہاتھ میں اسپائرل بائنڈنگ سے مزین تھیسس کا نسخہ تھا جسے الٹ پلٹ کر وہ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے قربانی سے پہلے بکرے کے دانت دیکھے جاتے ہیں۔

''آپ نے ایسے موضوع کا انتخاب کیوں کیا؟ نفسیاتی کہانیاں......؟ ہر کہانی نفسیاتی ہوتی ہے۔''

''سر کچھ انسانی رویّے اتنے پر اسرار ہوتے ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے ان نظریات اور افکار سے مدد لینی ہوگی جو ماہر نفسیات نے وضع کیے ہیں۔''

''اچھا...؟ کس کس کو پڑھا آپ نے...؟ ماہرین کا نام تو لیجیے۔''

سکینہ نے گھبراہٹ سی محسوس کی۔

''بتایئے...فرائڈ کا کارنامہ کیا ہے؟''

''لاشعور کی بازیافت۔''

یونگ......؟''

''اجتماعی شعور...آرکی ٹائپ کی دریافت اسی نے کی۔''

استاد اعظم نے پہلو بدلا۔ پھر اچانک تھیسس کا ایک ورق پلٹتے ہوئے بولے۔

''املا کی بہت غلطیاں ہیں آپ کے یہاں۔''

''ٹائپنگ مسٹیک ہے سر۔''

''یہ کیا جواب ہوا؟ سدھارنے کے لیے میرے پاس لائی ہیں۔؟''

سکینہ چپ رہی۔

استاد اعظم نے کچھ اور ورق پلٹے۔

''یہ کیا......؟اسی طرح فہرست سازی کی جاتی ہے؟ صرف کتابوں کا نام لکھا ہے۔سن اشاعت بھی نہیں لکھا۔ پبلشر کا نام بھی نہیں ہے۔یہ بہت غلط بات ہے......بہت غلط بات......!''

''لیکن بچی نے محنت تو کی ہے۔'' پروفیسر ہاشمی نے مداخلت کی۔

استاد اعظم مسکرائے۔''محنت تو سبھی کرتے ہیں''۔

لیکن ایک بات ہے۔تحریر اوریجنل لگتی ہے۔'' استاد اعظم اسی طرح مسکراتے ہوئے بولے۔

''ابو بنّی نے جھک کر آہستہ سے کہا۔''لنچ کا بندوبست الکریم میں ہے۔''

الکریم میں تیس آدمیوں کی جگہ مخصوص تھی۔زر بہار پروفیسر اعجاز سے چپکی نظر آرہی تھی.وہ جدھر جاتے ادھر جاتی۔وہ بیٹھے تو بغل میں بیٹھی.وہ اٹھے اور استاد اعظم کی پاس والی کرسی پر بیٹھے تو وہاں بھی چپک گئی۔لیکن سکینہ وہاب کھڑی رہی۔کوئی اسے بیٹھنے کے لیئے نہیں کہہ رہا تھا۔ثاقب نے کہا۔

''آؤ بیٹھو''

''میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟ میں میزبان ہوں۔''

''تم احمق ہو'' ثاقب کو غصہ آگیا

موزن کی لڑکی ......غریب......بدصورت ......تم ملازمہ کی طرح کونے میں کھڑی رہوگی۔اساتذہ برات لے کر آئے ہیں۔تم جہیز کی رقم ادا کروگی...... پچاس ہزار......!

ثاقب بھنّاتا ہوا ہوٹل سے باہر چلا گیا۔

لیکن موزن کی لڑکی کو ڈگری مل گئی۔وہ اب ڈاکٹر سکینہ وہاب تھی۔

ثاقب نے اپنے مقالہ میں دوبارہ ترمیم کی۔ورجینیا اُولف کے ناول 'لائٹ ہاؤس' کا اقتباس پیش کیا اور عینی کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی عبارت بھی کوٹ کی۔لیکن پروفیسر اعجاز مطمئن نہیں تھے۔انہوں نے چند اور مثالیں پیش کرنے کی ہدائت دی۔ثاقب کو احساس ہوا کہ اس کا مقالہ مکمّل نہیں ہوگا......؟ اس کے ارد گرد کانٹے سے اُگ آئے ہیں...وہ انہیں صاف نہیں کرسکتا......

لیکن ثاقب کوایک نشتر اور لگا۔ یہ کم گہرا نہیں تھا۔

زر بہاراس دن اترا کر چل رہی تھی اور ساختیات پس ساختیات کی باتیں کر رہی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا جس میں اس کا مضمون شائع ہوا تھا۔وہ سب کو دکھاتی پھر رہی تھی۔ثاقب نے دیکھا تو....

''ارے......ارے......ارے...... یہ تو میرا مضمون ہے۔''

''مابعد جدیدیت کے اسرار۔ یہ میں نے لکھا ہے۔تم نے اپنے نام سے کیسے شائع کرادیا؟''

''آپ کا مضمون کیسے ہو گیا جناب؟

''بالکل میرا ہے۔تم نے چوری کی ہے۔''

''آپ کے نام سے کہیں شائع ہوا ہے تو بتائیے۔''

''میں نے کہیں شائع نہیں کرایا۔ میں اس سے مطمئن نہیں تھا تو پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ تمہارے ہاتھ لگ گیا؟''

''واہ! کیالا جک ہے؟''

''میں تم پر مقدمہ دائر کروں گا۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔میں سر سے کہوں گی۔''

''سر نے ثاقب کو بلوایا۔زر بہار بھی بیٹھی ہوئی تھی۔۔

''آپ ان کو دھمکی کیوں دے رہے ہیں؟''

''میں کوئی دھمکی نہیں دے رہا ہوں سر۔لیکن انہوں نے میرا مضمون اپنے نام سے شائع کرادیا ہے۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟مضمون کی نقل دکھائیے۔''

''نقل نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا لیکن مجھے معیاری نہیں لگا تو پھاڑ کر پھینک دیا کہ دوبارہ لکھوں گا۔''

''اس بچّی نے بہت محنت کی ہے۔میں گواہ ہوں۔میری رہنمائی میں اس نے لکھا ہے اور آپ اس پر الزام لگا رہے ہیں؟ جائیے اپنی تھیسس مکمّل کیجیئے۔''

غصّے سے ثاقب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔اس کے جی میں آیا کھری کھری سنادے کہ ہم جب بھی کوئی مقالہ لے کر آئے آپ نے گھاس نہیں ڈالی۔یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی سے مضامین لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس جاہل لڑکی پر اتنی عنائت؟

کمزور آنسو پیتا ہے۔

ثاقب آنسو پی گیا۔اس نے خود کو ہی کوسا۔غلطی اس کی ہے۔ مضمون پھاڑ کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی۔رہنے دیتا ڈائری میں۔اس حرّافہ کے ہاتھ تو نہیں لگتا۔؟

اساتذہ کے رویّے سے ثاقب دل برداشتہ ہو گیا تھا۔شعبہ میں اس کا آنا جانا کم ہو گیا۔اس نے تھیسس میں کئی بار ترمیم کی لیکن پروفیسر اعجاز کو ہر بار کمی محسوس ہوئی۔

قدرت بھی کبھی پےدر پے زخم لگاتی ہے۔

اس بار ثاقب سنبھل نہیں سکا۔وہ ایک دوکان پر کچھ مسوّدے کی فوٹو کاپی کرانے گیا تھا۔وہاں اسے زر بہار کی تھیسس نظر آئی۔اور اس کے قدموں تلے زمین جیسے کھسک گئی۔یہ اس کی اپنی تھیسس تھی جسے زر بہار نے اپنا نام دے دیا تھا۔اس نے دوکان سے تھیسس اٹھائی۔دوکان دار اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ سیدھا شعبے میں پہنچا۔وہ پاگل کی طرح زر بہار کو ڈھونڈ رہا تھا۔وہ اسے کاری ڈور میں نظر آئی۔

''کیوں ری حرّافہ...؟ یہ تیری تھیسس ہے؟''

زر بہار کانپ گئی۔

ثاقب نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچا۔

''میری تھیسس چوری کرتی ہے۔''

''تمیز سے بات کیجئے۔''

''تمیز سے بات کروں تجھ سے......؟ ازار بند کی ڈھیلی دوسروں کو تمیز سکھاتی ہے......؟''

''چھوڑیئے مجھے......''

ثاقب نے اسے دیوار سے اڑا دیا۔''لنگی میں رسرچ کرتی ہے کمرے میں بند ہو کر......''

''مجھے جانے دیجیے۔''

''ساختیات اور پس ساختیات......؟''

''میں کہتی ہوں چھوڑیئے مجھے۔''

''چھوڑوں تجھے......؟ میرا مضمون چوری کر لیا، میری تھیسس چوری کر لی اور تجھے چھوڑ دوں......'' ثاقب نے اس کی چھاتیاں زور سے دبائیں

زر بہار سسک پڑی۔

ثاقب نے اس کی جانگھ اپنی جانگھ سے بھڑا دی۔

''میری جان......صرف لنگی بردار کو دوگی......؟''

لڑکے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

''کیا کرتے ہو ثاقب......؟ چھوڑو اسے۔''

''میری تھیسس چوری کی ہے۔''

''اس کو ذلیل کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس پروفیسر سے کہو جو ریسرچ کے نام پر جنسی استحصال کرتا ہے، پیسے لیتا ہے اور تھیسس بیچتا ہے۔''

لڑکوں نے کسی طرح زر بہار کو ثاقب سے چھڑایا۔ثاقب سیدھا پروفیسر راشد اعجاز کے چیمبر میں گھسا۔اس کی پشت پر لڑکے بھی تھے۔

''سن لے لنگی بردار......! جس دن تیری داشتہ کو وایوا کی ڈیٹ ملی اس دن ایف آئی آر درج کراؤں گا۔'' شعبے نے چپّی سادھ لی۔سب کو سانپ سونگھ گیا۔

ثاقب نے بھی ڈپارٹمنٹ چھوڑ دیا اور فوٹو کاپی کی دوکان کر لی۔

وہ مسوّدے کی اسپائرل بائینڈنگ کرتا ہے اور کمزور بچّوں کی تھیسس لکھتا ہے۔

''خوف کی چادر میں لپٹی بستی''

عذرا اصغر
(کراچی)

اور یہ پہلا موقعہ ہرگز نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ تین یا چار مرتبہ شاید۔۔۔ یا اس سے بھی زیادہ۔۔۔ اس نے تعداد کا شمار کرنا چاہا لیکن مفلوج ذہن کے ساتھ وہ کچھ سوچ نہ سکی۔ ہر بار وہ کوشش کرتی۔ چپکے چپکے انگلیوں پر گنتی۔۔۔ مگر ہر بار اس کی گرفت سے نکل بھاگتی یکا یک رشک سے اس کا سینہ بھر گیا۔

''تعدا۔۔۔؟ کتنی خوش نصیب ہے کہ گرفت سے آزاد ہے۔''

اور میں ۔۔۔؟ ہم ۔۔۔ اور ہم سب ۔۔۔؟ کیا آزادی ہمارے مقسوم میں نہیں ۔۔۔؟ یا آزادی کا لفظ ہماری لغت سے مٹا دیا گیا ہے۔۔۔؟ مگر یہ کتنی بری بات ہے آج جانے میں کیا سوچنے بیٹھ گئی ہوں۔ یہ کوئی پہلا موقع تو نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ پھر آج ایسا کیوں ہوا۔۔۔؟

دور لان کے ایک نسبتاً تنہا گوشے میں بچے ''گھر گھر'' کھیل رہے تھے۔۔۔ یہ گھر ریت کے نہ تھے کہ بھر بھرے ہوتے۔۔۔ ساحلِ سمندر سے کوسوں دور ریت کے گھر بنانا بھی ممکن کیسے تھا بھلا۔۔۔ راوی، چناب، جہلم کے بہتے پانیوں پر تیرا تو جا سکتا ہے لیکن کناروں پر گھر بنانا ممکن نہیں اور کناروں پر گھر بن بھی جائیں تو پانی کی تند خو، سرکش لہریں کسی وقت بھی ان کا قلع قمع کر دیں گی۔ اور مارے شرم کے دریا اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ ستلج اور بیاس کے پانیوں میں بے گناہ انسانی خون گھول دیا گیا تو دریا غیرت سے سکڑ گیا۔ رستہ بدل دیا اس نے اپنا۔۔۔ بے وطن ہو گیا۔ فرات اور دجلہ شط العرب میں غرق ہو گئے۔ انسانیت کی سفا کی برداشت نہ کر سکے۔ وہ تاریخ کے عظیم ترین لوگ جوان کے کنارے بسنے آئے تھے ان پر تاریخ کا سب سے بڑا ظلم ہوا۔ خود تاریخ چیخ اٹھی۔۔۔ رو پڑی اور پانی۔۔۔ پانی پانی ہو گیا۔ پھر کسی کو دریا کنارے گھر بنانے کی ہمت نہ ہوئی اور کناروں کی مٹی سدا کے لیے بھر بھرا گئی۔ بچے جو گھر گھر کھیلنے میں مگن تھے کچی پکی اینٹوں، ٹوٹی پھوٹی چیزوں، ڈبوں اور اسی قسم کی اشیاء سے گھر بنا کر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے خاصے بڑے قطعے میں اپنی رہائشی کالونیاں بنائی تھیں اور ان کی حد بندیاں کی تھیں۔ اس نے دور بیٹھے مختصر برآمدے کے کونے سے بغور انہیں دیکھا اور اس کا تصور ایک چھپاکے سے لمبی اڑان اُڑ گیا۔

تب بھی بندش تھی زبانوں پر مہریں اور سوچوں پر پہرے تھے۔ لیکن وہ جو پہرے کی زد پر تھے ان کی آنکھوں میں خوف اور دلوں میں بغاوت پلتی تھی۔ لیکن تب ان کے قدم مضبوط اور راستے سامنے تھے۔ منزل تک پہنچنا دشوار ضرور تھا مگر منزل نظروں سے اوجھل نہ تھی۔ تب حویلیاں وسیع تھیں، دن لمبے اور راہداریاں روشن تھیں۔ بچے اس وقت بھی گھر گھر کھیلتے تھے۔ کچے گھروندے کئی کئی دن آباد و شاداں کھڑے رہتے۔ گڑیوں کے بیاہ رچتے، ہنڈکلیا پکتیں۔ ساری گرم دوپہریں وہ اپنے سروں پر لیتے اور لمبے دالانوں میں پڑے پردوں کے پیچھے سے سروتوں کے کٹا کٹ کی آوازیں سکوت کو منتشر کرتی۔ آموں کے ٹوکرے بھر بھر اترتے۔ خربوزوں کے ڈھیروں سے نکل کر مہک سارے میں پھیلتی۔ گنّوں کی پولیاں اور گرم گڑ کی بھلیاں ٹھنڈی سرد راتوں میں لذتِ کام و دہن کرتیں۔ سکھ سے لوگ اپنے گھروں میں آباد رہتے۔ بہت دور۔۔۔ شاید سات سمندر پار سرحدوں پر جنگ لڑی جا رہی تھی۔ اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن نہ دلوں میں اس قدر سناٹا تھا اور نہ خوف کا پہرہ۔۔۔ شاید مہنگائی کے کارن جنگ کا تذکرہ بارہا اور برملا گھروں میں ہوتا، ہٹلر کا نام زبانوں پر تھرکتا۔ لمحے کے لمحے تاسف، رنج اور خطرات کا تذکرہ لبوں پر آتا اور پھر سب کچھ معمولات کے ریلے میں بہہ جاتا۔ خوشی بھرے دن اور مطمئن راتیں لوٹ آتیں۔ پھر شاید وہ دور دراز کے ملکوں میں لڑی جانے والی جنگ ختم ہو گئی۔ ایک نسل نے دوسری نسل کو اپنی ذہانت اور فطانت کے ہتھیاروں سے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ ایک بار پھر قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ خدا کی سونا اگلتی، سبزے سے لہلہاتی زمین بنجر کر دی گئی۔ غاروں کے منہ کھل گئے ہٹلر کی بستی کی کوکھ بانجھ ہو گئی۔ انسانوں کی کھیتی آن کی آن میں کٹ کے رہ گئی۔

ذہانت و فطانت کا کیسا عجب اور سفاکانہ مظاہرہ تھا کہ دنیا لرز اٹھی۔ زبانیں گنگ ہو گئیں اور صدیوں بعد جو نسل انسانی کی کونپل اس دھرتی پر پھوٹی تو وہ اپاہج تھی۔ لنگڑی لولی زندگی کہ زمانے کی چشمِ بینا سے سمندر کے سمندر ابل پڑے۔ آسمانوں سے نظارہ کرتی روحیں کراہ اٹھیں اور جب یہ طوفانِ نوح اس سرے سے گزر رہا تھا تو دنیا کے اس سرے پر ایک بھیانک آندھی منڈلانے لگی۔ ریت کے ذرّے آنکھوں میں چبھنے لگے۔ دلوں کا سکون جیسے لٹ سا گیا۔ خس کی ٹٹیاں لگے سوندھی خوشبو سے مہکتے برآمدے دیکھتے ہی دیکھتے ویران ہونے لگے۔

حویلیوں کے گوشوں میں بنے کچے گھروندے سنسان پڑے رہ گئے اور گھر گھر کھیلتے بچے ماؤں کی انگلیاں تھامے بے گھری کی صعوبت اٹھانے کو چل پڑے اور یہی وہ دور تھا کہ جب اس خطے میں بسنے والوں کی آنکھیں خوف سے پتھرا گئیں اور ان کی زبانیں گنگ ہوئیں۔ اپنے ہی گھروں کے دروازے ان پر مقفل کر دیئے گئے اور دھرتی کی چادر ان کے قدموں تلے سے کھینچ لی گئی۔ اگرچہ یہ پہلا موقع ہرگز نہ تھا۔ لیکن اس کی بیحد ننھی منی سی زندگی میں رونما ہونے والا یہ پہلا عجیب حادثہ تھا قطعیت کے ساتھ اس نے سوچا۔۔۔ پہلا۔۔۔ اور اس نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کے پورے پر ایک نشان لگایا۔

''ایک''۔۔۔ پھر دوسری بار۔۔۔ راتوں رات جیسے بستی پر جنات نے قبضہ کر لیا۔ بستی والے بولتے ہوئے خوف کھانے لگے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے مگر لب چپکے رہتے۔ جانے کون انجانے میں گویا سنگین

تانے کھڑا تھا کہ ہر نفس خوف زدہ تھا۔ سہا ہوا۔ گویا ایک صدی یونہی بیت گئی اور بستی والے انہیں یاد کرنے لگے جوان سے پہلے بساطِ وقت کی چوکور پر بیٹھے گھر گھر کھیلتے تھے اور مٹی کے گھروندے ہر صبح تعمیر کرتے تھے اور ہر رات اترتے سمے ڈھا دیتے تھے تب بستی کے لوگ انہیں برا جانتے تھے اور ان کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔

گئے وقت کو بس یاد ہی تو کیا جا سکتا ہے پکڑا تو نہیں جا سکتا نا؟ مگر گھر گھر کھیلنے والے بڑوں کو جیسے عادت سی پڑ گئی تھی۔ پھر کسی سمت سے وہ اٹھا اور چھا گیا۔ پچھلوں کا جانشین۔ اس نے آتے ہی سر قلم اور بازو شکستہ کروا دئے چنگیز خاں کی اولاد۔۔۔ دیکھنے سننے والے سہم سہم گئے۔ زبانیں گنگ اور آنکھیں کور ہو گئیں۔ انسانوں کی بستی میں انسان روبوٹ نظر آنے لگے۔ اپنی سوچ سے عاری دماغ لئے جینے کا کیسا سلیقہ انہیں آ گیا تھا۔

کرب کے شدید احساس سے اس نے اپنا کلیجہ کوٹ ڈالا۔ کیا وہ سب قہرِ خداوندی تھا؟

اللہ اپنی نافرمانی کرنے والوں سے ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ اور یہ شاید تیسرا موقع تھا۔۔۔ یا شاید۔۔۔ اس نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کے پورے پکڑے اور تعداد شروع کی۔ ایک۔ دو۔ تین چار۔۔۔ لیکا یک تعداد اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔

لان کے سنسان گوشے میں بچے ابھی تک گھر گھر کھیل رہے تھے۔ دھوپ ان کے سروں پر چڑھ آئی تھی مگر وہ کھیل میں مگن تھے۔ ہر خطرے اور تکلیف سے بے نیاز و بیگانہ۔ اسے ایک بار پھر اپنی کشادہ حویلی یاد آئی جسے خوف کے لمحات میں بھرا پُرا چھوڑ کر وہ سب گویا دبے پاؤں نکل بھاگے تھے۔ اس منزل کی تلاش میں جو جنت سے کم نہ تھی اور جہاں ان کے تئیں سکون تھا۔ خوشی تھی۔ اطمینان تھا۔ سکھ ہی سکھ اور جہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ بہت سے بڑے، مدبر اور فہم و فراست سے بھرے دماغ والے گھر گھر کھیلتے تھے۔ صبح گھروندا بناتے اور شام کو خود ہی ڈھا دیتے۔ چار چھ عشروں میں زیادہ عشرے چپ کے پیرائے میں گزر گئے۔ آبادی کے لبوں کو سنگینوں کی سوئیوں سے سی کر بند کر دیا گیا تھا۔ اور ان کے ذہنوں پر نااہلی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا تھا۔ ان کے لب صرف نعرے لگانے کو کھولے جانے اور کام ختم ہوتے ہی پھر سی دئے جاتے۔ حتیٰ کہ بستی والوں کو چپ رہنے اور کچھ نہ کہنے کی عادت پڑ گئی۔ جبر کھانا اور ظلم اوڑھنا ان کی سرشت ہو گئی۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زبانیں کاٹ ڈالیں اور مطیع بن کر جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ محنت کے صلے ملی رقوم آتے ہی ان کی جیبیں کاٹ لی جاتیں اور وہ چپ رہتے۔ دن کے اجالے میں عصمتیں تار تار ہو جاتیں اور وہ چپ رہتے۔ بے بنیاد الزامات کی بیڑیاں پہنا کر انہیں تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا لیکن وہ چپ رہتے۔ احتجاج کرنا وہ بھول چکے تھے۔ بستی کے مکین اپنے حقوق کے گویا دستبردار تھے۔ وہ بھی چپ تھی اور کھلی آنکھوں اور کھلبلی مچاتے ذہن و دل کے ساتھ بیٹھی بچوں کو گھر گھر کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ اسے خود پر تعجب ہو رہا تھا کہ اس کے خیالات خود بخود بھٹک گئے تھے۔ اس کے ذہن پر جمی کائی اتر رہی تھی اور بغاوت کی کونپل سر نکال رہی تھی۔ یہ بات بذاتِ خود کافی انوکھی اور انہونی تھی۔ وہ اپنی تبدیلی پر خوف زدہ ہو گئی اور بغاوت کی کونپل کا سر ڈھونڈنے لگی کہ نشو نما کا موقع ملنے سے پہلے اسے اکھاڑ پھینکے۔ تبھی یکدم ایک شور سا اٹھا وہ سہم کر کھڑی ہو گئی اور سراسیمگی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی لان کے نسبتاً تنہا گوشے میں ہلچل مچی تھی۔ بچے جو لحہ بھر پہلے بڑے سکون سے گھر گھر کھیلنے میں مشغول تھے اب دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ ''اس نے توڑا ہے۔ نہیں نہیں تم نے توڑا ہے'' وہ ایک دوسرے پر الزامات کے تیر برسا رہے تھے اور ان کے گھروندے بکھرے پڑے تھے عجیب افراتفری کا سا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ وہ سب جو پہلے سر جوڑے سکون اور اتفاق سے بیٹھے کالونیاں بنا رہے تھے اچانک کیسے تتر بتر ہو گئے؟

حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے وہ من من کے بوجھل قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ اٹھتے قدموں کے ساتھ آوازیں تیز اور صاف ہوتی گئیں۔ تب اس کی کور آنکھوں نے دیکھا۔ حاجی للّو داد خان اپنی انگارہ آنکھوں سے ان پر شعلے برسا رہے تھے اور ان کی زبان سے نکلے بہت سے تیر و تفنگ ننھے معصوموں کی جان کو چھلنی کر رہے تھے۔

''ارے غضب خدا کا۔ ان کی یہ جرأت کہ جہاندیدہ عظیم لوگوں کی نقل اتاریں۔ یہ سراسر بے ادبی ہے۔ توہین ہے۔'' وہ چیخ رہے تھے۔

''نقل تو آپ ہماری کرتے ہیں۔ ہمارے کھیل کھیلتے ہیں۔'' بچوں نے ترکی بہ ترکی شور مچایا۔

''دیکھو دیکھو! یہ چار چار بالشت کے بچے کیا عالمانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ ذرا غور کرو، سوچو۔ گھر بناتے ہیں اور خود ہی ڈھا دیتے ہیں۔ کیا قہر نہیں ہے خدا کا کہ بچے دانشمند ہو جائیں اور بڑوں کے کاموں کو کھیل بنا لیں۔ استغفر اللہ''

اس نے سہم کر حاجی للّو داد خان کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کچے گھروندوں کا ملبہ سمیٹنے لگی۔ تب اس کے ذہن نے چپکے سے سوچا۔ فرسنگوں دور گرتے جلتے مکانوں کا ملبہ کون سمیٹے گا۔۔۔؟

اور خوف کی سوئیاں اس کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں۔

جاگ درد دل جاگ

فیس بک کی چوتھی سالگرہ کے موقع پر اطلاع کے مطابق دنیا بھر میں فیس بک استعمال کرنے والوں کی تعداد دو ارب کو پہنچ گئی ہے۔ کے سی ایف او ڈیوڈ کے مطابق فیس بک کے فری استعمال کے باعث یہ ترقی حاصل ہوئی ہے۔ جبکہ فیس بک کی آمدنی میں گذشتہ برس کے مقابلے پچاس فیصد اضافے کے بعد 8.8 ارب ڈالر کو جا پہنچی ہے۔

مہاجر

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

میں کرب و اذیّت کے گرداب میں پھنسا تھا۔ساتویں پسلی کی چبھن نا قابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔رات آنکھوں میں کٹتی اور جھپکی میں بھی گزرے ایّام کے فوٹیج رواں ہوجاتے۔اکثر شبِ تنہائی میں ماضی، اژدہے کی طرح گرفت میں لے کرآہستہ آہستہ پسلیاں چٹخاتے ہوئے جب مجھے زندہ نگلنے لگتا تب جی چاہتا ہے کہ دَبے پاؤں کمرے سے نکل کر صحرا میں جاؤں اور ببول کے خاروں میں اپنے تمام کرب و بے بسی کو کھوس آؤں۔

عورت غنچے کی طرح منہ بند ہوتی ہے۔وہ بھی دھیرے دھیرے سوچ وعمل کی پنکھڑی کھولتی ہے۔اُس کا اصلی روپ دو بچوں کی پیدائش کے بعد عیاں ہوتا ہے۔وہ برگِ حنا کی طرح فریب بھی دیتی ہے۔یہ سمجھ مجھ میں نہیں تھی۔میں مچھلی کو تالاب میں ہاتھ سے پکڑنا چاہتا تھا۔میری سوچ ساون کے اندھوں جیسی تھی۔قوسِ قزح کے خوش رنگ منظر کومدّتوں آنکھوں میں بسائے رکھا اور ازدواجی زندگی کے اچھے دن انعامی رقم کی طرح فَر فَر خرچ کر دیئے۔وہ دور عجیب تھا۔منفی ومُضر باتیں مثبت لگتیں اور بہی خواہوں کے مشورے گمراہ کُن۔اِسی سبب خوشگوار زندگی کا بیڑا غرق ہوا اور میں مجروح احساس وجذبات کا کرب و کسک جھیلنے لگا۔

میاں بیوی میں تُو تُو میں میں، سرحدی جھڑپوں سی ہوتی اور سیز فائر کا معاہدہ ٹوٹتا رہتا ہے۔میری زندگی کا وہ سیاہ ترین دن تھا۔بات ایک دوسرے کو اوقات بتانے پر مرکوز تھی۔اُس کی نظر کیا کیا دیکھتی اور ذہن کیا کیا سوچتا رہتا ہے، یہ بات اُس دن عیاں ہوگئی تھی۔اُس کا غیظ اور بغض وحسد بے قابو ہوکر منہ سے کود پڑا تھا۔وہ بولی،''مجھ جیسی سہاگن سے اچھی بیوہ۔''

میں ہکّا بکّا رہ گیا اور وہ قسمت کو کوستے ہوئے سسکنے لگی تھی۔

میں نے غصّے کو پی کر کہا،''پاگل ہوگئی ہو؟ بیوہ، سہاگن سے اچھی ہوسکتی ہے؟''

وہ بھڑک کر بولی،''ہاں! کیوں نہیں؟ ہوتی ہے۔آنکھوں پر پٹّی بندھی ہوتب ہاتھی بھی نظر نہیں آتا۔''

میں سمجھ گیا کہ اُس کی نظر میں کون ہے۔میرے بھائی کی جواں مرگی نے اُس کی بیوی کی زندگی بدل دی تھی۔وہ پلک جھپکتے خودمختار اور پوری ملکیت کی تنہا مالکن بن گئی۔قدغن لگانے والا کوئی نہ رہا۔سسرالی بندھنوں سے بھی مُکتی مل چکی تھی۔مانگنے والا ہاتھ کمانے لگا۔حسن ورعنائی بھی مُراجعت کرنے لگی تھی۔اُس کے شب وروز اچھے گزر رہے تھے۔میں خوش تھا کہ بارِ کفالت مجھ پر نہیں پڑا۔اُس کے رشک وحسد سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔میں نے تُرش وتُند لہجے میں پوچھا،''میری ماں تمھیں نظر نہیں آئی؟ اور.....''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی،''خوب آئی۔شوہر کے راج میں پھوٹی کوڑی کی محتاجی اور بیٹوں کے راج میں عیش ہی عیش۔سب کے نصیب میں یہ عیش کہاں۔''

اُس کے دل ودماغ میں سونامی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور میرا غصّہ عروج پر تھا۔مجھے لگا، اُس کی انوکھی خواہش کو پورا کرنے کا یہ صحیح وقت ہے۔میں نے پُرعزم لہجے میں کہا،''ٹھیک ہے۔میں تمھیں عیش بھری زندگی کا تحفہ دوں گا۔''

اُس رات میں نے حسبِ منصوبہ منہ اندھیرے بستر چھوڑا تھا۔پھر گھر بار کو فسادزدہ کی طرح الوداعی سلام کیا اور تہی دست و پا پیادہ کوہستان کی جانب چل پڑا تھا۔وقتِ ہجرت نہ جانے کیوں میرے دل میں کسک وملال نہیں بلکہ ایک عجیب سا طمطنہ، بے فکری اور بے مروّتی سمائی تھی۔نہ موہ مایا دامن گیر تھی اور نہ کل کی چنتا۔بستر پر وصیت نامہ، دستاویزات، بینکوں کے کھاتے، بلینک چیکس، کارڈس مع پن نمبر، دُکان کی چابیاں اور ایک رقعہ بھی رکھ دیا تھا۔اگر چہ دل یہ چاہتا تھا کہ رقعہ میں لہو نچوڑ کر اور کلیجہ چیر کے رکھ دوں۔پھر سوچا، کیا فائدہ؟ بلا القاب میں صرف اتنا ہی رقم کر سکا کہ''میرے علاوہ سب کچھ تمھارے پاس ہے۔اب تم بھی پُرعیش زندگی جی سکتی ہو......الوداع!''

نا معلوم پُر خطر پتھریلی ناہموار راہوں پر چلتے چلتے میں نڈھال ہوجاتا۔جسم وجاں کا رشتہ اُستوار رکھنا آسان نہیں۔شکم غذا، جسم آسودگی، ذہن سکون اور اَنا سر بلندی مانگنے لگتی تب بدھ کا یہ سندیش''چلتے رہو، چلتے رہو.....'' حوصلے کو توانائی بخشتا۔بیدار ذہن، موجِ دریا کی طرح رواں رہتا ہے۔میں ماضی سے کترا کر چلتا۔پھر بھی وہ بیتال کی طرح پیٹھ پر سوار ہوکر سوال کرنے لگتا۔

چلتے چلتے جب میں تھک کر چور چور ہوجاتا تب کسی درخت کی چھاؤں میں، نیلے آکاش تلے یا کسی خوبصورت پُرشکوہ چٹّان پر بیٹھ کر سُستانے لگتا۔ایک دن جب میں بددعا زدہ منجمد شہزادے کی طرح بت بنا رہا تب تکان بولی کہ عجلت کیسی؟ جب چلنا ہی سفر ہے تو سُستانا بھی اِسی کا حصّہ ہے۔تازہ دَم انسان کم وقت میں لمبی مسافت طے کرسکتا ہے۔یہ مشورہ جب کبھی صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتا تب جسم زیرِ سیلاب مٹّی کے گھر کی طرح زمین بوس ہوجاتا۔میں جتنی دیر سُستاتا جسم اُس سے زیادہ کا طلب گار رہتا۔ایک دن میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ منزل طے شدہ ہوتی تو پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا۔پھر بہت آگے نکل آنے کا احساس سرخوشی بخشتا اور منزل کو جلد پالینے کی للک قدموں کو رفتار دیتی۔مجھے یاد ہے۔دل کی مینا بولی تھی کہ تمھارا مقصد کسی مقام تک پہنچنا نہیں بلکہ کولھو کے بیل کی طرح فقط چلنا اور ایّامِ زندگی کے باقی ماندہ دِنوں کو خرچ کر دینا ہے۔تم ایک قیدی ہواور صحرانوردی تمھاری سزا ہے۔

مُہاجر پرندے بھی دورانِ پرواز دَم لیتے ہیں۔چلتے چلتے جب میرا دَم

اُکھڑنے لگتا تب میری نظر تھکی چڑیا کی طرح گوشہِ عافیت تلاش کرنے لگتی۔ آرام کا وقفہ طویل ہوتا تب میری سوچ از خود بدل جاتی۔ دل و دماغ میں یہ خیال خلجان پیدا کرنے لگتا کہ سفر بیٹھ کر تو جاری نہیں رکھا جاسکتا اور نہ عزم کو کنی سے جوئے شیر رواں ہو سکتی ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوتا اور راہ چلتے ہوئے تازہ دَم رہنے کی ترکیب نکالنے لگتا۔ سحر انگیز فضا، آبشار کی موسیقیت اور خوش گلو پرندوں کے نغمے اکثر میرے قدم روک لیتے تب میں شفاف جھرنے کی محفوظ چٹان پر بیٹھ کر آرام سے منہ ہاتھ دھوتا، چلّو سے پانی پیتا پھر پاؤں پانی میں ڈال کر قدرت کی رعنائیوں کا لطف لینے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میری اُداسی، میرا غم و غصہ اور دردِ ہجرت تلوے سے نکل کر پانی میں تحلیل ہونے لگا ہے۔ شگافوں میں جاذُبکی مچھلیاں تھوڑی دیر میں بے خوف ہو کر پاؤں کے گرد چکّر کاٹتے ہوئے زخموں کا بوسہ لینے لگتیں۔ یہ راحت بخش احساس شریانوں میں توانائی کی اضافی لہر دوڑا دیتا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوتا اور شکم سیر، آبی پرندوں کی طرح جو جی چاہتا وہی کرتا۔ تکان وفادار کتّے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی۔ جب مجھ میں قدم بڑھانے کی سکت نہیں رہتی تب میں بیٹھ کر پیروں کو دَباتا، سہلاتا اور زخموں پر نرم پتّوں کے بعد سخت پتّے باندھ کر خراماں خراماں چلنے لگتا۔ میں اپنے آپ میں مگن رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ جہاں جو میّسر ہوتا کھا پی لیتا اور گوریلے کی طرح رات شاخوں پر گزارتا۔ سورج غروب ہوتا، مناظر بدل جاتے اور جب وہ طلوع ہوتا ایک نیا سویرا لاتا۔ ہر دن تازہ تازہ اور ہر رات اَنچھوئی سی لگتی۔ مقام و حالات کے بدلتے معمولاتِ زندگی از خود بدل گئے۔ سوچ کا مرکز گھر پریوار سے منتقل ہو کر اپنی ذات پر مرکوز ہو گیا۔

ایک رات پونم نے چپکے سے اپنی چال چل دی۔ ذہن میں پورا منظر رقص کر گیا۔ شادی کی پہلی سال گرہ منانے وہ مجھے اپنے گاؤں لے آئی تھی۔ وہ موسمِ گرما کی رات تھی۔ گاؤں کی اکلوتی پکّی عمارت کی دومنزلہ کھلی چھت پر چاندنی کی رِدا اوڑھے وہ میرے پہلو میں بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ گلابی لباس میں وہ مجھے شگفتہ گلاب کی سی لگی تھی۔ اُس کے جسم اور زلفوں سے نکلتی مدہوش کُن بو حواس پر چھانے لگی تھی۔ میں پہلی سال گرہ کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ میں چیتے کی طرح گھات لگائے تھا۔ اگر وہ خوابیدہ شیر خوار بچے کی طرح مسکرا دیتی تب مجھے بوسہ ثبت کرنے کا جواز مل جاتا۔ پھر میں دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ لیکن وہ تو پپیہے کی ''پی کہاں، پی کہاں'' کی دِل سوز پکار سنتی ہوئی چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی لاتعلقی اور عدم التفات سے مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ آکروِش جسم و جذبات پر منفی اثر ڈالنے لگا تھا۔ مجھے یہ احساس پھر ستانے لگا کہ اِس کا جسم میرے قبضے میں ہوتا ہے لیکن ذہن و دل کہیں اور۔ اچانک یہ شُبہ ہوا کہ چاند سا مکھڑا والا اِس کا محبوب ہو گا اور مضطرب پپیہے کی پکار میں وہ اپنی صدا محسوس کر رہی ہے۔ سرا ملتے گرہ کھُل گئی۔ سہاگ رات میں اِس نے دانستہ مجھے تشنہ لب رکھا تھا۔ ''وہ نہیں، تو کوئی اور نہیں۔'' یہ وعدہ، اِس نے اپنے آپ سے کیا ہو گا۔ مجھے لگا، یہ جیون بگھی سے جُتی اُس گھوڑی سی ہے، جو ہم رِکاب گھوڑے کے ساتھ دوڑتی ہے لیکن اُس کے دل میں چاہت و رَفاقت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ اِس کی خود سپردگی میں بھی چاہت، جذباتیت اور معاونت نہیں بلکہ مقروض سا سبکدوشی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اِسی سبب آتشیں لمحوں کے گزرتے مجھے لگتا، میں لبِ ساحل اوندھے منہ گر پڑا ہوں اور منہ و ناک میں ریت بھر گئی ہے۔ اچانک کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آنے لگی تھی۔ پھر ایک نوزائیدہ بچہ رونے لگا، جسے ماں پُچکارنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں بچہ خاموش ہو گیا۔ لیکن بوڑھا کھانستا اور بلغم تھوکتا رہا۔

پپیہے نے چپّی سادھ لی تب وہ اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔ پھر وہ سر اُٹھا کے مجھے غور سے دیکھتی ہوئی بولی، ''آپ تو جاگے ہیں۔ مجھے لگا تھا، سو گئے۔''

میں خاموش رہا۔ تب اُس نے مجھے کریدا، ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

میں نے پلٹ وار کیا، ''اور تم کن خیالوں میں ڈوبی تھی؟؟''

''یہی کہ چکور کی پُرخلوص چاہت اور پپیہے کی اٹوٹ آس مثالی ہے۔ چکور اپنی کوششوں سے باز نہیں آتا اور پپیہے کا حوصلہ پست نہیں ہوتا......''

''دونوں حقیقت نا آشنا ہیں۔'' میرا لہجہ تُرش تھا۔

خاموشی، اَکمن کے پھاہے کی طرح فضا میں تیرنے لگی تھی۔ خوش فعلیوں کا وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ مجھے لگا، میں مداری کا بندر ہوں، جو حکم اور اشارے کا منتظر ہوتا ہے۔ اچانک وہ میرے سینے پر ٹھڈّی جما کر بولی، ''ایک بات پوچھوں؟''

ٹھڈّی چُبھنے لگی تھی۔ لیکن سینے کا دَباؤ سرور بخش تھا۔ میں فلسفیانہ گفتگو میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ فی الوقت جواب کی منتظر تھی تب میں نے کہا، ''پوچھئے! لیکن اِس وقت ایک سے زیادہ نہیں۔''

'' آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟'' اُس کی نگاہ میرے چہرے پر مرکوز تھی۔

مجھے لگا کہ لڑکی دیکھنے آئی چالاک عورت کی طرح وہ کچن اور باتھ روم بھی دیکھ لینا چاہتی ہے تب میں نے کہا، ''محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ جیسے پیدائش کے بعد بچے اور والدین میں، شادی کے بعد میاں اور بیوی میں اور......''

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، ''میں تو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا جیسی محبت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''میں اُن خوش نصیبوں میں شامل نہیں۔'' میرا لہجہ خشک اور سپاٹ تھا۔

''لیکن حسین خواب تو دیکھا ہو گا یا پھر کسی نے آپ کو اپنے دل کا شہزادہ بنایا ہو گا؟ پلیز! سچ بولیے گا۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی، ''مجھے کوئی صدمہ نہیں ہو گا۔ میں سچ کا سامنا کر سکتی ہوں۔''

خاموشی طویل ہونے لگی تب اُس نے کہا، ''خاموش کیوں ہیں؟ میں نے کہا نا، سچ کا سامنا کر سکتی ہوں۔'' اُس نے مجھے بھروسا دِلایا۔

'' تو سنو! میں نے کوئی حسین خواب نہیں دیکھا۔ میرا تعلق کسی چاند سے نہیں رہا اور نہ کوئی پپیہے کی طرح مجھے آواز دے رہی ہے۔'' میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے لگا کہ میں خزاں رسیدہ پتّوں پر دَبے پاؤں چل کر بے آواز نکلنے کی حماقت کر رہا ہوں۔

''آخر کیوں؟......'' اُس کا لہجہ مشکوک تھا۔

وہ ماہرِ نفسیات کی طرح میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی تب میں نے کہا، ''میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔افرادِ خاندان کو غربت کی دلدل سے نکالنے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔یہی میرا مشن تھا، جس میں کامیاب ہوا۔ٹم ٹم سے جُتا گھوڑا چاہ کر بھی دائیں، بائیں اور پیچھے نہیں دیکھ پاتا، اسی سبب۔''

میں تھوڑی دیر خاموش رہ کر اُس کا ردِّعمل دیکھنے لگا تھا۔اُسے گمان و یقین کے درمیان معلّق دیکھ کر میں نے کہا، ''زندگی کے کینوس پر صرف شوخ رنگوں کا ہی استعمال نہیں ہوتا۔سپنے کو ساکار بنانے کا جنون کبھی کبھی آدمی کو تپتے ریگستان میں لا کھڑا کرتا ہے۔پھر پوری زندگی تشنہ لبی اور بھٹکاؤ کی نذر ہو جاتی ہے۔جانِ من! ریشمی دھاگے میں غلطی سے بھی گرہ لگ جائے تو وہ گانٹھ کھولے نہیں کھلتی......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''عشق و محبت عطیہِ ربّانی ہے۔خدا سب کو عاشق کا دل اور معشوق کا قُرب عطا نہیں کرتا۔خواب دیکھنے والا ہی زندگی کو خوش رنگ بنا دیتا اور عاشق ویران دل میں بھی زعفران کی کھیتی کر سکتا ہے۔''

پُرسکوت فضا میں پپیہے کی پُکار پھر شگاف لگانے لگی تب وہ لیٹ کر چاند کو دیکھتی ہوئی پپیہے کی پُکار میں اپنی صدا محسوس کرنے لگی۔مجھے لگا، وہ پانی ہے اور میں اُس پر تیرتا مٹّی کا دیا۔ساتھ ساتھ اور الگ الگ بھی۔یہ سمجھتے مجھے دیر نہیں لگی کہ یہ رات بھی اُسی کے نام مخصوص ہے اور گلابی لباس اُسے پسند ہوگا۔پھر میں وہ بچہ بن گیا، جو عاشق و معشوق کے مِلن میں رخنہ ڈال کر خوش ہوتا ہے۔میں نے کہا، ''یقیناً تم نے کوئی حسین خواب دیکھا ہوگا۔کسی کو چاہا ہوگا یا پھر کسی نے تمھیں اپنے دل کی ملکہ بنایا ہوگا۔کسی کو چاہنا یا کسی کا منظورِ نظر ہونا اپنے بس میں نہیں۔بے کھٹک تم بھی اپنے دل کی بات مجھ سے سا جھا کر سکتی ہو۔''

وہ بولی، ''بیشتر دوشیزاؤں کے دل میں خوابوں کا شہزادہ ہوتا ہے۔لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میری آواز جاں بلب مریض کی کراہ جیسی تھی۔

''لیکن سب خوش نصیب نہیں ہوتیں۔'' اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی، ''آپ مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھے۔لیکن......''

''جانِ من! لیکن کیا؟'' میرا تجسس بجھتے چراغ کی طرح بھبھک اُٹھا تھا۔

اُس نے مُسکرا کر کہا، ''لیکن اب آپ اچھے لگنے لگے ہیں۔''

اعتماد کی جلتی چِتا کی بو میرے نتھنوں میں سما گئی۔اُس نے بیٹھ کر جوڑا بنایا۔پھر وہ میرے اُداس چہرے پر ایک نظر ڈال کر بولی، ''ایسا ہوتا ہے۔آپ نے بھی بے میل جوڑوں کو ہنستے بولتے اور خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھا ہوگا۔سچ مچ شادی کے بعد میاں بیوی میں محبت ہو جاتی ہے۔یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔بلّی کتّے بھی ساتھ ساتھ رہنے لگیں تو ایک ہی تھالی کٹورا میں مل بانٹ کر کھانے پینے لگتے ہیں۔''

اُسے لگا کہ وہ رَو میں زیادہ بول گئی ہے۔اُس نے فوراً ایک بوسہ ثبت کر کے مجھے یہ بھروسا دِلایا کہ اب میں واقعی اُسے اچھا لگنے لگا ہوں۔پھر اُس نے حسبِ عادت جوڑا کھول کر میرے بازو پر سر رکھا اور سینے سے چپک کر آنکھیں موند لی تھی۔میں نے چاند کو دیکھا۔مجھے لگا، وہ بھی مجھے رقیب کی طرح دیکھ رہا ہے۔

خاموشی فضا میں تیرتی ہوئی کُہرے کی طرح دبیز ہونے لگی تھی۔پپیہے نے پھر چُپّی سادھ لی تھی۔کھانستا ہوا بوڑھا سو گیا تھا۔وہ بھی سو چکی تھی۔لیکن میں جاگ رہا تھا۔میرا بھرم ٹوٹ چکا تھا۔سینے سے لگ کر سونے کا بھید کھل گیا تھا کہ وہ اپنے شہزادے سے ہم آغوش ہو کر سکونِ قلب حاصل کرتی ہے۔یہ سوال پھانس کی طرح ذہن و دل میں چُبھ کر اذیّت دینے لگا کہ وہ شہزادہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں نے بندر کی طرح زندہ زخم کی پپڑی نوچ لی تھی۔

میری نیند اُس وقت ٹوٹی جب سورج کی نرم کرنیں پتّوں سے راہ نکال کر چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔میں کس پہر تک جاگتا رہا، یہ معلوم نہیں۔انگڑائیاں لے کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔جنگل کب کا جاگ چکا تھا۔درخت سے اُتر کر میں جھرنے کی جانب جا رہا تھا کہ اچانک کھڑکھڑاہٹ اور پھُنپھ کار سنائی دی۔میں کھڑا ہو گیا۔جھاڑی سے چند گز کے فاصلے پر نیولا اُچھلا۔وہیں پھن پھیلائے مورچہ سنبھالے سانپ نظر آیا۔تماش بینی کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔پھر بھی صبح صبح یہ لڑائی مجھے ناگوار لگی۔اِس خیال سے مجھے کوفت ہونے لگی کہ آج پوری دنیا میں بقا اور برتری کی جنگ جاری ہے۔یہ دونوں بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔نیولا بھوک مٹا کر اور سانپ جان بچا کر۔یہ لڑائی سرحدی جھڑپ جیسی ہے، جس میں فتح و شکست طے شدہ نہیں ہوتی۔میں نے ایک روڑا جھاڑی کی جانب اُچھالا۔نیولا پھر اُچھلا۔اب اُس کی نگاہ مجھ پر بھی تھی۔سانپ ٹَس سے مَس نہیں ہوا۔میں نے دوسرا روڑا نیولے کی جانب اُچھالا تب وہ مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھتا ہوا نشیب میں اُترنے لگا۔پلک جھپکتے سانپ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔عارضی جنگ بندی مسئلے کا حل نہیں۔یہ سوچ کر میں چل پڑا۔ایک پھل دار درخت پر بندروں کا جُھنڈ اُچھل کود کر اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔گرتے پھلوں کو چوکنّے چوپائے اور گلہریاں کھا رہے تھے۔مل بانٹ کر کھانے کا یہ منظر مجھے اچھا لگا۔سچ مچ جنگل سب کو پناہ دیتا اور لکڑہارے کو بھی روزی فراہم کرتا ہے۔

ایک جگہ سُست رو پانی میں جنگل کا عکس دیکھ کر میں اپنا سراپا دیکھنے لگا۔اپنا حلیہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔بنکر سے نکالے گئے صدّام حسین کی طرح افسردہ چہرہ، دراز زلفیں، بے ترتیب داڑھی مونچھ، سیاہ حلقوں میں گردش کرتیں آنکھیں اور خشک پپڑی زدہ ہونٹ۔میں نے جلدی سے ہتھیلیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ہتھیلی کی لکیریں نمایاں اور سوکھی چمڑیوں میں اُبھری نسوں کا جال سا بچھا تھا۔مجھے لگا، میری صحت نے نادان بچے کی طرح ٹیلے سے نشیب کی جانب دوڑ لگائی ہے۔

میں جنگل سے مانوس ہو چکا ہوں یا پھر جنگل نے مجھے قبول کر لیا ہے۔اِسی سبب کرب و کسک میں پہلے جیسی شدّت نہیں رہی۔البتہ مجھے یہ پتا نہیں کہ زندگی کے کتنے دن خرچ ہوئے، آج کون سا دن اور تاریخ ہے۔

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

''پتھر شہر کی سوئی ہوئی کہانی''

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

دوستو یہ ایک اُجڑے دیار، اک خانماں برباد شہر کی کہانی ہے۔اس کہانی میں شہر کونسا ہے، یہ شہر کس ملک میں بستا ہے، اس بھید کو جانے دیجیے!

آپ اس کی کہانی جب پڑھیں گے تو یوں محسوس کریں گے گویا آئینے کے سامنے کھڑے ہیں اور بے اختیار چلا اُٹھیں گے یہ تو میرا شہر ہے، یہ تو میرے دیس کی کہانی ہے!

اپنے بچپن میں آپ نے پرستان اور ایسے دور دراز دیسوں کی کہانیاں تو پڑھی ہوں گی جو کسی مکروہ جادوگر کے جادو کے زہر سے نیلے منجمد ہو گئے، ہر شخص پتھر کا بن گیا، بس فرق یہ تھا کہ اُن اجڑے، پتھروں کے شہر میں، اُن پتھروں کو چھونے، شہزادی کو بیاہنے کوئی شہزادہ آتا اور ہر پتھر کو اپنے مسیحائی لمس سے زندہ کر دیتا!

مگر اب اِن شہروں میں۔۔۔آپ کے۔۔۔میرے شہر میں کوئی شہزادہ نہیں آتا!

اَب یہاں شہزادے خود جادوگر کا سانس رکھتے ہیں!

یہ سانس جس کو چھوتی ہے اُسے نیلا کر دیتی ہے!

منجمد پتھر کا مجسمہ بنا دیتی ہے!

کیا آپ نے کبھی کوئی پتھر ہوا شہر دیکھا ہے!!

اِک ایسا شہر جہاں بے حس، زہر کے سانس سے نیلی ہوتی مورتیاں رہتی ہیں!

دیکھا ہوگا آپ نے! ضرور دیکھا ہوگا! مگر دیکھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا!

کیونکہ عین ممکن ہے آپ بھی اسی شہر کے باسی ہوں اور کسی پتھر کے مجسمے میں بدل چکے ہوں!

اور جناب مجسمے محسوس کرنے، حالات کا ادراک کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں!

وہ یہ جان ہی نہیں پاتے کہ وہ پتھروں کے شہر میں خود اِک سنگی مجسمے میں بدل چکے ہیں!

ایسے شہر کہانی بن جاتے ہیں!

ان کہانیوں کو کوئی اور پڑھتا ہے!

اس شہر کی کہانی کون پڑھے گا؟!

یہ شہر۔۔۔جو دیکھنے میں زندہ حقیقت ہے۔۔۔سڑکوں پہ ہارن بجاتے موٹر سائیکل، جاگتی گاڑیاں، دھواں چھوڑتے ٹرک۔۔۔ہوا کے دوش پہ تیرتے بائیسکل، رینگتی ہوئی گدھا گاڑیاں رواں دواں ہیں۔۔۔

فیکٹریوں کی چمنیاں دھوئیں کے بادل چھوڑ رہی ہیں۔۔۔کپڑوں سے لدے ٹرک اور ٹرالر انجانی سمتوں، دور دراز کے دیسوں کو پہنچانے، بندرگاہوں کی سمت دوڑ رہے ہیں! انہی ٹرکوں کے درمیان کہیں پُر اسرار سے لوڈر بھی ڈھٹائی آمیز طمطراق کے ساتھ موجود ہیں!

کون نہیں جانتا کہ ان لوڈرز میں سمگلڈ کپڑا اور دھاگا موجود۔۔۔جو اس شہر کی، اس شہر کے دیس کی معیشت کو کسی جونک کی طرح چوس رہا ہے، دیمک تنے کو کھوکھلا کر رہی ہے!

مگر کیا فرق پڑتا ہے؟!

شہر کے ہوٹلز آباد ہیں۔۔۔ان میں مردہ جانوروں کی برآمدگی کے باوجود نہ ہوٹلوں کو کچھ فرق پڑا نہ کھانے والوں کو، سائن بورڈ اور ٹھکانے بدل۔۔۔ نئے بہروپ اوڑھ کر دُکانیں پھر سج گئیں۔۔۔مگر کھانے والے تو وہی تھے۔۔۔ حیرت کہ اُن کی لذت طعام و دہن کو نہ کوئی دھچکا لگا نہ صبر کے نقطۂ انجماد کو یہ پگھلا سکا! چھوٹی فیکٹریاں گیس اور بجلی کے نایاب اور کمیاب ہونے سے بند ہو گئیں۔۔۔

متوسط طبقہ جو زندگی کے ایک دھکے سے پیداواری طبقے میں جا کھڑا ہوا تھا، دوبارہ غریب ہو گیا۔

غریب مزدور جانے کس خود کار عمل سے خود پتھر ہو گیا یا جادو کے نیلے سانس نے اس کو پتھر کر دیا!

اس راز کا ہنوز پتہ نہیں چل سکا!

مگر شاید اسی عمل میں اُس کی بقا کا راز پنہاں تھا۔۔۔بالکل ویسے ہی جیسے کینچوے، چھپکلیاں و اِس نوع کے جانور سخت جاڑے میں سو جاتے ہیں!

مگر یہ کہانی تو نہ ہوئی۔۔۔

یہ تو اک ازلی عادت کی بات ہوئی!

کہانی کب شروع ہوئی تھی؟؟!

کہانی تو شاید اُس وقت ہی شروع ہو گئی تھی جب شہر وجود میں آ گیا تھا!

بالکل ویسے ہی جیسے نانی کہانی سناتی تھیں۔۔۔ایک تھا پھول بادشاہ۔۔۔بڑا بہادر، دلیر، نیک دل۔۔۔بہت بڑا بادشاہ۔۔۔تیرا میرا بادشاہ۔۔۔مگر بے چارہ بادشاہ بے اولاد تھا۔۔۔آخر اِک سادھو کے دیے پھول کی کرامت و دعا سے بادشاہ کے آنگن میں سچ مچ کا پھول کھلا۔۔۔

تو اصل میں کہانی یہاں سے شروع ہوتی تھی!

تو اس شہر کی کہانی کب شروع ہوئی تھی؟!

اس کے وجود میں آنے کے فوراً بعد کیا کہانی نے جنم لے لیا تھا؟!

ہاں۔۔۔کہانیاں جنم لے کر پھر سو بھی جاتی ہیں!

کہانیاں بھی تو بچوں جیسی معصوم ہوتی ہیں، بے پرواہ، اپنی مرضی سے سوتی، جاگتی ہیں۔۔۔اور ایک دم ایسا خطرناک موڑ یا کروٹ لیتی ہیں کہ دم اٹک

جائے۔۔۔کوئی جان سے چلا جائے!

مگر کہانی کو کب اس کی پرواہ ہوتی ہے!

اس سوئے ہوئے محل کی۔۔۔ اِس پتھر ہوئے شہر کی کہانی بھی اچانک جاگ اُٹھی تھی۔۔۔

سارا شہر نیلے سنگی مجسموں میں تبدیل کہانی جاگنے کے بعد ہوا تھا یا کہانی کے ساتھ پہلے ہی سو رہا تھا۔۔۔!

اِس راز سے بھی ہنوز پردہ نہیں اُٹھ سکا!

مگر جب اس جادوئی شہر کی۔۔۔ ظاہر میں زندہ، بطان سنگی شہر کی۔۔۔کہانی نے کروٹ لی تو گویا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

مگر کیا حقیقت میں ہنگامہ برپا ہوا تھا؟!

کیونکہ شہر تو سارا سو رہا تھا۔۔۔ جادو کے زہریلے سانس سے نیلا ہو کر منجمد ہو گیا تھا!

مگر شاید۔۔۔کہانی نے ہنگامہ کہانی کار کے وجود میں کیا تھا!

شاید کچھ کہانی کار نیلے سانسوں کے سم قاتل سے اپنے زمینوں کو بچا کر رکھ پاتے تھے!

وہ اگلے وقتوں کو امانت سونپنے کے لیے محافظ و امین ٹھہرائے گئے تھے۔۔۔اس کہانی میں کائنات کے سب سے قدیم کہانی کار نے اُنہیں یہی رول تفویض کیا تھا کہ وہ ان سوئے شہروں کی کہانیاں لکھیں!

وہ ہر پُر آشوب دور میں یہی کرتے آئے تھے!

وہ کبھی بانگ دہل صدائیں بلند کرتے ! سڑکوں کے رش میں مجذوبوں کی طرح آوازیں لگانے لگتے!

کبھی کہانیاں لکھتے!

موت کے سفید صفحے پر کالے مقدس حروف کشید کرتے! اس جرم کی پاداش میں کبھی پابند سلاسل کیے گئے، کبھی زہر پیالا پیا، اور کبھی پھانسیوں کے جھولے پر ڈول گئے!

مگر شہر ہنوز سوتا رہا! زندگی کی حرارت کے باوجود موت کی زردی کی نحوست نے سارے شہر کو لپیٹ رکھا تھا!

پتھر ہوئے شہر میں مگر کہانی بیدار ہو چکی تھی کہانی کار کے ساتھ اور اک خوفناک موڑ لینے کو تیار تھی!

کہانی کا پہلا موڑ۔۔۔کیا اس کو پہلا کہنا مناسب ہوگا؟؟۔۔۔مگر قارئین آپ کی سہولت کے لیے اسے پہلا موڑ سمجھ لیجیے ورنہ کہانی بہت سی بیت چکی ہے، بہت سے موڑ مڑ کر ماضی کی اندھی کھائی میں گر چکی ہے!

تو ہم اِسے ہی پہلا موڑ کہیں گے، یہ پہلا موڑ اُس سڑک پہ وقوع پذیر ہوا جو اِک اندھی تقلید کی صورت معتقدین کو انعام کی گئی تھی!

جی ہاں۔۔۔کیا آپ جانتے ہیں کہ سڑکیں بھی انعام کی جاتی ہیں؟!

دراصل کہانی اپنے موڑ کے ساتھ اس سنسان سے راستے پہ واقع ایک فیکٹری کی جانب مڑ گئی تھی۔۔۔ یہ شہر کے اِک نئے نئے اُبھرتے ہوئے گروپ کا یونٹ تھا اور اس کا افتتاح مالکین نے اپنے پیر صاحب سے کروایا تھا۔۔۔کیا افتتاح تھا۔۔۔کیا استقبال تھا۔۔۔ پیر صاحب تشریف لائے تو اُن کے ہر قدم پہ ایک بکرا قصائی کے ہاتھوں قربان ہوتا چلا گیا۔۔۔ جتنے قدم راستے کے اُتنے بکرے۔۔۔ پھولوں سے اُن کو تول دیا گیا۔۔۔قیمتی ہدیے پیش کیے گئے۔۔۔اُن کے ہاتھ سے عمرہ پر چیاں نکلوائی گئیں اور مارکیٹ کے جن خوش نصیبوں کے نام نکلے، ان کو پیر صاحب کی ''برکات'' کے طفیل عمرہ ٹکٹ عطا کیا گیا۔۔۔!

اِسی پہ بس نہیں ہوئی۔۔۔مالکین نے اپنے کاروبار میں پانچ فیصد شیئر بھی پیر صاحب و اہل خانہ کے نام مخصوص کر دیا تھا۔۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اُبھرتا گروپ پیر صاحب کے خاص مریدوں میں شمار ہونے لگا تھا۔۔۔ اُن کی نظر کرم وعنایت مالکین کے ہمراہ تھی۔۔۔ پیر صاحب کی زیرک نگاہ ان کی تاجرانہ صلاحیتوں کو بھانپ چکی تھی۔۔۔اسی لیے ہر موقع پر جب ان کو مدعو کیا جاتا تو وہ بنفس نفیس تشریف لاتے۔۔۔اور اب اس فیکٹری کے افتتاح پہ بھی انہوں نے بڑے جلال سے فرمایا تھا ''یہ علاقہ سنسان نہیں رہے گا۔۔۔ یہاں بہت بڑی چوڑی سڑک تعمیر ہوگی انشاء اللہ'' اور چند برسوں میں ہی پیر صاحب جب فیکٹری جو کہ اب پوری مل میں بدل چکی تھی، تشریف لائے تو اپنے اُسی جلال میں فرمایا ''دیکھئے اللہ جلا شانہ نے اس عاجز کی دُعا کو قبول فرمایا۔۔۔ یہ ویرانہ کیسا آباد ہوا۔۔۔سڑک تعمیر ہوئی۔۔۔فیکٹری مل میں بدل گئی۔۔۔ اردگرد ملز اور کالونیاں آباد ہو رہی ہیں۔۔۔''

یہ سُن کر فضا ''مرحبا، اللہ اکبر'' کے عطر بیز نعروں سے گونج اٹھی!

یہ اور بات ہے کہ پیر صاحب کے داماد وفاقی وزیر تھے اور یہ سڑک اُن کے خاص حکم و تگ و دو پہ بنائی گئی تھی۔ اس کے لیے کن زرعی زمینوں کو قربان کیا گیا۔۔۔کن اہم راستوں کو بدل کر شہر کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔۔۔ کتنی قیمتی زمینوں کو کوڑیوں کے بھاؤ مالکین کو فروخت کر دیا گیا۔۔۔ یہ کہانی الگ تھی جو کسی اور شاہراہ پہ جا نکلتی تھی!

مگر اُس دن اس سڑک پر پیر صاحب کے فضائل و برکات سے مرعوب ہو کر تین اور بڑے گروپس نے اُن کے ہاتھ پہ بیعت کی تھی اور اس سڑک کی خوشی میں کاروبار میں اُن کی عقیدت کا حصہ دو فیصد مزید بڑھا دیا گیا تھا!

مالکین کے نوخیز بیٹے نے جو جذباتی تقریر کی اُس کا لب لباب یہ تھا کہ اُن کو جو بھی عطا ہوا وہ اُن کے پیروں کا صدقہ ہے! اور جو وہ پیش کر رہے ہیں وہ تو بس اِک نذرانہ عقیدت! مالکین شہر میں خود پیر متبادل تھے۔ شہر کے کئی مراکز میں وہ مفت لنگر تقسیم کرتے تھے، خانہ خدا میں روز اک بڑا دسترخوان بچھتا تھا اُن کے نام سے!

سو بے شمار عقیدتیں روز خود اُن پہ نچھاور ہوتی تھیں۔۔۔

لوگ جھولی بھر بھر اُن کو دعائیں دے کر جاتے۔۔۔

اُنہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ اپنی ملوں کا خام مواد

سمگل کرتے تھے یا ٹیکس چوری کرتے تھے۔۔۔اہم یہ تھا کہ اس گروپ کی برکت وحرکت سے اُنہیں ایک وقت کی فری روٹی دستیاب تھی!

پیر صاحب کی برکات کا فیض جاری تھا، رَب بھی مہربان تھا!

حکومتوں کے بدلاؤ میں صوبے کا گورنر بدل گیا۔۔۔ نیا گورنر اپنی طرز کا شہزادہ تھا۔۔۔وہ اپنی زنبیل میں بہت سے سحر اور تماشے بھر کر لایا تھا۔۔۔ یہ تماشے عجب منوں کاری کرتے۔۔۔انجما دکا نقطہ مزید بڑھادیتے!

اُس نے اپنے اختیارات کے مرکز میں پرکار کی نوک رکھی اور دائرے کی حد سے باہر ایک اور بڑا دائرہ کھینچا!

اُسے روک کون سکتا تھا۔۔۔آخر وہ مقدس وادیوں سے درآمد شدہ گورنر تھا!

اپنی جائیداد، لوٹ مار، کرپشن سے کمایا مال، گورنر نے اکٹھا کیا، بینکوں سے غیر قانونی قرضے دلوائے گئے اور اپنے پسندیدہ گروپس کو نہ صرف نوازا گیا بلکہ سیاسی اثرورسوخ بھی آزمایا گیا۔

جن گروپس کو نوازا گیا اُن میں یہ بیعت یافتہ، انعام یافتہ گروپ بھی سرفہرست تھا اور گورنر عُرف شہزادے کا شیئر بھی اِس گروپ کے کاروبار میں سب سے زیادہ تھا۔۔

نامعلوم وجوہات کی بنا پر دیگر گروپس جو اتفاقاً ٹیکسٹائل کی صنعت سے وابستہ تھے، اُن سے یکدم گورنر جو فی الحال شہر کا بے تاج بادشاہ بنا بیٹھا تھا نے اپنا حصہ نکال لیا اور مزید قرض بھی نامنظور کر دیے گئے!

نتیجتاً وہ سب گروپ دیوالیہ ہونے کے قریب جا پہنچے! کچھ اپنی مشینیں اٹھا کر سستی مزدوری کے لالچ میں اِدھر اُدھر کے دیسوں کو پہنچے اور کچھ نے اپنے حصص فروخت کر کے کاروبار کو مختصر کر کے سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود ہی رہا۔۔۔

حکومت وطاقت گروپس کے جتھے سے منتقل ہو کر بیعت یافتہ گروپ میں منتقل ہو رہی تھی!

دیکھتے ہی دیکھتے یہ انعام یافتہ گروپ شہر کی فضا پہ چھا گیا۔۔۔اپنے کالج، یونیورسٹی، گھی کی ملیں اُسی خام مواد سے تیار ہوتی۔ صابن کی فیکٹری۔۔۔ اور گرتی ہوئی مارکیٹ میں ٹیکسٹائل مِل۔۔۔جس کا مقابل دور تک کوئی نہ تھا!

اس کے بعد فتح کا اگلا مورچہ اپنا اخبار اور اس کے بعد اپنا ٹی وی چینل تھا!

ٹی وی چینل۔۔۔برقی میڈیا۔۔۔صحافت۔۔۔جو حکومت کا سب سے اہم ہتھیار بن چکا ہے۔۔۔اس میدان کی فتح از بس ضروری۔۔۔اس چینل کو پرستان کی مقدس وادیوں کی اشیر باد حاصل تھی۔ سوسیاہ کو سفید دکھانا، زندگی کو موت کہنا کوئی مشکل کام نہ تھا اِن کے لیے!

یہاں آ کر سوئے شہر کی کہانی بھی سو جاتی ہے! غلامی اپنے شہزادوں کی ہو یا غیروں کی، شہر اور ان کی کہانیاں سو جاتے ہیں!

مگر کہانی کار آپ سے ایک سوال پوچھتا ہے، کیا آپ کو ایسٹ انڈیا کمپنی یاد ہے؟؟؟

- بقیہ -

مہاجر

اُس دن قے اور دست نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میں آنکھیں موندے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ موت کا یقین ہوتے مجھے گھر پریوار کی فکر ستانے لگی تھی۔ بیگانے سے اپنوں کی یاد شدّت سے آنے لگی۔ مجھے لگا کہ رو رو کر بچوں کا بُرا حال ہو گیا ہوگا۔ وہ بھی نادم ہو کر ٹوٹ چکی ہوگی۔ اُس کی چٹانی ضد برف کی طرح پگھلنے لگی ہوگی۔ اُس پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگی۔ اُس کے کان اور بھی چوکنّے ہو گئے ہوں گے۔ وہ ہواؤں کی دستک پر بھی خود دوڑ کر دروازہ کھولنے جاتی ہوگی۔ علیحدگی اور جدائی کا غم نا قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ سینے سے لگ کر سکون پانے کے لئے مضطرب ہوگی۔ میں چیخ پڑا تھا۔ نہیں، نہیں۔ یہ سوچ میرا واہم ہے یا خوش گمانی یا پھر صحرانوردی کی اذیّتوں کا زائیدہ جواز، جو مجھے ذلّت بھری زندگی میں لوٹنے کے لئے اُکسا رہا ہے۔ وہ جھکنے، ٹوٹنے اور نادم ہونے والی نہیں۔ اذیّت دہی میں اُسے مزہ آتا ہے۔ اَنانیت اُس کا خاصّہ ہے۔ اُس کی ضد پر ابلیس بھی نازاں ہوگا۔

نقاہت نیند کی سوغات لاتی ہے۔ میں کتنی دیر تک سوتا رہا، مجھے معلوم نہیں۔ نیند ٹوٹی تب میں درخت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ اچانک میری نگاہ کالی چیونٹوں کی رواں قطار پر مرکوز ہو گئی، جو باہمی اشتراک سے ایک مکوڑے کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا، کاش! اس وقت وہ میرے پاس ہوتی تب میں اُسے یہ منظر دِکھا کر سمجھاتا کہ گھر پریوار بھی باہمی اشتراک اور میل محبت سے چلتا ہے۔ ایثار واعتماد اور اتصالِ جسم خوشگوار زندگی کو استحکام بخشتے ہیں۔ جب کہ تم ریشم کے کیڑے کی طرح خود ساختہ حصار میں جینا چاہتی ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے ساون کے آوارہ بادل ہم آغوش ہوئے۔ پھر تیز بارش شروع ہو گئی۔ میں درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں بارش تھم گئی اور تیز دھوپ نکل آئی۔ پرندے پنکھ پھڑ پھڑا کر اُڑنے لگے تب میرے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ صرف ایک بار میں گھر جاؤں اور ایک نظر سہاگن بیوہ کو دیکھ آؤں۔ دل کی مینا بول اُٹھی کہ گھر واپسی کی یہ خواہش مُہاجر کی فطری للک ہے۔ پھر اُس نے پوچھا کہ گھر واپسی سے عہد شکنی نہیں ہوگی؟ اُس کے عیش میں خلل نہیں پڑے گا؟ میں نے چپّی سادھ لی کہ فی الفور جواب دینا آسان نہیں تھا۔

☆

''دل کی کتاب''

محمودالحسن
(راولپنڈی)

کبھی وہ شاد کرے دے گا کبھی ناشاد کر دے گا
کرم ہو گا کبھی اُس کا، کبھی بیداد کر دے گا

خبر کیا تھی اک ایسا نقش بھی اُبھرے گا دنیا میں
جو بے معنی نظامِ مانی و بہزاد کر دے گا

کوئی تو زندگی کی رُوح پھُونکے گا زمانے میں
کوئی تو تازہ رسمِ حیدرؓ و سجّاد کر دے گا

کسی کو دیکھ کر سب غم کے مارے اس طرح خوش ہیں
کہ جیسے وہ کرم کی بستیاں آباد کر دے گا

ہمیں خود قتل کرنے کی اذّیت کیوں اُٹھاتے ہو
ذرا سا کام ہے یہ بھی کوئی جلاّد کر دے گا

بُرا کیا ہے چلو چل کر اُسے بھی آزماتے ہیں
سُنا ہے وہ علاجِ خاطرِ ناشاد کر دے گا

زمانہ کے ستم تو کارفرما ہیں مرے دل پر
ترا لطف و کرم بھی اُن کی کچھ امداد کر دے گا

نہیں ہے فطرتاً صیّاد بھی ایسا بُرا شاید
پرندوں کے پَروں کو کاٹ کر آزاد کر دے گا

وہی روکے گا اب تو یُورشِ سیلِ حوادث کو
عزائم کو جو پختہ صورتِ فولاد کر دے گا

اگرچہ ہم بھی ہیں خوددار لیکن یہ حقیقت ہے
وہ دیکھے گا ہمیں اور مائلِ فریاد کر دے گا

نہ ہو مایوس اے محمودؔ وہ دِن آنے والا ہے
جو تیری زندگی کو قید سے آزاد کر دے گا

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

پڑھو گے غور سے دل کی کتاب ، مشکل ہے
ہر ایک سطر کا مطلب جناب مشکل ہے

کسی نے درد کی گہرائیاں نہیں لکھیں
لکھے گا کون، حساب وکتاب مشکل ہے

میں اُس کے باغ میں کیوں چھُپ چھپا کے آیا ہوں
کہ لاؤں توڑ کے کالا گلاب، مشکل ہے

یہاں تو ٹوٹنے والے ہی دل نہیں ٹوٹے
پہاڑ ٹوٹ بھی جائیں ، جناب مشکل ہے

سکون پائے گی چاہ و طلب کی بے تابی
قرار پائے گا یہ اضطراب ، مشکل ہے

کوئی خلوص نہیں آپ کی قیادت میں
اب ایسے حال میں تو انقلاب مشکل ہے

بھٹک گیا ہے کہیں خار زار میں ثاقبؔ
پلٹ کے آئے گا خانہ خراب مشکل ہے

○

غالب عرفان

(کراچی)

وہ میرا ہم سفر تھا   مگر نا معتبر تھا

گوارہ ہی نہ تھا جو   وہی مد نظر تھا

جہاں گویائی بکھری   صداؤں کا بھنور تھا

تھی کچھ مٹی بھی چکنی   تو کچھ دستِ ہنر تھا

قفس کا در کھلا اور   ہواؤں کا سفر تھا

جوانی کا فسانہ   بہت ہی مختصر تھا

جہاں ملبہ پڑا ہے   وہ قصرِ مقتدر تھا

حدِ صحرا سے آگے   سمندر زور پر تھا

کئی صدیوں کا حاصل   وہ لمحہ مختصر تھا

مرا کارِ جنوں بھی   جنونِ کارگر تھا

مجھے پہچانا اس نے   جو خود سے بے خبر تھا

وہی اک زاویہ تھا   جو اک حُسنِ نظر تھا

بجھائی پیاس اُس نے   جو مجھ سے تشنہ تر تھا

پسِ آئینِ عرفاںؔ   دلِ آئینہ گر تھا

○

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

آپ کا انتظار ہے بابا
کون اب غم گسار ہے بابا

جھوٹ اتنا ہے آج طاقتور
راستی شرمسار ہے بابا

اب تو پردے سے آیئے باہر
اک جہاں سوگوار ہے بابا

موسمِ گل کے بدلے گلشن میں
کیوں خزاں نغمہ بار ہے بابا

بن کے محفل میں آپ کی معصوم
رہنا اک ہوشیار ہے بابا

ظالموں کا جو ہے سپہ سالار
آپ ہی کا تو یار ہے بابا

اب سیاست کا فارمولا تو
آٹھ سے بڑھ کے چار ہے بابا

سچ تو یہ ہے کہ آج خطرے میں
آپ کا بھی وقار ہے بابا

آپ کیا کیا کمال کرتے ہیں
گلستاں شعلہ زار ہے بابا

دور گرچہ بہت مناظر ہے
آپ کا جاں نثار ہے بابا

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

اِک یقیں بھی گماں میں شامل ہے
وہ مِرے جسم و جاں میں شامل ہے

مَیں ستارہ اُسی زمین کا ہوں
جو زمیں آسماں میں شامل ہے

بادباں پر ہو اعتماد تو کیا؟
جب بھنور بادباں میں شامل ہے

لامکاں میں مکاں بھی ہے موجود
اور مکاں لامکاں میں شامل ہے

لہر کی دوستی تھی ساحل سے
اب وہ ریگِ رواں میں شامل ہے

تجھ کو کھویا تو تیرا غم پایا
سُود ، کارِ زیاں میں شامل ہے

دل میں جو ہے، زباں پہ بھی ہے وہی
دل بھی میری زباں میں‌شامل ہے

جو مِرے ساتھ چل نہیں سکتا
وہ مِرے کارواں میں شامل ہے

جو کبھی زندگی کا حاصل تھا
اب وہی رائیگاں میں شامل ہے

وہ مِرا دوست ہے اگر تو نسیمؔ
کیوں صفِ دشمناں میں شامل ہے؟

○

عرش صہبائی
(جموں،کشمیر)

کہاں دیرینہ رشتہ توڑتا ہے
ستم کرنا کہاں وہ چھوڑتا ہے

اُبھرتا ہے سفینہ جو بھنور سے
وُہی طوفان کا رُخ موڑتا ہے

بہر صورت بکھر جاتا ہے یہ دل
کوئی ارمان جب دَم توڑتا ہے

مری نظروں میں ہے وہ اک فرشتہ
جو انساں دو دلوں کو جوڑتا ہے

نکھرنا ہے انہیں کل پھول بن کر
عبث نوخیز کلیاں توڑتا ہے

نہیں دریا کی جب کوئی بھی چلتی
وہ پھر ساحل سے سر کو پھوڑتا ہے

کوئی جاتا نہیں ہے ساتھ اُس کے
کہ جب انسان دُنیا چھوڑتا ہے

یہی بنیاد ہے اس زندگی کی
دلوں کے رشتوں کو کیوں توڑتا ہے

نہیں اے عرشؔ کوئی اُس سا ناداں
بزرگوں کا کہا جو موڑتا ہے

○

نعیم الدین نظر

(میر پور خاص)

کوئی سمجھائے اس ستم گر کو
کھا نہ جائیں یہ فاصلے گھر کو

فائلیں سب دبا کے بیٹھا ہے
مال و زر کی طلب ہے افسر کو

تیرے کوچے کی خاک اوڑھوں گا
بھول آیا ہوں گھر پہ چادر کو

شہرِ جاناں کی اک نشانی ہے
چوم کر رکھ رہا ہوں پتھر کو

اپنے بچوں کی دیکھ کر حالت
ماں نے گروی رکھا ہے زیور کو

مطمئن ہوں کہ غیر کے آگے
میں نے جھکنے نہیں دیا سر کو

کس عقیدت سے اک ہوائے گل
رات بھر چومتی ہے اُس در کو

دل میں اپنے چھپا کے رکھتا ہوں
اے نظرؔ کربلا کے منظر کو

○

اشرف جاوید

(لاہور)

وہ ایک شخص ،جو مجھ میں بسا دیا گیا تھا
اُسی کو ،پھر مرا قبضہ دلا دیا گیا تھا

سنا ہے رات کے پچھلے پہر، ثبوتِ سحر
مثالِ حرفِ مکرر مٹا دیا گیا تھا

غنیم شب تھی، جو سورج لپیٹ لے گئی تھی
خلاف دن کے، مگر فیصلا دیا گیا تھا

پسِ غلاف فقط جھریاں تھیں چہروں پر
مری نگاہ سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا

اب اپنی جاں پہ بن آئی،تو کیوں پریشاں ہو؟
مرا کہا تو ہنسی میں اُڑا دیا گیا تھا

یہ سچ ہے!عدل وعدالت سبھی اُسی کے تھے
مگر ہمیں بھی تو ضامن خدا دیا گیا تھا

وہ ،روز بیٹھ کے روتا تھا سامنے میرے
اُسی بہاؤ میں سب کچھ بہا دیا گیا تھا

بتایا تھا کہ شبِ ہجر طول کھینچتی ہے
مگر چراغ تو پل میں بجھا دیا گیا تھا

مجھی کو روند کے آگے نکل گیا آخر!
بھلا سمجھ کے ،جسے راستا دیا گیا تھا

○

”چہارسُو“

خورشیدانوررضوی (اسلام آباد)

کوئی بھی لفظ نہ سیکھا، کتاب رکھتے ہوئے
درونِ شب ہی رہے، آفتاب رکھتے ہوئے
نصاب سارا اسی میں ہے کامیابی کا،
کتاب پڑھتے نہیں ہم، کتاب رکھتے ہوئے
عجوبہ دیکھو ہماری اِس عقل و دانش کا
چُنے تو خار، چمن میں گلاب رکھتے ہوئے
نشے کے عادی ہماری درُوس گاہوں میں،
خزاں رسیدہ، بہارِ شباب رکھتے ہوئے
زمیں سونا اُگلتی، مگر کہاں قسمت!
کسان بھوکے رہیں، برق وآب رکھتے ہوئے؟
سوال اُٹھتے رہے ہم پہ چار جانب سے
جواب دے نہ سکے ہم، جواب رکھتے ہوئے
ملی تھی جیسی بھی اے یار! زندگی ہم کو
گزار لی ہے، کچھ آنکھوں میں خواب رکھتے ہوئے

○

پنہاں

(امریکہ)

کیا عجب صورتِ حالات ہوئی جاتی ہے
شام سے پہلے ہی کیوں رات ہوئی جاتی ہے
خرمنِ جاں ہوئی جب خاک تو بادل آئے
دل جلانے کو یہ برسات ہوئی جاتی ہے
کون کیا کس لئے کیوں کوئی بتاتا بھی نہیں
زندگی وقفِ سوالات ہوئی جاتی ہے
تم کو پا کر تمھیں کھو دیتی ہوں اکثر لیکن
بس مری خود سے ملاقات ہوئی جاتی ہے
شاعری ہے کہ یہ نشتر کی اَنی ہے پنہاں
میری جراحی کے آلات ہوئی جاتی ہے

○

جتندر پرواز

(پٹھان کوٹ، بھارت)

سُکھ دُکھ میں گرم وسرد میں سیلاب میں بھی ہیں
یادیں تمہاری موسمِ شاداب میں بھی ہیں
ہونے لگی شکست جو ہر موڑ پر مجھے
دشمن پتا چلا میرے احباب میں بھی ہیں
دامن کو پاک رکھنے کے حق میں تھا میں مگر
وہ کہہ رہی تھی داغ تو مہتاب میں بھی ہیں
دِلّی سخنوروں کا ہے مرکز مگر میاں
اردو کے کچھ چراغ تو پنجاب میں بھی ہیں
رنگین مرتبان میں یہ خوش نہیں تو کیا
کچھ مچھلیاں اُداس تو تالاب میں بھی ہیں

○

یادوں کی پرچھائیں

منیرہ شمیم
(اسلام آباد)

چھٹی کا دن تھا۔سوچا کیوں نہ آج ایک پرانی الماری کو ٹھیک کیا جائے۔الماری کیا کھولی اندر کا سارا کاٹھ کباڑ باہر نکل آیا۔مٹی سے اٹا ہوا اور ماضی کے سحر میں لپٹا ہوا۔جسے ہاتھ لگاتے ہوئے بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔لیکن دل کہے کہ ایک ایک شئے کو دیکھو،ماضی کا اسرار بھی عجیب شئے ہے،روح کو گھیر لیتا ہے۔

باقی چیزیں تو خیر تھیں ہی۔۔۔مگر سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم چیز جو ملی وہ ایک البم تھا۔بکھری ہوئی یادوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔۔۔جس کی جلد پر ایک خوبصورت سینری بنی ہوئی تھی،رنگین،خوشگوار،نیچرل رنگوں میں۔۔۔سبزہ زار کی طرح جیسے صبح کی ٹھنڈی روشنی میں آنکھیں دیکھ رہی ہوں۔

البم میں زیادہ پرانی تصویریں بلیک اینڈ وائٹ تھیں۔ان تصویروں میں جو عورتیں کھڑی تھیں سب نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں اور عینکوں میں چھپی آنکھیں،مصنوعی مسکراہٹ اور ایک خاص زاویے سے گردن ٹیڑھی کئے اسٹیج پر کھڑی وہ بیگمات انعام تقسیم کر رہی تھیں۔اول،دوئم اور سوئم آنے والوں کو۔۔۔اور کیمرے کی آنکھ ایک ہی نقطے پر رکی ہوئی تھی۔انعام بانٹنے والے کے چہرے پر اور انعام لینے والے کے ہاتھ پر۔۔۔ایک بار بھی کیمرہ ان پر فوکس نہ ہوا۔۔۔وقت کا کیمرہ،نہ فوٹو گرافر کا۔

تصویریں دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگتی ہوں،یہ بیگمات وہی ہیں جو ازل سے بیگمات ہیں۔۔۔آج بھی اُسی طرح اپنی اپنی جگہ،زندگی میں سوسائٹی میں اور اسٹیج پر۔۔۔اور لڑکیاں۔۔۔ایک دن،صرف ایک منٹ کے لیے اسٹیج پر۔۔۔جگہ پانے والی وہ لڑکیاں کہاں ہونگی اور کس طرح ہوں گی۔شاید ان میں سے کچھ استانیاں اور کچھ نانیاں۔۔۔یا کنواری بیٹھی بیٹھی ہی بوڑھی،بے شناخت،کونوں،کھدروں میں پڑی ہوں گی۔بہرحال وہ کبھی نہ کبھی اُس دن کو یاد تو کرتی ہوں گی جب انہیں بھی ان بیگمات کے روبرو کھڑے ہونے کا موقع ملا۔ہو سکتا ہے اس طرح کا ایک البم ان کے ہاں بھی کسی شلف یا الماری میں رکھا ہو۔ان کے تعاقب میں۔۔۔میں بڑی دُور نکل جاتی ہوں۔

ماضی کی کتاب کے اوراق کھولتی ہوں اور زمان و مکان مٹ جاتے ہیں،میں اپنے کالج کے وسیع گراؤنڈ میں پہنچ جاتی ہوں۔کالج کے گیٹ سے اس کی عمارت تک۔۔۔پھر وہ گراؤنڈ جس میں میرے چار سال گزرے۔گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دونوں طرف بڑے بڑے سنبل اور املتاس کے درخت لگے ہوئے تھے۔اور کچھ ایسے درخت بھی جن کا میں نام بھی نہیں جانتی۔۔۔ہاں اتنا یاد ہے کہ جب بہار کے سرخ سرخ اور پیلے رنگ کے پھول کھلتے تو وہ پھول ہمیں امتحانوں کی آمد کا پتہ دیتے،اور فضا میں ایک عجیب روحانی افسردگی سی گھل جاتی۔آم کے پیڑوں میں چھپی کوئلیں بولتیں اور بولے چلی جاتیں،ان کو اداسی میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر دل تڑپ اٹھتا۔ان دنوں کتنے حسین اور اچھے خواب دیکھا کرتے تھے،زندگی کی کامیابیوں کے۔۔۔اس دنیا کو بہتر جگہ بنانے کی آرزو میں۔۔۔گراؤنڈ میں چلتے چلتے کبھی امتحانوں کا ڈر۔۔۔اور کبھی کھیل میں کامیابی کی خوشیاں۔

مجھے یاد ہے ان دنوں ادب کے عشق میں نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔دل میں شعر و نغمہ کی سوغات سجی رہتی تھی۔شعر کا مصرع کتاب پر۔۔۔کسی گیت کا مکھڑا کاپی پر۔۔۔ان نشانیوں میں جو زندگی میں پہلی محبت کی نشانیاں ہوتی تھیں ان دنوں محبت میں ایک دوسرے کو کتاب دینا بہترین تحفہ سمجھی جاتی تھی۔۔۔ہیرے کی انگوٹھی سے بھی زیادہ!

اور سچ بات یہ ہے کہ ان دنوں بہترین کتابوں کی فصل پکی ہوئی تھی۔آج جب پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہوں تو ایسے وقتوں میں سامنے کچھ زیادہ ہی دُھند چھا جاتی ہے۔

ماضی کی اُن پرچھائیوں کے تعاقب میں۔۔۔میں کہیں دُور نکل جاتی مگر کھٹ کھٹ ایڑھی بجاتی میری دوست شہلا کمرے میں آن دھمکی۔

''یہ کیا۔۔۔؟اف یہ گرد سے بھری چیزیں،مائی گاڈ!اتنا پرانا البم''

اس نے میرے ہاتھ سے البم جھپٹ لیا۔

''دیکھو تو کتنی پرانی تصویریں ہیں۔یہ کئی سال پرانا البم اس موہنجوڈارو سے نکالا ہے میں نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔''ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے میں نے کہا،دیکھو یہ مسز رحمٰن ہیں ہماری فزکس کی پروفیسر۔۔۔یاد ہے کیسے اپنی ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی کلاس میں داخل ہوتی تھیں۔کیا پرسنلٹی تھی۔۔۔ہم جو بڑے بے فکرے اور لاپروا خوابوں میں رہنے والے تھے۔زندگی کی دھوپ میں تپ چکے ہیں۔جانے وہ سب کیسی ہونگی۔

میں نے ایک بار پھر البم کے پہلے صفحے پر لکھی تاریخ کو پڑھا اور شہلا سے کہا:

''دیکھو تو سہی کتنا پرانا البم ہے۔کیوں نا اس پر کہانی لکھیں؟''

تم لکھو گی اور ان کی کہانی۔۔۔!اس نے البم میز پر رکھا اور انگلیوں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''میری جاں!ان بیگمات پر تو کہانی روز ہی لکھی جاتی ہے۔اور ان کی تصویریں ہر روز اخبار میں ایک ہی ہیڈ لائن اور ایک ہی پوز کے ساتھ لگی ہوتی ہیں۔''

''میرا مطلب تو گزرے ہوئے وقت پر ڈورڈالنے کا تھا۔''

''کونسا گزراوقت؟ تم اپنا ہی انجام اس البم میں دیکھ لو۔۔۔کتنا پرانا اور کیا کچھ موجود ہے اس میں۔۔۔شامیانے، ٹرافیاں، جلسے۔۔۔لیکن وہ کہاں ہیں جنہیں انعام بانٹے گئے تھے۔وہ کہاں ہیں؟ بس خاک میں پنہاں ہوجانا ہی ان کا مقدر تھا۔اور یہ ہستیاں جو البم کی تصویروں میں اور زندگی کے صفحات میں آج بھی موجود ہیں اسی طرح۔۔۔وہی پرنسپل، وہی مہمانِ خصوصی، وہی صدر۔۔۔معلوم ہوتا ہے، وقت رکا کھڑا ہے گندے پانی کی طرح۔۔۔وہی لان کا سبزہ، وہی تصویریں، وہی مرکز میں جڑے بیگمات کے ٹائم پروف سراپے!''

یہ دیکھو، اس تصویر میں ہمارے کالج کی پرنسپل ایک طالبہ کو انعام کا پیکٹ پکڑا رہی ہیں اور دوسری تکبر سے پیکٹ اٹھا کر آگے بڑھا رہی ہے۔مجھے یاد ہے بیس سال پہلے میں بھی ان کے سامنے جھکی تھی کلاس میں اول آنے کا انعام لینے کے لیے۔

اولڈ سینئر۔۔۔مائنک پرڈٹ کر بولتی ہیں۔ہمیں فقیری اپنانے کی ترغیب دیتی ہیں اور خود کتنی دنیادار ہیں۔

اس نے ایک لمبا لیکچر دیا اور گھڑی دیکھتے ہوئے چل دی۔

میں نے بھی سوچا دفعہ کروان تصویروں کو اور کہانی کو۔۔۔جب یہ الماری کئی سالوں سے کسی بند سینے کی طرح اپنے اندر یہ راز سنبھالے ہوئے ہے تو کیا ضرورت ہے؟ لیکن یہ تاریخ بھی کیسی ناقابلِ فہم ہے، کیسی عجیب شئے ہے، بند ہونے پر آئے تو الماریوں تک بند ہوجاتی ہے اور پھسلنے پر آئے تو ہاتھوں سے پھسل کر دُور سمندر میں جاگرتی ہے۔مگر یہ سمندر، یہ ساحل، یہ جھنڈ اور ندیاں۔۔۔نیچر کی ایک اپنی تاریخ ہوتی ہے۔انسانوں کی تاریخ سے بے نیاز۔۔۔بے پروا۔

کئی سال پہلے یہ بنگال سے خریدا گیا البم الماری میں بند پڑا ہے۔ کون جانے اب تک ڈھاکہ کی کسی الماری میں پنجاب کی کونسی کونسی سوغات رہ گئی ہو۔شاید ایسا ہی کوئی البم وہاں بھی پڑا ہو بہت سی یادوں کو اپنے اندر سمیٹے۔

سوچتی ہوں وہ سب چیزیں جو خوبصورت ہوتی ہیں، دل کو اچھی لگتی ہیں، وہ پاس کیوں نہیں رہتیں۔۔۔دل سے چھین کیوں لی جاتی ہیں۔اب اس سینری والے بنگال کو ہی لے لو بھیگا ساحل، ناریل کے جھنڈ، نمکین چہرے اور ہواؤں کے دوش پر کسی مغنیہ کا لہراتا ہوا وادیوں اور گھٹاؤں میں رس گھولتا ہوا نغمہ۔۔۔وہ مون سون سے لدی گھٹائیں۔۔۔آہ۔۔۔کیا کھو جاتا ہے۔۔۔کیا بچ جاتا ہے، زندگی کے بھید نیارے ہیں۔

سیاستدانوں نے تاریخ اپنی مٹھی میں بند کر رکھی ہے۔جب مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی اور ڈھاکہ کے گلی کوچوں سے زندگی بھاگ کر سڑکوں پر نکل آئی اور فضا میں ہر سو گھٹاؤں کے بدلے بارُود کا دھواں چھا گیا تو تمام کچے پکے ٹانکے ادھیڑ دیئے گئے۔ایسٹ اور ویسٹ کو الگ کر دیا گیا۔ اپنے کچھ نئے قاعدوں کے لیے۔۔۔انہیں لوگوں نے پھر ناخن، گوشت جدا جدا کیے۔۔۔مگر عوام الناس کہلانے والی مخلوق لہو کا نذرانہ دینے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

یہ سوچ کر روح پر اک اداسی سی چھا جاتی ہے اور پرانی چیزوں کو دیکھ کر تو دل یونہی گہری اداسی میں ڈوب جاتا ہے۔۔۔دل کہتا ہے کہیں بھاگ چلو۔۔۔بلکہ میں خود کہتی ہوں۔۔۔اے میرے دل کہیں اور چل۔۔۔

لیکن کہاں۔۔۔کہاں سے نکلوں گی۔جال تو ہر سمت بچھا ہوا ہے۔

جب بنگال اپنا تھا، تو کتنا بڑا آسرا تھا۔تصور کی دنیا میں آس کی پری آنکھیں جھپکتی رہتی تھی۔کیسا رومان سا لگتا تھا۔

اب تو وہاں جانے کے لیے بھی ویزا چاہیے۔

جانے کیوں میرا تخیل ہر وقت تاک میں لگا رہتا ہے۔دیکھو تو اتنی شدید گرمی میں۔۔۔اس کمرے میں مجھے بٹھا کر خود پہنچ گیا بانس کے ٹھنڈے جنگلوں میں، جہاں چنچل ندیاں بہتی ہیں۔

کتنا جی چاہتا ہے میرا۔۔۔کسی ایسی جگہ جانے کو۔۔۔جہاں گھِر گھِر گھٹا چھائے برکھا برسے اور سبزہ زمین کو کبھی ننگا نہ ہونے دے۔

اب اس البم کو ہی دیکھ لو۔۔۔کیسا بھیدوں بھرا ہے۔باہر سے تازہ نیا اور اندر سے پرانا، آسیب زدہ۔۔۔لیکن پھر بھی یہ باہر اور اندر سے کس طرح جڑا ہوا ہے، پرانی مردہ تصویروں اور یادوں کے ساتھ۔

شاید کوئی وقت ایسا بھی آجائے جب نئے چہرے کثرت سے پیدا ہوجائیں اور ان ذروں سے مل کر ایک ایسا چہرہ بن جائے، ہمارے نئے البم کے لیے!

ہمارے رنگین کیمرے کی آنکھ کے لیے اور میرے اداس دل کے لیے کوئی شاداب چہرہ!

''خوشۂ گندم''

جرمنی میں پہلی بار ایک ایسی سُپر مارکیٹ کھلی ہے جہاں بچا ہوا کھانا فروخت کیا جائے گا۔اس مارکیٹ کی خاص بات یہ ہے کہ بچے ہوئے کھانے کی قیمت خریدار اپنی مرضی سے طے کرے گا۔اس سُپر مارکیٹ کا کھلنا ایک ایسے معاشرے کی جانب اچھوتا قدم ہے جہاں کسی شئے کو ضائع کرنا برداشت نہیں کیا جاتا۔جرمنی کے نشریاتی ادارے کی رپورٹر ارین بانوس راؤز کے بقول یہ سماجی شعور کے حوالے سے ایک بڑی تبدیلی کی علامت ہے۔کلون شہر میں یہ اسٹور اپنی نوعیت کا پہلا جبکہ یورپی یونین میں تیسرا ہے۔جہاں سبزی سے لے کر کھانے پینے کی تمام اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ اگر ان اشیاء کو اس طرح فروخت نہ کیا جائے تو یہ کچرے کی صورت میں ضائع کی جاتی ہیں جس سے اضافی اخراجات بھی ہوتے ہیں۔

نشان

وسیم عقیل شاہ
(جلگاؤں، بھارت)

ہاں وہ وہی تھا! جس کے متعلق دنیا کے بیشتر مذاہب کی مقدس کتابوں میں تحریر تھا کہ وہ انسانیت کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا۔ اس کے نام سے اگلی پچھلی تقریباً سبھی قوموں کو ڈرایا دھمکایا جاتا رہا ہے۔ اُس کے ذریعے ہونے والی تخریب کاری سے متعلق لوگ بچپن سے سنتے آ رہے تھے۔ صوفی سنتوں کے وعظوں میں اس کا حلیہ شیطانی شباہت دیتا اور خاص کر اس کے چہرے پر وہ نشان جو اس کی اصل پہچان تھا، سننے والوں پر انجانے خوف کی طرح طاری ہو جاتا۔

میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ وہی تھا اور اپنی گہری سرخ اور کانی آنکھوں سے مجھے ایسے گھورے جا رہا تھا جیسے صدیوں سے مجھے ہی تلاش کر رہا ہو۔ حالانکہ ہال بھرا ہوا تھا۔ یہاں تقریباً سبھی سرکردہ شخصیات کو شہر میں وقفہ وقفہ سے جاری انسانیت کش فسادات پر قابو پانے کے لیے غور و فکر کرنا تھا۔ یوں تو اس میٹنگ میں مجھ جیسے صنعت کار اور سماجی خدمت گار کے علاوہ شہر کے متعدد نامور اور عہدیدار شامل تھے۔ لیکن ان سب سے پرے اس کی بدصورت آنکھیں مجھ پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔

میں بار بار اس سے نظریں چرا کر ادھر ادھر مصروف ہونے کی ناکام اداکاری کرتا اور وہ گھوم کر میرے مقابل ہو جاتا۔ پھر اس کی بے رحم نظریں مجھے آدبوچتیں اور میں کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھتا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز اور جسم کے ہر ریشے سے کپکپاہٹ پھوٹ رہی تھی۔ ایک عجیب سی دھاک پورے حواس پر مسلط تھی۔ جان تھرتھراتی ہوئی ہونٹوں تک آتی اور لوٹ جاتی۔ جتنی جلد ہو سکے میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میٹنگ ختم ہونے کو تھی مگر اختتام پر کچھ پارٹی جیسا ماحول بن گیا تھا جو فلمی گلیمر کی طرح مجھے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن پھر اس سے نظریں ملیں اور میں سہم کر اپنا بیگ لیے کھڑا ہو گیا کہ صدر محفل کا اشارہ پاؤں اور نکل پڑوں۔

اس خلفشار میں ایک اور الجھن جو اسے دیکھنے کے کچھ دیر بعد سے درپیش تھی کہ اگر وہ واقعی 'وہ' نہیں بھی تھا تب بھی میرے باطن میں جانے کیوں اچانک مذہب، عبادت، عقیدے اور آستھا جیسے الفاظ کی ایک جوت جل اٹھی تھی۔ یا یوں کہہ لو کہ اسے اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد دین و مذہب کے تعلق سے میرے نظریات میں بڑی حد تک الٹ پلٹ شروع ہو گئی تھی۔ اس پر میرا حیران ہونا فطری تھا۔

میرا سر پھٹنے لگا، سامنے پیچیدہ سوال تھے۔ میں نے اپنے سہولت بخش مذہب کے کن تقاضوں کو پورا کیا تھا؟ انسانیت جو میرے اسی مذہب کی بنیاد ہے جسے میں نے اپنے سابقہ مذہب کی فرسودہ روایات، تنگ نظری اور بے جا سختیوں سے کنارہ کش ہو کر ترتیب دیا تھا۔ مگر یہی انسانیت میرے دس بائی دس کی معمولی کھولی سے خوبصورت بنگلے تک اور ایک معمولی دکاندار سے ایم۔ڈی۔ کے سفر تک ایسے ہی نمایاں ہے جیسے کفن کی سفیدی پر خون کے پھیلے ہوئے داغ ہوں۔

میں نے ترقی کی ہر سیڑھی پر جانے کتنے ارمان قربان کیے تھے۔ کتنے ہی معصوم جذبوں کا استحصال کیا تھا۔ راہ میں حائل کسی بھی ذات کا گلا گھونٹنا میرے لیے کبھی جھجک اور تکلیف کا باعث نہ بنا۔ اب اس پار دیکھتا ہوں تو ہر قدم پر میرے اپنوں کے ساتھ ہی مجھے اپنے ضمیر کی مروڑی ہوئی گردن بھی دکھائی دیتی ہے۔ خود پسندی، خود غرضی اور حرص و طمع جیسی خصلتوں نے میری شخصیت کو سخت گیر بنا دیا تھا لیکن تب بھی میں انسانیت کا پیروکار رہوں۔ اور جب میرا کسی مذہب سے واسطہ تھا، اور جب میں نے چار کتابیں نہیں پڑھی تھیں، نہ ان پر دانشورانہ انداز میں غور و فکر کیا تھا اور نہ ہی اس جگمگاتی دنیا کی چکا چوند نے میری آنکھوں کو خیرہ کیا تھا۔ تب میں کون سا پارسا اور متقی رہا تھا۔ میں نے تو مذہب کو صرف اپنی سہولت کے لیے اپنایا تھا۔ مذہب کو ہمیشہ جدیدیت کی کسوٹی پر رکھا تھا۔ کیا غلط کیا تھا۔۔۔؟ نہیں، میں کبھی اپنے رب کی حکم عدولی پر خائف نہیں رہا۔ نہ کبھی کسی قسم کے حزن و ملال نے مجھے مجروح کیا۔ میں نے کئی فرسودہ اور لایعنی رسمیں توڑی تھیں، از خود اس کی تشہیر کی اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے اوروں کو آمادہ بھی کیا۔ میری اسی روشن خیالی نے مجھے دین و مذہب سے کوسوں دور کر دیا۔ مگر میرا ماننا ہے کہ یہی دوری مجھے انسانیت سے قریب تر لے آئی۔ اور اب میں صرف انسانیت کا پجاری ہوں۔ اس جذبے نے مجھے اپنے ہم نواؤں میں منفرد مقام عطا کیا۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں اور ان کی مذہبی، سماجی، ثقافتی محفلوں میں، میں ہمیشہ معزز رہا۔ شہر میں کئی سوسائٹیاں میری نظر کے نیچے ہیں۔ میرے کمینٹس، اسٹیٹمینٹس، آئیڈیاز کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ میرے انٹرویوز اور آرٹیکلز سنجیدگی سے دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ سیاسی سطحوں پر میرا مقام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اہل علم مجھے اپنا قائد تسلیم کرتے ہیں۔ گو کہ میرا مرتبہ اس شہر میں کسی سیلی بریٹی سے کم نہیں ہے۔

لیکن آج اسے دیکھنے کے بعد یہ سب کچھ حقیر اور بے معنی معلوم ہو رہا تھا۔ میں اپنے اس مذہب کو دھیرے دھیرے مسمار ہوتے دیکھ رہا تھا جس نے مجھے بلندیاں عطا کی تھیں۔ مجھے اس وقت اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ ٹھیک سے یاد نہیں لیکن میں انہی بے شمار اور پہاڑ سے بڑے گناہوں پر نادم ہوئے جا رہا تھا۔ مگر اس بیچ ایک بے نام جذبہ بھی میرے اندرون میں کوئی گوشہ ڈھونڈنے لگا۔ کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک دل چاہ رہا تھا کہ دنیا کے پالن ہار سے صلح کر لوں اور اس کے سامنے گڑگڑاؤں۔ یقین کر لوں کہ وہی ہے جو اس زمین و آسمان اور اس کے درمیان حائل ہر شئے کا خالق ہے اور وہی کائنات کے اس نظام کو چلا رہا ہے۔ وہی ہے جو انسان کے ہر اچھے برے عمل کا حساب لینا چاہتا ہے۔ لیکن ایک

طرف دل کا سوال دوسرا تھا۔اب یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔؟ میں جھک نہیں سکتا، نہ ہی میری ہستی کو یہ گوارا ہے۔لیکن کیوں۔۔۔؟ کیا میں غلط ہوں۔۔؟ میں ڈوب رہا تھا ساتھ ہی ابھر بھی رہا تھا۔ گو کہ جنگ جاری تھی اور پس وپیش میں اب بھی مبتلا تھا۔بالآخر میں ان کیفیات سے چھٹکارا پانے کے لیے یا پھر سمجھ لیجیے کہ فیصلہ کن انداز میں، میں نے اپنے بیگ کو تھام لیا۔اس خیال سے بھی کہ یہی اصل ہے۔اس میں رکھے کچھ نوٹ ہی میری برسوں کی محنت کا حاصل ہیں ۔یوں مذہب کی ایک جوت جو کچھ دیر پہلے قلب کو مؤ ثر کر رہی تھی انسانیت پرستی کی ہلکی سی پھونک سے بجھ گئی۔میں نے اپنے وجود میں نئی تازگی سی محسوس کی اور ایک رعب میرے سینے سے ہوتا ہوا آنکھوں میں بھر آیا۔مگر چند ہی ساعتوں میں بیگ کے خیال کے ساتھ ہی اس کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔وہی آنکھیں ،چہرے پر صدیوں کی تھکن اور اس کے بائیں گال پر گہرائی سے کھینچا نشان جو خنجر بن کر میرے دل میں اترنے لگا۔

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی۔میں نے اسے گھر کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

ایک بار اور پشت کی طرف دیکھ کر تسلی کر لی۔کار کی رفتار اب خاصی تیز تھی۔میں اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن اس کا ڈر اب بھی میرے تعاقب میں تھا۔ میں نے پیشانی پر چمکتی پسینے کی چند بوندوں کو آستین سے خشک کیا اور گاڑی کے شفاف شیشے سے دائیں طرف جھانکنے لگا۔معلوم ہو رہا تھا کہ نفرتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں۔کافی دکانیں کھل چکی تھیں اور سڑکوں پر زندگیاں اپنے فطری انہماک کے ساتھ رواں دواں نظر آ رہی تھیں۔میں نے برابر والی سیٹ سے صبح کا اخبار اٹھایا۔ہر صفحہ جیسے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔حرف حرف سے انسانی فسطائیت اور بربریت لہو کی صورت مترشح تھی۔میں نے جھٹک کر اسے ایسے پھینکا جیسے یہ ہاتھوں میں جل اٹھا ہو اور پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو ٹٹولنے لگا کہ کہیں میرے سفید کبوتری جیسے ہاتھ جل کر سیاہ نہ پڑ گئے ہوں۔میں نے بے چینی سے پیچھے دیکھ کر کرخت آواز میں کہا''تیز چلو''ڈرائیور نے چونک کر ایک نظر مڑ کر پر ڈالی اور جی صاحب کہتے ہوئے گیئر بدل لیا۔

ایکا ایکی نگر سے دائیں طرف مڑنے کے چند منٹوں بعد ہی یک بارگی گاڑی کے بریک چر چرائے۔ڈرائیور نے بیچ چوراہے پر کار روک دی۔اچانک یہاں افراتفری مچ گئی، دکانوں کے شٹر ایک کے بعد ایک گرنے لگے۔ہارن کی آوازیں ماحول کو مزید دہشتناک بنا رہی تھیں۔بہت سے لوگ ٹریفک میں پھنسی سواریوں سے اتر اتر کا بھاگ رہے تھے۔میں نے بدحواسی میں دونوں ہاتھوں سے بیگ کو تھام لیا اور بے چینی سے چہار سمت بچاؤ کی راہیں ڈھونڈنے لگا۔تب میرے کانوں سے یہ فقرے ٹکرائے۔''اے چل باہر نکل چل۔۔اے انکل تو بھی۔۔چل۔۔چل۔۔۔۔۔؟ میں نے لرزتے ہاتھوں سے کار کا دروازہ کھولا اور پسینے میں شرابور باہر نکلا۔اونچے قد کا ایک بدصورت آدمی سینہ تانے میرے سامنے کھڑا تھا۔اس کی مونچھیں اتنی گھنی تھیں کے اوپری ہونٹ نظر نہیں آ رہا تھا اور آنکھوں میں رات کی شراب تیر رہی تھی۔اس کے پیچھے دس بارہ جوان ہاتھوں میں ہاکی ،بلم ،چھرے ور کچھ نے ترشول لیے ہوئے تپ رہے تھے۔اس سے پہلے کہ یہ لوگ ہم پر حملہ کرتے میں نے سر بچاتے ہوئے اپنا شناختی کارڈ نکالنے کے لئے جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔تبھی مجھے محسوس ہوا کہ یکا یک گھنی مونچھوں والا پوری عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ہے اور دوسرے ہی لمحے نامانوس زبان میں عجیب فقرے ادا کرتے ہوئے میرے قدموں میں بچھ گیا۔میں نے بچک کر پیچھے سرکنا چاہا لیکن وہ میرے پیروں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔اس کو دیکھ کر ایک کے بعد اس کے دیگرے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگ آس پاس سے چیختے چلاتے میرے قدموں میں سربسجود ہونے لگے۔اس ناقابل یقین سانحے پر سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ دوسری سمت سے فلک شگاف نعرے اُبھرتے ہوئے بے شمار لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھ میں بھونچکا رہ گیا۔ان کے چہرے مہرے اور پوشاکیں پہلے والوں سے قدرے مختلف تھیں ،ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور ہاتھ بھر کے چاقو، گپتیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔انھیں بھی جہاں اور جس حال میں جگہ ملی، سجدے میں گر گئے۔

میں نے پھر سے اور اب کی بار پوری قوت سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔میں چاروں طرف سے جکڑا ہوا تھا، اطراف میں انگنت لوگ بلا تفریق سجدے میں اور بیچ میں میرا ناتواں وجود کسی مقدس پتھر کی مانند تھا۔اپنے ڈرائیور کو دیکھا تو وہ بھی میری ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔اب کے میری حالت اس بدنصیب کے جیسی تھی جو خاردار پہاڑی سے لڑھکتا ہوا جنگل میں گر پڑا ہو اور زندہ بھی بچ گیا ہو۔میں ملتجیانہ نگاہوں سے ادھر دیکھ رہا تھا کہ ان سجدہ ریزوں میں سے ایک شخص جو اس بھیڑ میں مجھ سے کافی قریب تھا، اٹھا اور احتراماً جھک کر مجھے سلام کیا۔پھر ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکان رکھ کر چڑھاتی ہوئی نگاہوں کے تیر مجھ پر داغنے لگا۔مجھے محسوس ہوا میرے پیروں کے نیچے زمین سرک گئی ہو۔یہ وہی تھا۔۔!ہاں ہاں وہی۔۔۔۔۔!وہی جو۔۔۔جس کے چہرے پر وہی گہرا نشان اور آنکھوں میں وہی سحر انگیز غنودگی۔۔!میں نے مارے حیرت کے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ لیے۔یکا یک ہتھیلی کو میرے بائیں گال کی ململ سی جلد پر ایک گہری موٹی اور کھردری لکیر کا لمس محسوس ہوا۔میں نے بے تابی سے اس پر انگلیاں پھیریں بعد میں متعدد بار آہستہ آہستہ اسے مس کیا تو لرز کر رہ گیا۔میرے چہرے پر بھی بالکل ویسا ہی نشان ہے جیسا کہ اس کے بائیں گال پر تھا۔اس نے ایک قہقہہ میری طرف اچھالا اور دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے لہرائے جیسے مجھے اپنی جگہ پر رکنے کا اشارہ کر رہا ہو اور یہ کہہ رہا ہو کہ جب تک تم موجود ہو تو مجھے یہاں آنے کی ضرورت کیا ہے۔۔۔! آخری دفعہ پھر پوری عقیدت سے جھک کر سلام کیا اور ایکدم سے ایسے غائب ہو گیا جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

☆

حوصلے کی موت

مترجم: ڈاکٹر شیما ربانی
(کراچی)

سرد لمبی رات۔ رات کے گیارہ۔ کورا سفید کاغذ۔ ہاتھ میں قلم۔ لکھنے کا بھرپور حوصلہ۔

۱۹۶۰ء۔ جنگ کا زمانہ۔ شام کا وقت۔ سورج ڈوبنے کے بعد۔ ہلکی تاریکی بلیک آؤٹ کی وجہ سے۔ بجلی ندارد۔ تنگ راستہ۔ گھاٹیوں کو پار کرتے ہوئے ایک ہندو گھائی سے گزر رہا ہے۔

چار پانچ مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کیا۔

۔اپنے باپ ہندوستان کے جہازوں کو ٹارچ دکھا رہا ہے۔

۔جاسوس ہے۔ جہنم رسید کردو۔

۔(نہیں نہیں۔ مولا کی قسم یہ غلط ہے....)

۔ارے خبیث، تیرا مولا کون؟

۔کافر! مولا کا نام لے رہا ہے اپنی پلید زبان سے۔

اچانک ڈی۔ پی۔ آر*

حوصلہ بل کھاتے ہوئے۔ ہاتھ میں قلم۔ سفید، کورا کاغذ۔ رات پل پل گزرتے ہوئے۔ لکھنے کا بھرپور حوصلہ۔

بھری ہوئی سگریٹوں کا ہر سُو پھیلا دھواں۔ ہاتھ میں قلم۔ سفید کاغذ

استاد جمعہ مستری صبح جب کارخانے جانے لگا تو۔ کمزور بیوی کو دیکھتے ہوئے، اپنے سوجھے ہوئے منہ سے، بے جان جسم کا زور لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

'نیک بخت، آج شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو،

کیوں؟ مالک خیر کرے گا! ایسی بات تو نہ نکالو۔

'آج ہماری ہڑتال ہے۔ شاید گولی چلے'

سوال اور اشک بھری آنکھیں۔ گونگی زبان۔ بت کی طرح ساکت۔

'ارادتاً۔ یہاں تو لاش بھی نہیں ڈھونڈتے۔'

اچانک۔ طبقاتی منافرت پھیلانا، قلم......سزا

حوصلہ بل کھاتا ہوا۔ ہاتھ میں قلم۔ سفید کاغذ خالی خالی!

رات۔ چاروں جانب سناٹا۔ نگرانی۔ ہاتھ میں قلم۔ لکھنے کا بھرپور حوصلہ کہانی۔ جو کہ بلوچستان کے ایک تازہ واقعہ سے متعلق:

''وہ بلوچ عورت، جس کی.....''

اچانک ڈی۔ پی۔ آر

حوصلہ بل کھاتا ہوا۔ ہاتھ میں قلم۔ سفید کاغذ۔ خالی خالی!

'وہ پچھلے برس ہم کو۔ موہن جوڈارو سے واپس پرڈوکری اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر ملا تھا، ترکی ٹوپی، بادامی زری کا کوٹ، ہلکی سفید ڈاڑھی، ترشی ہوئی مونچھیں، ہاتھ میں سفید رومال، جس سے کچھ کچھ دیر بعد ناک اور ماتھے کے حصے کو صاف کر رہا تھا۔'

۔سندھ یونیورسٹی کے شاگرد ہو؟

۔جی سائیں!

بات چیت شروع ہوئی۔ سندھ کو نئی پہچان دینے کی ہلچل.....

ہاں سندھی ایک قوم۔ سادہ اور فرمانبردار، سادگی اور فرمانبرداری کمزوری بن گئی ہے۔ آپ نئے دور کے نوجوان ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں: تاریخ کے ہر دور میں کمزوری اور رُکاوٹ بہت رہی ہے۔

'آپ میرے بچے ہیں۔ آپ کو بتاؤں! جب ابھی اس دھرتی پر عرب۔ ایرانی۔ ارغوانی۔ ترخانی۔ مغل اور مغلوں کی ناجائز اولاد۔ ہاں۔ اور انگریزوں اور دیگر چور لٹیروں کے قدم نہ پڑے تھے تب ہاں تب......''

(چلتا قلم یک دم رک گیا)

اچانک، سندھی کوئی قوم نہیں۔ پاکستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے۔ پاکستانی۔

غداری.........سزا.........

حوصلہ بل کھاتا ہوا۔ ہاتھ میں قلم۔ ہاتھ یکدم رکا ہوا۔ ذہن خالی۔

رات کا ایک سفید کاغذ۔ ہاتھ میں قلم۔ لکھنے کا بھرپور حوصلہ

''یہ ان ماؤں کے لال کا ذکر ہے جو لسانی فسادات میں گولیوں کا شکار ہوئے۔ گبرو جوان۔ ان کے چہروں پر ہلکی ہلکی مونچھیں بھی آ گئی تھیں...''

سیکشن..........

حوصلہ بل کھاتا ہوا۔ ہاتھ میں قلم۔ یکدم رکا ہوا۔

۔'سائیں اب جب بھی میں 'سندھ' کا لفظ منہ سے نکالوں تو بہتر...''

۔؟؟!

۔میں آپ کے ان پوچھے سوال سمجھ گیا ہوں۔ دراصل پریس اور پبلیکیشن آرڈیننس.....آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔''

اچانک سوالوں کا سلسلہ: جرات کی کمی؟ پیٹ کا مسئلہ؟ آزادی کے مقصد پر ذات کو فوقیت؟ خود غرضی؟ منافقت؟

لیکھاری کی جانب سے:

یہ نامکمل کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے: ایک بھرپور جذبے، حوصلے کا ناتمام قصہ۔ یہ جذبہ۔ حوصلہ خطرے میں بھی اپنا اظہار کر رہا ہے۔

ذات، کے اظہار اور نمو کے لئے آزادی چاہئے۔ ذات کا اظہار وقت کا تقاضا ہے۔

باقی صفحہ ۷۸ پر ملاحظہ کیجیے

کیہہ جاناں میں کون۔۔۔

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

گذشتہ تین روز میں راشدہ کی یہ ساتویں کال تھی۔ چونکہ میں راشدہ کے شتابی مزاج سے واقف ہوں اس لیے کال کاٹنے کے بجائے اُس کی عمر پوری کرنے یعنی دوسری طرف سے بند ہونے کا انتظار کرتا ہوں اس میں فائدہ یہ ہے کہ آپ بازار، باتھ روم، مہمان یا نیند کا بہانہ کر کے دوسری طرف والے کے غیظ وغضب سے بچ سکتے ہیں۔

آپ کے ذہن میں میری باتوں کے بجائے راشدہ کی بابت اشتیاق بڑھ رہا ہے۔ سب کچھ اس قدر جلد اور اچانک ہوا کہ میں بھی سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ میرے وعدے اور ارادے راشدہ کو دیکھتے ہی تنکے کی طرح کیوں بہہ گئے۔ حالانکہ میں نے زہرہ کے آخری ایام میں ہی پختہ یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں زہرہ کے بعد اپنی زندگی میں کسی کو شریک نہیں کروں گا۔

یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہ تھا اس کی صاف صاف وجہ یہ تھی کہ زہرہ نے مجھے اتنی پُرسکون اور قابلِ اعتماد زندگی دی اور احترام کی اُس معراج پر پہنچا دیا جس پر لفظ ''مزاجی خدا'' بھی شرمانے لگتا ہے۔ میں اپنے وعدے پر ایک نہیں، دو نہیں پورے ڈھائی برس ثابت قدمی سے قائم رہا اور شاید ابھی بھی رہتا مگر معاملہ وہی تھا جسے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''، یعنی راشدہ کو دیکھ کر اگر میرے دل نے مجھ سے کسی قسم کی سرگوشی کی تو راشدہ کا دل بھی اُس سے کچھ نہ کچھ ہمکلامی پر مجبور ہوا تبھی سلسلہ آگے بڑھا۔

میری خواہش ہے کہ میں راشدہ کے ذکر کو آگے بڑھانے سے قبل آپ کو اُن ایّام کی بابت بتلاؤں جو میں نے زہرہ کی تکلیف کے دوران کاٹے اور جن کا اثر میرے دل، دماغ کے ساتھ جسم پر ابھی بھی قائم ہے۔ کوئی بھی گوشت پوست کا انسان اگر اس طرح کی آناً فاناً موت دیکھے گا اور موت بھی کسی عزیز رشتے دار یا محلے دار کی نہیں چھبیس برس تک زندگی کا ساتھ نبھانے والے بے پناہ محبت کرنے والے ساتھی کی جدائی کسی بھی انسان کو توڑنے کے لیے کافی ہے۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا ہلکا بخار اور جسم میں درد کی علامات کے بعد ڈاکٹر نے چند ٹیسٹ لکھ کر دیے تو اُس کے ذریعے کالا یرقان تشخیص ہوا۔ بظاہر ڈاکٹر نے کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہ کرتے ہوئے علاج، پرہیز اور احتیاط کا سلسلہ شروع کر دیا مگر یہاں بھی بزرگوں کا وہی محاورہ درست ثابت ہوا کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' ایک کے بعد ایک ڈاکٹر بدلنے اور طرح طرح کے ٹیسٹ کرانے کے باوجود زہرہ کا مرض ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ نقاہت اس قدر ہوگئی کہ سہارے کے بغیر چلنا پھرنا تو کجا بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا۔ چند دن بعد ڈاکٹر کے مشورے کی روشنی میں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں چوبیس گھنٹے گلوکوز کے ساتھ رنگ برنگے ٹیکے لگتے رہے مگر زہرہ کی حالت سنبھلنے میں نہ آئی۔

اُس روز ساری رات جاگنے کے سبب میری طبیعت مضمحل ہوئی تو بڑے بیٹے نے مجھے زور دے کر گھر بھیجا اور فریش ہونے کے ساتھ آرام کرنے کی تاکید بھی کی۔ میں نے بھی سوچا کہ اگر میں بھی چارپائی سے لگ گیا تو زہرہ کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ گھر آ کر نہانے اور شیو کرنے کے بعد ایک کپ چائے کا پی کر کمر سیدھی کرنے کی نیت سے لیٹا تو پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کہاں پڑا ہوں۔ کچھ دیر بعد موبائل کی گھنٹی مسلسل بجی تو کال سننے کے بجائے میں نے وقت دیکھا، مجھے سوئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔

میں نے جلدی سے بٹن دبا کر کال سُنی تو دوسری طرف سے گھبرائی آواز میں بیٹا بول رہا تھا ''ابو جلدی آیئے امی کی حالت ٹھیک نہیں''، میں نے فوری طور پر گاڑی نکالی حالانکہ ایسی حالت میں ڈرائیونگ میرے لیے مضر ہوسکتی تھی مگر میں نے کسی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اندھا دُھند گاڑی کو ہسپتال کی جانب دوڑا دیا۔ میری تیز رفتاری کافی حد تک ٹریفک کی نذر ہوگئی اور میں کوشش کے باوجود دس منٹ کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کر کے ہسپتال پہنچا تو بیٹا باہر کھڑا مل گیا۔ قبل اس کے میں اس سے کچھ دریافت کروں وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کے بلک بلک کے رونے لگا۔ ''ابو، امی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں''

اس کے بعد زہرہ کو کس طرح گھر لایا گیا اور کس طرح تدفین کے انتظامات ہوئے اور کس طرح دوسرے شہر میں بسنے والی اکلوتی بیٹی کو اطلاع دے کر بلایا گیا۔ میں اس تمام معاملے سے قطعی بے خبر ہوں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے پہنچنے کے بعد قریبی رشتے دار بھی ہسپتال پہنچ گئے تھے اور میری غیر حالت دیکھ کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے انجکشن لگا کر آرام کا مشورہ دیا اُس کے بعد میری آنکھ دوسری صبح کھلی جب جنازہ قبرستان کے لیے تیار تھا۔ تکبیر اور تنویر کی معیت میں مَیں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا لوگوں کے تعزیتی جملوں کا سر کی جنبش سے جواب دیتا ہوا قبرستان پہنچ گیا۔ اس طرح چھبیس سال کی رفاقت کا سفر تمام ہوا۔ وہ گھر جو زہرہ نے بڑے ارمانوں سے سجایا تھا اس طرح ویران ہوگیا کہ اُس کی رونق پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی۔

قُل کے روز سے رشتے دار اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے لگے۔ بیٹے بھی اپنے معمولات سے آہستہ آہستہ جڑنے لگے مگر میرے لیے زندگی کو اتنی جلد خوش آمدید کہنا ممکن نہ تھا۔ بیٹی میری کیفیت اور اپنی ماں سے میرے تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے گھر جانے سے مسلسل انکار کر رہی تھی۔ آٹھویں روز اُسے یہ کہہ کر بھیجا ''کہ جانے والوں کے ساتھ زندگی ٹھہر تو نہیں جاتی جواب

میں بیٹی بولی''آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر جایا بھی تو نہیں جا سکتا'' اب میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں جلد از جلد یا تو نارمل ہو جاؤں یا نارمل ہونے کی ایسی اداکاری کروں کہ گھر والوں کو یقین آ جائے کہ میں اس صدمے سے باہر آ چکا ہوں۔

سو میری چند دن کی اداکاری نے گھر والوں کو یہ یقین دلا دیا کہ میں نے خود کو سنبھال لیا ہے اور میری طرف سے اب پریشانی کی کوئی بات نہیں لہٰذا سب نے مجبور کر کے بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر چہلم کی تاریخ مقرر کی اور بیٹی کو یہ تسلی دے کر روانہ کر دیا کہ ہم سب لوگ ابو کا پورا خیال رکھیں گے۔ سب لوگ کیا بیٹے تین اور ایک بہو اور دو ننھے ننھے پھول۔ ہر وقت میرے گرد منڈلاتے رہتے اور اگر وہ آگے پیچھے ہو جاتے تو بہو چائے کے دو کپ بنا کر صرف اس لیے لاتی کہ اس بہانے کچھ وقت میرے ساتھ گزارے اور بیٹی سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے۔

ایک مہینہ بقول لوگوں کے پلک جھپکتے گزر گیا مگر کوئی میرے دل سے پوچھتا تو میں ضرور بتلاتا کہ یہ مہینہ نہیں پوری صدی مجھ پر گزری ہے اور کیسے گزری ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ چہلم کے دن ایک بار پھر گھر میں رونق ہوئی۔ رونق ان معنوں میں کہ جب آپ کے دل کا موسم اداس ہوتا ہے تو آپ کے اپنے اچھے لگنے لگتے ہیں۔ کچھ ساعتوں کے لیے آپ اُس موسم کے بجائے باہر کے موسم سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

چہلم کے دوسرے روز تینوں بیٹے، بیٹی، داماد، بہو، بھانجی اور بڑی بہن جرگے کی صورت میں آ کر میرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں اُن لوگوں کی موجودگی سے بے نیاز اندر کے موسم کے ساتھ محوِ گفتگو تھا کہ باجی نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا''ہاں تو بھیا آگے کا کیا سوچا ہے تم نے'' میں نے بے خیالی میں ''کس حوالے سے'' بھانجی نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا''میری ایک دوست ہے تمثیلہ'' ایک بار پھر میں نے لاتعلقی سے کہا''پھر'' بھانجی نے اپنی والدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا''آپ سمجھائیں نہ ماموں کو'' باجی نے بیٹی کو ٹہوکا دیتے ہوئے اشارہ کیا تو اُس نے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا''ہم سب کی خواہش ہے کہ آپ ایک سے دو ہو جائیں''

میں اندر کے موسم سے کس طرح باہر کے موسم میں آیا اور میری آواز کیونکر تیز ہوئی اس سے میں قطعی لاتعلق تھا''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا'' القصہ مختصر سب لوگوں نے اپنی سی کوشش کی مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ''ابھی تو زہرہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور آپ لوگ میری شادی کی بات کر رہے ہیں کچھ تو خیال کیا ہوتا مرنے والی کا۔ کیا سانس کی ڈور ٹوٹنے کے ساتھ سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں'' میرے بگڑتے تیور دیکھ کر سب لوگوں نے بات کا رُخ موڑنا مناسب سمجھا اور یوں یہ محفل اختتام کو پہنچ گئی۔

دوسرے دن سے میں نے باقاعدگی سے آفس جانا شروع کر دیا تا کہ گھر والوں کو میری تنہائی، میری اداسی پریشان نہ کرے اور میرا بھی اس میں فائدہ تھا کہ دن بھر لوگوں کے ساتھ مصروف رہ کر میں باہر کے موسم میں وقت بِتاتا تو اندر کا موسم مجھے اُس قدر تنگ نہ کرتا جس قدر رات کی تنہائی میں کیا کرتا۔ ہر چند میں اپنی طرف سے خود کو خوش دکھانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر گھر والے جانتے تھے کہ میں یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کر رہا ہوں۔ لہٰذا اب یہ گھر کا معمول بن گیا کہ ہفتہ، پندرہ دن یا مہینے بعد کسی نہ کسی حوالے سے کوئی نہ کوئی ذکر عقدِ ثانی کا چھڑ جاتا۔ کبھی سلیم صاحب کوئی تجویز لے کر آ رہے ہیں، کبھی جاوید صاحب کی جانب سے سلسلہ جنبانی شروع ہو رہا ہے، کبھی وحید صاحب پیغام لا رہے ہیں تو کبھی یحیٰی صاحب اور سلیمان صاحب زور دے رہے ہیں۔ میرا ہر بار یہی جواب ہوتا کہ یہ گھر زہرہ کا ہے اور میں نے عہد کیا ہے کہ میں اُس کی اولاد کے سپرد اسی شکل میں کر کے جاؤں جس شکل میں زہرہ چھوڑ کر گئی ہے۔

تن تنہا آدمی بھلے ہی کتنا عقلمند کیوں نہ ہو ایک وقت میں ایک سے لڑ سکتا ہے، دو سے لڑ سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ تین سے۔ سب سے لڑنا نہ تو دانشمندی ہے اور نہ کبھی کوئی اس طرح کی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے یا سب کے سامنے سچے دل سے یہ اقرار کر لیا تھا کہ میں اُن کی تجویز پر عمل کرنے کی بابت سوچ رہا ہوں ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر والوں کی بے جا خاطر مدارات کے باعث میں خود کو اپنے ہی گھر میں مہمان سمجھنے لگا تھا اور نفیس صاحب نے جب عمر میں مجھ سے بڑا اور دل کا مریض ہونے کے باوجود اپنی بیگم کے انتقال کے بعد چالیسواں ہوتے ہی یہ کہہ کر عقدِ ثانی کیا کہ ''میاں بیٹے اپنے کمروں میں ہوتے ہیں اگر مجھے اچانک دل کا دورہ پڑ گیا تو کون دیکھے گا، کوئی تو ہونا چاہیے جو میری دیکھ بھال کر سکے اور شرع میں شرم کیا ہے''

ان تمام باتوں نے میرے دل میں نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا کہ واقعی انسان کا کوئی ساتھی ضرور ہونا چاہیے جس سے دکھ سکھ ہر مرض بانٹا جا سکے۔ بظاہر میں نے کسی کو اس حوالے سے کچھ نہیں کہا تھا مگر گھر والے میری کیفیت بھانپ کر پھر سے متحرک ہو گئے تھے۔

سوال جہاں تک راشدہ کا ہے تو راشدہ سے میرا رشتہ ایک طرح سے دشمنی کا تھا۔ ہمارے درمیان قدرِ مشترک راشدہ کے بچے عمیر اور شجرہ تھے جو باقاعدگی سے میرے پوتا پوتی سے کھیلنے آتے اور سلام کے ساتھ ہاتھ بھی ملایا کرتے۔ بچوں کی اُنسیت کی نسبت راشدہ سے میرے اچھے تعلقات نہ ہونے کا سبب ظریف خان بنا۔ کارکنوں سے کام لینے کا میرا اپنا طریقۂ کار ہے۔ میں مزدور سے لے کر بڑے سے بڑے آدمی کے نام کے ساتھ صاحب لگا کر پکارتا ہوں۔ ظریف خان میرے مالی کا نام ہے جس سے میری دوستی بھی ہے۔ شام کی چائے میں خود بناتا ہوں جو میرے گھر کے واچ مین حفیظ صاحب اور مالی ظریف خان اکٹھے پیتے ہیں جس کے سبب ظریف خان میرے پھول پودوں کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے اور اُن کی تراش خراش پر پوری توجہ دیتا ہے۔

محلے کے دیگر گھروں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ ظریف خان اُن

کے پھول پودوں کو اُتنی توجہ نہیں دیتا جتنی میرے گھر کے پھول پودوں کو دیتا ہے۔ مگر راشدہ کچھ زیادہ ہی جلن محسوس کرتی تھی۔ جب بھی ظریف خان اُس کے گھر جاتا تو وہ بہانے بہانے سے ظریف خان کو یہ کہہ کر طنز کا نشانہ بناتی کہ ہم سے تو تم مفت کے پیسے لیتے ہو کام تو تم اسرار صاحب کے ہاں کرتے ہو۔ جواب میں ظریف خان کہتا کہ ''جتنے پیسے اسرار صاحب دیتے ہیں اُتنے آپ دے دیا کریں'' جب راشدہ دریافت کرتی کہ اسرار صاحب کتنے پیسے دیتے ہیں تو ظریف خان جھوٹ بول کر رقم دگنی بتا دیتا۔ اس طرح راشدہ کا منہ بھی بند ہو جاتا اور ظریف خان کی جان بھی چھوٹ جاتی۔

راشدہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خوش شکل خاتون تھی جس کے شوہر سات برس قبل سڑک کے حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ بڑی بیٹی کی شادی کر دی تھی اور چھوٹی بیٹی اور بیٹا اسکول کے طالب علم تھے جن کے ساتھ وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ میری بہو نے کئی بار اشاروں کنایوں میں راشدہ کی جانب توجہ دلائی تو میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے چڑ چڑی کہہ کر راشدہ کا خوب مذاق اڑایا۔ جواب میں میری بہو نے میری رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا میں نہیں مان سکتی۔ آپ کو اعتراض ہے تو کُھل کر کہیں کسی پر الزام تو نہ لگائیں۔''

بظاہر یہ شعر یہاں موزوں تو نہیں مگر نجانے کیوں ہمارا جی چاہتا ہے کہ اِسے درج کریں۔

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

تو جناب اُس روز میں گیٹ پر کھڑا ہوا تھا کہ راشدہ صاحبہ ظریف خان کا پتہ کرنے آئیں اور ہمارے سراپے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کچھ اس طرح واپس گئیں کہ ہمارے اندر کا موسم بھی خوشگوار کر گئیں۔ اُسی روز شام کو شجرہ دو پلیٹیں لے کر آئی۔ ہماری بہو نے اشتیاق سے پوچھا'' کیا ہے'' شجرہ بولی ماما نے زردہ بنا کر بھیجا ہے'' اچھا۔۔۔ ماما کو کیسے پتا کہ ہمارے گھر میں میٹھے کا شوقین کون ہے؟'' میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے۔ دوسرے دن بہو نے سوپ بنا کر بھیجا تیسرے دن اُنہوں نے کھیر بنا کر بھیجی چوتھے دن بہو نے پلاؤ بھیجا انہوں نے حلوہ۔ تو جناب اس طرح ایک مہینے کے تبادلۂ کھانا جات نے سلسلۂ کلام آگے بڑھایا جس میں ڈاکٹر اکبر اور حاجی حمید صاحب نے بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔

حالانکہ بیٹی نے اپنی بھائی کو اس معاملے میں فری ہینڈ دے رکھا تھا مگر بہو چاہتی تھی کہ بیٹی آئے اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا کام کر کے جائے تو گھر کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں۔ داماد صاحب مصروف تھے انہوں نے اپنی والدہ کے ہمراہ ہماری بیٹی اور اپنے بچوں کو بھیج دیا۔ اسی بیچ ہماری ہمشیرہ اور بھانجی کو بھی بُلا لیا گیا۔

منگل کے روز بات چیت طے ہونے کا جب آخری مرحلہ تھا تو راشدہ کے والد نے ہماری طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا'' میاں برخوردار ہمیں تو اپنے جگر کا ٹکڑا آپ کے سپرد کرنے میں کوئی عار نہیں۔ آپ بتلائیے! کہ ہماری تسلی کے لیے کسی طرح کی شورٹی یا گارنٹی دے سکتے ہیں آپ؟'' بزرگوار کے اس اچانک سوال نے ایک لمحے کو ہمارے ہوش اڑا دیے چند ثانیوں کے اندر ہم نے قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے جیب سے قلم نکال کر بزرگوار کے آگے رکھتے ہوئے کہا'' ہماری کل متاعِ حیات یہ قلم ہے اس کے علاوہ آپ ہمیں تہی دست سمجھئے۔''

آہ۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ اوہ۔۔۔ ہوہو'' راشدہ کے والد نے غیر متوقع طور پر ہنستے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا'' میاں آپ کے اس عمل نے پرانے وقتوں کی یاد دلا دی۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک زور آور مسلمان ہندو بنیے کے پاس اُدھار مانگنے گیا جواب میں بنیئے نے کہا کہ بھائی گروی رکھنے کے لیے کچھ لائے ہو؟ مسلمان زور آور نے مونچھ کا بال توڑ کر بنیئے کی طرف بڑھایا تو بنیا بولا'' یہ کچھ ٹیڑھا نہیں'' غور سے دیکھتے ہوئے۔ مسلمان زور آور نے غصے سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے'' لالہ ادھار دینا ہے دو ورنہ میرا بال واپس کر دو'' زور آور کے تیور دیکھ کر لالہ نے بلا چوں چراں بال کو محفوظ کرنے کے بعد زور آور کو اُس کا مطلوبہ سامان دے دیا۔ سامنے کھڑا ایک سڑک چھاپ یہ منظر بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی زور آور نے دکان چھوڑی تو سڑک چھاپ نے ہندو بنیئے کی دکان کا رُخ کرتے ہوئے اُدھار کا مطالبہ کیا۔ بنیئے نے گروی رکھنے کی شے طلب کی تو سڑک چھاپ نے مونچھ کا بال توڑ کر دے دیا۔ بنیئے نے بال کو غور سے دیکھنے کے بعد سڑک چھاپ سے کہا یہ تو ٹیڑھا ہے۔ جواب میں سڑک چھاپ نے دوسرا بال توڑ کر دیا تو ہندو بنیے نے کہا۔۔۔ چل بے بھڑوے، بڑا آیا بال گروی رکھنے والا۔ یہ کام کرنے والوں کی شان نرالی ہوتی ہے۔ سو میاں تمہاری اس ادا نے ہمارا دل جیت لیا اگر ہندو بنیا صاحبِ کردار کے بال کا اعتبار کر سکتا ہے تو ہمیں بھی آپ کے قلم پر اعتبار بھی ہے اور اعتماد بھی۔'' اس طرح جمعہ کے روز بعد از نمازِ جمعہ قریبی احباب کی موجودگی میں مسماۃ راشدہ بنتِ حاجی عبد الغفور کو شرعی مہر کے عوض ہمارے عقد میں دے دیا گیا۔

ہفتہ اتوار تک گھر میں گہما گہمی رہی۔ راشدہ کی چھوٹی بہن، والد اور والدہ کے علاوہ ہماری بہن، بھانجی اور بیٹی کی موجودگی نے گھر کی رونق بڑھا دی تھی۔ جب یہ لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے تو ہماری زندگی بھی معمول پر آ گئی لیکن اس معمول میں ایک فرد کا ایک انہونی خوشی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بظاہر راشدہ کے بچے بھی اس رشتے سے خوش تھے مگر ابھی تک نہ تو راشدہ اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے گھر آئی تھیں اور نہ ہم اُن کے گھر منتقل ہوئے تھے۔ دن کا کچھ وقت اکثر ہمارا راشدہ کے ہاں اور کبھی راشدہ کا ہمارے گھر گزرنے لگا۔ کبھی وہ ادھر دوپہر کا کھانا کھاتیں کبھی ہم اُن کی طرف رات کا کھانا کھاتے۔

پہلے راشدہ کے بچے کبھی دن میں ایک بار کبھی دو بار بعد آتے تھے اب اُن کا زیادہ وقت ہماری طرف گزرتا۔ جب سردیوں میں بچوں کی چھٹیاں

آ ئیں تو اُن کے اسرار پر راشدہ نے گاؤں جانے کا ذکر کیا۔ جواب میں ہم نے کہا ضرور جانا چاہیے تو راشدہ نے حیران ہو کر پوچھا ''آپ نہیں چلیں گے؟'' ہم نے سوچنے کے انداز میں پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا ''چل تو سکتے ہیں اگر ہماری شرائط پوری کر دی جائیں'' راشدہ نے حیران ہو کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے ''شرائط۔۔۔کیسی شرائط؟'' ہم نے پھر سوچنے کے انداز میں ٹہلنا شروع کر دیا اور ایک دم پلٹتے ہوئے کہا ''بہت ساری ہیں کاغذ قلم لے آؤ نوٹ کرنی پڑیں گی'' راشدہ نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا ''آپ کہیے تو سہی میرا حافظہ کافی تیز ہے'' ہم نے ہاتھ کی انگلیوں کی مدد سے گنوانا شروع کیا ''نمبر ایک یہ کہ مکئی کی روٹی اُس ساگ سے کھائیں گے جو ہم خود کھیتوں سے توڑ کر لائیں۔ نمبر دو لسی نمکین پئیں گے بشرطیکہ بھینس کا دودھ نکال کر چاٹی میں خود بلوئیں۔ نمبر تین اس بھاری بھر کم ناشتے کے بعد مابدولت ہل جوتنے کے لیے کھیت میں جانا پسند کریں گے۔''

''ہائے میں مرجاؤں۔۔۔ہل اور آپ چلائیں گے'' ہم نے بھی اُسی لہجے میں ''مریں آپ کے دشمن۔۔۔نمبر چار ٹریکٹر کی سواری اور نمبر پانچ گھوڑے کی سیر''

''واہ جی واہ۔۔۔آپ تو رج کے پینڈو نکلے''

پہلے دن صبح ہی صبح جب ہم بھینس کا دودھ نکالنے کے لیے دبے پاؤں جانے لگے تو ہماری نقل میں دونوں بچے بھی پیچھے آ گئے۔ باباجی نے کامے کو ہماری مدد کے لیے پہلے سے مامور کر دیا تھا۔ کامے سے بالٹی مانگنے کا اشارہ کیا تو وہ حیرت سے بولا ''صاحب جی آپ بیٹھیں اور دیکھتے جائیں'' کامے کے ہاتھ سے بالٹی لیتے ہوئے ''آج دیکھنے کی تمہاری باری ہے'' جونہی ہم بالٹی لے کر بھینس کے قریب ہوئے تو وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے کبھی پیٹھ پر دُم مارتی اور کبھی پیروں کی مدد سے آگے پیچھے ہونے کی کوشش کرتی۔ کامے نے پچکارتے ہوئے بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو وہ اس طرح خاموش ہو گئی کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہم نے بالٹی میں موجود پانی سے بھینس کے تھن کامے کی ہدایت کے مطابق نرم کرنے کے بعد دودھ نکالنے کی کوشش کی تو پہلی دھار ہمارے منہ پر پڑی۔ دونوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دوسری کوشش میں دودھ کی دھار عمیر کے منہ پر پڑی تو وہ انگلی سے دودھ کو چکھتے ہوئے دُور بھاگ کر بولا ''یہ تو نمکین ہے'' عمیر کے بعد شجرہ نے میرے شانوں پر اپنا وجود ڈالتے ہوئے کہا ''اب میری باری ہے'' اس بار پہلی دھار سیدھی بالٹی میں گئی تو دونوں بچوں نے ''ہرّے'' کا نعرہ لگا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اگلی کوشش کامیاب ہوئی مگر دھار شجرہ کے سر پر پڑی۔ شجرہ نے اپنا وجود میرے کاندھوں کے قریب کرتے ہوئے منہ کھول کر کہا ''اب کریں'' اتفاق سے دھار سیدھی اُس کے منہ میں گئی جو اُس نے ڈبل کر کے میرے اُوپر اُگل دی۔

قریب ایک تہائی بالٹی دودھ مشکل سے نکالنے کے بعد ہماری ہتھیلیاں اور کلائی جواب دے گئیں تو کامے نے کہا ''لاؤ صاحب جی مجھے دو میں نکالتا ہوں'' ہم نے کامے سے کہا کہ ''تم دوسری بالٹی میں نکالو یہ ہم گھر لے کر جا رہے ہیں۔'' چاٹی گھماتے ہوئے بھی ہم تینوں کی ''پہلے میں'' دیکھنے والی تھی۔ اسی طرح ناشتے میں بھی کھانے سے زیادہ تفریح کا عنصر شامل تھا۔ پروگرام کے مطابق باباجی نے اپنے پڑوسی سیف اللہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنا ہل ہمارے لیے مخصوص رکھے۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم نے مناسب طاقت کے زور پر بیلوں کی جوڑی کو ''ہوں ہوں'' کر کے آگے بڑھانے کی کوشش کی وہ تو ہم سے زیادہ زور سے ہنہنائے مگر زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کے مصداق نہ ہل اپنی جگہ سے کھسکا اور نہ بیل۔ پھر ہمارے اشارے پر دونوں بچوں نے دائیں بائیں کے کاندھوں پر زور دے کر ہل چلانے میں ہماری مدد کی تو انچوں کے حساب سے تازہ مٹی نمایاں ہو گئی۔ ہماری پریشانی کو دیکھتے ہوئے سیف اللہ نے ہمارا ساتھ دیتے ہوئے بیلوں کو ہنکارا، بیل تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اب ہل کو ایک نہیں چار آدمی چلا رہے تھے کبھی کوئی اوپر ہو جاتا تو کبھی کوئی نیچے۔

اگلے دن صبح کے وقت ٹریکٹر کی سواری لی گئی جس میں ہر کسی کے ضد میں چلاؤں میں چلاؤں کی تھی جس میں ٹریکٹر کم چلا ہم لوگ زیادہ۔ دوسرے دن گھوڑے کی سواری کی باری آئی تو پھر پہلے میں، پہلے میں کی ہڑبونگ میں عمیر صاحب گھوڑے پر چڑھ بیٹھے۔ پہلے تو کوشش کے باوجود گھوڑا اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ جب اُس کے خادم نے عمیر کو سمجھایا کہ آپ لگام کھینچنے کے بجائے ڈھیلی چھوڑ دو، اُس کے بعد گھوڑے کے خادم نے اشارے سے ایڑھ لگانے کو کہا جس کے فوراً بعد گھوڑا اس تیزی سے دوڑا کہ ہم حیران ہو گئے۔ عمیر صاحب حواس باختہ تھے کبھی دائیں تو کبھی بائیں، خادم نے عمیر کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے سیٹی بجائی تو گھوڑا خود بخود رک کر واپسی کے لیے آہستہ آہستہ چل پڑا۔ خادم نے جب عمیر کو گھوڑے سے اتارا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو اور دونوں ہاتھ پیچھے رکھے ہوئے تھے۔ جونہی عمیر گھوڑے سے نیچے اُترا تو اُس کے ہاتھ اپنی جگہ قائم نہ رہ سکے جس کے باعث اُس کی پھٹی پتلون پر سب کی نظر پڑ گئی۔ شجرہ نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ''شکر ہے، شکر ہے پہلی باری میری نہ تھی'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شرم سے شجرہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

ہمارا رشتہ دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہے۔ گھر کے لوگ مجھے اکثر یہ کہہ کر چھیڑتے ہیں ''ابو جی بڑے خوش نظر آ رہے ہیں'' جواب میں مسکرا کر میں جب کہتا ہوں ''زبردستی والی خوشی ہے'' باورچی خانے سے منہ باہر نکالتے ہوئے بہو کہتی ''رہنے دیں ابو جی ہم آپ کے سامنے بچے سہی مگر اتنے بچے نہیں ہیں کہ اصلی اور نقلی خوشی بھی نہ پہچان سکیں'' اس کے بعد میرے پاس یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا بلاشبہ انسانوں سے ہی زندگی کا حُسن قائم ہے اور راشدہ تو پھر ایک بہو فوراً لقمہ دیتی ''چڑچڑی خاتون ہیں'' ٹھنڈی آہ بھر کے ''نہیں بھئی ایسی بات نہیں ہے وہ وقت اور تھا وہ بات اور تھی راشدہ بہت لاجواب خاتون ہیں''۔ ''یہ ہوئی نا بات تو پھر آج کہاں ڈنر پر لے جا رہے ہیں؟''۔

اگر ڈنر پہ جانا تھا تو صاف کہہ دیتے اتنی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہو نے بھی بے تکلفی سے کہا ''کھانا تو ہم ویسے بھی سکتے ہیں آپ

سے ڈنرلیکن اب آنٹی کے ساتھ جانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا، کیوں آنٹی ہے نا''
راشدہ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے۔''میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں تو آپ
لوگوں کی خوشی میں خوش ہوں'' تالی پرتالی مارتے ہوئے''یہ ہوئی نابات''

دوسرے دن دفتر سے واپسی پر گھر میں خاموشی دیکھ کر ہم نے کہا چلو
راشدہ سے گپ شپ کرتے ہیں۔گھر میں داخل ہوتے ہی راشدہ کو کئی آوازیں
دیں مگر جواب نہ پا کر اُس کے بیڈروم میں گئے وہاں شجرہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور
اُس کا سر بیڈ پر رکھا ہوا تھا۔ہم نے یہ تسلی کرنے کے لیے کہ شجرہ ہی بیٹھی ہے اُس
کے قریب جا کر سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا''شجرہ خیریت تو ہے،تمہاری ماما کہاں
ہیں''شجرہ نے بڑے غصے سے ہمیں دیکھا اور ہاتھ جھٹک کر کھڑے ہوتے ہوئے
کہا''مجھے نہیں معلوم''

ایک لمحے کے لیے شجرہ کا رویہ ہمارے لیے بہت حیران کُن تھا۔اس
سے قبل کہ ہم آگے بڑھ کر اُس سے اس رویے کا سبب دریافت کرتے وہ خود آگے
بڑھ کر ہمارے سینے سے چمٹ گئی''مجھے اپنے سینے میں چھپا لو''اس غیر متوقع
صورت حال کے لیے ہم قطعی تیار نہ تھے پھر بھی اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
کہا''کیوں نہیں بیٹا،کیوں نہیں''شجرہ شیرنی کی طرح دہاڑتے ہوئے سینے سے
الگ ہو کر''میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں،نہیں ہوں تمہاری بیٹی''پیر پٹکتے ہوئے ایک
ہاتھ سے آنسو صاف کیے اور اپنے بیڈروم میں جا کر دھن کی آواز سے دروازہ
بند کر لیا۔کافی دیر میں نے شجرہ،شجرہ کہہ کر اُسے پکارا مگر اُس نے کوئی جواب نہ
دیا۔البتہ اُس کے سسکنے کی آوازیں مجھے باہر صاف سنائی دے رہی تھیں جنہیں
شجرہ نے ربّی شیر گل کے گائے بابا بلھے شاہ کے کلام کی تیز آواز سے کمرے میں
دفن کر دیا۔۔۔

نا میں مومن اِچ مسیت آں
نا میں اِچ کفر دیاں ریت آں
نا میں پاکن اِچ پلیت آں

نا میں اندر وید کتاب آں
نا میں رہندا بھنگ شراب آں
نا میں رہندا مست خراب آں

نا میں شادی نا غمنا کی
نا میں پلیت اِچ پاکی
نا میں آبی نہ میں خاکی
نا میں آتش نا میں پھون

بلھا کیہہ جاناں میں کون۔۔۔

-بقیہ-

حوصلے کی موت

وقت کے تقاضے کو کچلا۔دبایا جاسکتا ہے؟جاچکا ہے؟
یہ ایک مانی ہوئی سچائی ہے کہ:ذات کا اظہار بڑی قربانی چا
ہتا ہے۔

یہ دیس۔جس کے باشندوں کے خمیر میں سادگی اور فرما
نبرداری گندھی ہوئی ہے۔سچائی جن کا گُن ہے۔وہیں کے وہیں
ہیں۔جو ملک کے لئے چیخ و پکار کرتے ہیں اور اعلیٰ ظرفی سے غداری کا
اعتراف کرتے ہیں۔یہ ڈھونگی منافق ہیں جو دانا اور واقف کار کا
ڈھونگ رچاتے ہیں۔وطن کو بیچنے والوں سے
دوستی،وقت کا تقاضا اور موقع کی ضرورت کا ناٹک کرتے ہیں۔جب
ان پر اعتراض ہوتا ہے تو یہ اپنے ڈھونگ اور منافقانہ کرتوتوں کو
چھپانے کے لئے،تاریخ اور حب الوطنی کا یقین دلانے کے لئے فتو
ؤں کا سہارا لیتے ہیں۔

تاریخ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی یہ ناکام کوشش ہے۔
اور یہ محض مسخرہ ناٹک ہوتا ہے،جو کہ........
کیا میں بھی کوئی سوانگ رچاؤں؟کوئی بہانہ،اٹکل بازی،مکا
ری،اپنے اقبالِ جرم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے فتوؤں کا سہارا
لوں؟

بہتر نہیں کہ اعتراف کروں:میں اپنے سچے جذبے کے اظہار کا دباؤ
نہیں سہار سکتا۔اس اعتراف سے مجھے اس حقیقت کا بھی سامنا کرنا چا
ہیئے کہ یہ میری ذات کی موت ہے اور میں ایک ٹوٹی ہوئی روح ہوں۔
چلتے پھرتے انسانوں میں بھی،مردہ انسان اور زندہ انسان
ہوتے ہیں۔

ایک جری شخص کی مردہ زندگی،جیسے زندگی کی میکانکی اور لگی
بندھی روٹین میں ایک مشین کے بے جان پُرزے کی طرح مقرر کردہ
حدود میں حرکت کرتے رہنا،مگر بظاہر زندہ کی طرح کا وجود رکھنا۔
یہ محض حوصلہ کی موت ہی نہیں بلکہ ذات کی زندگی کی موت ہے۔

* ڈیپارٹمنٹ آف پبلک ریلیشن (جس کے ذریعے حکومت اہل قلم
لوگوں اور رپورٹروں کی نگرانی کا کام لیتی تھی)

حوالہ:کتاب'حویلی ءجاراز'(کہانیاں)،مصنف:مانک پبلیشر:روشنی
پبلیکیشن کنڈیارو،۲۰۰۳ء

''گردشِ شام وسحر''

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

مشورے قائم رہیں تو اچھا ہے　　رابطے قائم رہیں تو اچھا ہے

رہنما کہتے ہیں باہم بیٹھ کر !!　　مسئلے قائم رہیں تو اچھا ہے

قوم کو گمراہ کرنے کے سبھی　　مشغلے قائم رہیں تو اچھا ہے

مفلسی و بے بسی کے سارے ہی　　سلسلے قائم رہیں تو اچھا ہے

-ق-

جس میں تازہ ہواؤں کے اگر　　تذکرے قائم رہیں تو اچھا ہے

کچھ نہ کچھ تو ہاؤ ہُو بھی چاہیے　　سر پھرے قائم رہیں تو اچھا ہے

ایم۔کے۔بھان تمؔنّا

(جموں،کشمیر)

محبت کے گھنے بادل ہیں برسے　　نظر ٹکرائی جب اُن کی نظر سے

ستم کرنے سے پہلے سوچ لینا　　بچا ہے کون آہوں کے اثر سے

نگاہوں میں تھا اک پُر لطف منظر　　اُسے ملنے کو جب نکلا میں گھر سے

ہے جو حق بات کہہ دے گا وہ لیکن　　یہ دل خاموش ہے دُنیا کے ڈر سے

مجھے درکار ہے بس اپنی منزل　　غرض کیا گردشِ شام و سحر سے

وہ مجھ سے ہیں بہت برہم تمنا　　پریشاں ہے مرا دل اس خبر سے

حسنین اقبال

(تربت،بلوچستان)

تجھ کو کھویا تو یہ کمال ملا　　ہجر میں بھی ہمیں وصال ملا

اپنا اپنا نصیب ہے یارو!　　اُس کو خوشیاں ہمیں ملال ملا

بعد مدت کے وہ ملا تب بھی　　اُس کی نظروں میں اِک سوال ملا

یہ ستارے یہ چاند اور یہ پھول　　ہم کو اِن میں تیرا جمال ملا

جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی　　کس قدر غم سے وہ نڈھال ملا

کیا بتائیں اُس ایک پل کا تمھیں　　بن کے دشمن کی جب وہ ڈھال ملا

شاید اس میں بھی کوئی حکمت ہو　　یہ جو بن تیرے اب کے سال ملا

جب بھی حسنینؔ سوچا غالبؔ کو　　اک نیا پھر ہمیں خیال ملا

○

عطاءالرحمٰن قاضی

(عارف والا)

ہوا کے تیر چلے، آسماں کمان ہُوا ۔۔۔ چراغ، رات کھنڈر میں لہولہان ہُوا

وہ فاصلے تھے کہ تمثال آفریں تھی نگاہ ۔۔۔ وہ رتجگے تھے کہ آباد ہر مکان ہُوا

سُنا ہے پھولوں سے جنگل مہکنے والا تھا ۔۔۔ جب ایک شام اچانک وہ مہربان ہُوا

بھری بہار میں اُس کو تلاش کرتے ہوئے ۔۔۔ میں ایک دھیان سے گزرا تو بےنشان ہُوا

عجیب معرکہ کل رات تھا خداؤں میں ۔۔۔ زمیں، زمیں نہ ہوئی کوئی آسمان ہُوا

یہ سسکیاں، یہ تہِ خاک جاگتی حیرت ۔۔۔ عجب معاملہ رنگوں کے درمیان ہُوا

پھر ایک روز عطا یوں ہُوا چراغ جلے ۔۔۔ ستارے کانپ اُٹھے، شہر داستان ہُوا

○

عارف شفیق

(کراچی)

اپنے دریا سے کنارہ کر کے ۔۔۔ چل دیا پانی وہ کھارا کر کے

روز پڑھتا ہوں خدا کی تحریر ۔۔۔ سب کے چہروں کو سپارہ کر کے

میں تو دل آنکھیں وہیں چھوڑ آیا ۔۔۔ لوگ لوٹ آئے نظارہ کر کے

دیکھ لینا کہ امَر کر دے گا ۔۔۔ وہ مجھے زندہ دوبارہ کر کے

عرصہِ حشر سے گزروں گا میں ۔۔۔ اس کی رحمت کو سہارا کر کے

کُھل گیا راز دوعالم مجھ پر ۔۔۔ ایک حجرے میں گزارا کر کے

خالی دامن کسی درویش سے پوچھ ۔۔۔ فائدہ کیا ہے خسارہ کر کے

اپنے ہی پاس رکھا سارا نظام ۔۔۔ اس نے دنیا کو ہمارا کر کے

اپنے شعروں میں دکھایا عارف ۔۔۔ میں نے جگنو کو ستارہ کر کے

○

انجم جاوید

(کراچی)

بادشاہت تمام ہوتی ہے ۔۔۔ دل کی طاقت عام ہوتی ہے

اس کی حسرت بیاں سے ہے باہر ۔۔۔ جس کی حسرت تمام ہوتی ہے

گر گیا ہے شکست کھا کر وہ ۔۔۔ اب عداوت تمام ہوتی ہے

زندگی کا وجود ہے جب تک ۔۔۔ کب حکایت تمام ہوتی ہے

آخرِ شب یہ زندگی نے کہا ۔۔۔ تھی جو مہلت تمام ہوتی ہے

سر حدِ زیست کو عبور کیا ۔۔۔ لو مسافت تمام ہوتی ہے

○

تصوراقبال

(اٹک)

سر کے بدلے شکاری نے پر رکھ دیے
کچھ پرندوں کے پر کاٹ کے رکھ دیے

جتنے اصلی جواہر تھے اُن کو دیے
وہ جونقلی تھے سب اپنے گھر رکھ دیے

اُس نے دستار مانگی تھی ہم سے مگر
ہم نے سر اُس کے پیشِ نظر رکھ دیے

یوں تو دیوار ہوتی ہے حائل مگر
جانے کیوں اُس نے رستے میں در رکھ دیے

وہ وسائل جو رب نے دیے تھے ہمیں
ہم نے غیروں کے زیرِ اثر رکھ دیے

اپنے حصے کی خوشیاں بھی رکھ دیں اُدھر
اُن کے حصے کے غم بھی اِدھر رکھ دیے

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

اب مرے فن کی وہ قیمت نہیں دیتا مجھکو
یہ ہنر بھی کوئی شہرت نہیں دیتا مجھکو

خواب دیتا ہے حقیقت نہیں دیتا مجھکو
آنکھ تو دی ہے بصارت نہیں دیتا مجھکو

کب تلک جھوٹ کا چلتا ہوا سکّہ دیکھوں
ایک سچ کی بھی جسارت نہیں دیتا مجھکو

میں تو پھرتا ہوں بھٹکتا ہوا تنہا تنہا
کوئی دنیا میں محبت نہیں دیتا مجھکو

میں اگر چاہوں الٹ دوں ابھی چہروں سے نقاب
میرا اخلاق اجازت نہیں دیتا مجھکو

دور ہی دور وہ رہتا ہے خدا جانے کیوں؟
ایک لمحے کی بھی قربت نہیں دیتا مجھکو

○

احسان قادر

(لاہور)

کوئی امکان ہو بھی سکتا ہے
شعر پہچان ہو بھی سکتا ہے

ترکِ الفت میں عافیت بھی ہے
اور نقصان ہو بھی سکتا ہے

ہم نے چھوڑا نہیں ہے دامنِ ہوش
دل تو نادان ہو بھی سکتا ہے

کاٹ لیں ہم اگر شبِ ہجراں
عشق آسان ہو بھی سکتا ہے

میں سمجھتا رہا گماں جس کو
میرا ایقان ہو بھی سکتا ہے

راحتِ جان ہے جو میرے لئے
دشمنِ جان ہو بھی سکتا ہے

زخمِ دل کا خیال رکھیے گا
یہ گلستان ہو بھی سکتا ہے

عہدو پیماں وہ اپنے بھول گیا
کل کو انجان ہو بھی سکتا ہے

ہیں وہ غافل تو کوئی بات نہیں
کل کو احسان ہو بھی سکتا ہے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

کچھ سوچتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں
کیا کھوجتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

جو بھی لکھا تھا، خود سے گویا ہم کلام تھے
یوں بولتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

کوشش کے باوجود، وہ کتبہ نہیں ملا
گو ڈھونڈتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

کوئی اچھوتی سوچ کا روزن تھا ساتھ ساتھ
جو کھولتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

ذہنی سُرور ، لطفِ صبح، آ گہی کے رنگ
سب گھولتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

ہَر وقت یاد آنے کی خواہش سے نازلیؔ
کچھ بھولتے رہے ہیں، کتابوں کے درمیاں

○

دیپک آرسی

(جانی پور، بھارت)

حوصلے کا ماندگی سے ہی پتہ لیتا ہوں میں
زِندگی جینے کو سانسیں پھر بجُا لیتا ہوں میں

مشکلوں میں راحتوں کے گیت گا لیتا ہوں میں
درد کی شِدّت میں بھی تسکین پا لیتا ہوں میں

بے کرانی آ ہی جائے سامنے صحرا کی تو
ریت پر اُنگلی سے اپنا گھر بنا لیتا ہوں میں

میری اِس جادوگری پر دشت بھی حیران ہے
کیسے اپنی پیاس کو پانی بنا لیتا ہوں میں

دوست میرا زخم دیکھے گا تو مر ہی جائے گا
اُس کی خاطر چوٹ کھاتا ہوں چھپا لیتا ہوں میں

میں عداوت کو جگہ دل میں نہیں دیتا کبھی
کوئی کِتنا غیر ہو اپنا بنا لیتا ہوں میں

مجھ میں جھکنے کی ادا ہے عاجزی شیوہ مِرا
گر جھکانا ہی پڑے پربت جھکا لیتا ہوں میں

درد کا کیا حد سے بڑھ بھی جائے تو پھر آرسیؔ
دائرہ برداشت کا اپنا بڑھا لیتا ہوں میں

○

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

(لاہور)

پڑا جب سے مجھے چسکا تُمھارا
مرا لُقمہ بھی ہے لُقمہ تُمھارا

تُمھارے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں
اُٹھا کر کب سے میں بستہ تُمھارا

نئے جوتے، نئے کپڑے خریدے
چُرا کر کان کا جُھمکا تُمھارا

کبھی جاتی نہیں بجلی تُمھاری
کبھی رُکتا نہیں پنکھا تُمھارا

محبت یوں بھی مجھ کو راس آئی
مرے خرچے ہیں اور پیسہ تُمھارا

سمجھ کر پھل میں کب سے کھا رہا ہوں
اُٹھا کر خاک سے چھلکا تُمھارا

نبیل اِک ساتھ ہوتے بھی تو کیسے
ہماری جھونپڑی، بنگلہ تُمھارا

○

شکیل جمالی

(کراچی)

سب کے ہوتے ہوئے لگتا ہے کہ گھر خالی ہے
یہ تکلّف ہے کہ جذبات کی پامالی ہے

آسمانوں سے اُترنے کا ارادہ ہو تو سن
شاخ پر ایک پرندے کی جگہ خالی ہے

جس کی آنکھوں میں شرارت تھی وہ محبوبہ تھی
یہ جو مجبور سی عورت ہے یہ گھر والی ہے

رات بے لطف ہے پرہیز کے سالن کی طرح
دن بھکاری کے کٹورے کی طرح خالی ہے

مدّتوں خود کو بھروسے میں لیا ہے میں نے
تب کہیں تیری محبت نے سپر ڈالی ہے

کوئی ہر قبر پہ بیٹھا ہے مجاور کی طرح
ہر خزانے پہ کسی سانپ کی رکھوالی ہے

○

سیما گپتا

(دہلی، بھارت)

وہ بن کے گیت ، کبھی نظم کی صدا بن کر
اٹھا ہے درد بھی محبوب کی ادا بن کر

سمجھ رہے تھے محبت کو ہم خدا لیکن
ہمارے سر سے وہ گزری ہے اک قضا بن کر

جو تپتی ریت پہ بنتی ہے آگ کا پیکر
چمن میں چلتی ہے وہ سر سر و صبا بن کر

میرے قریب ہی رہتا ہے جب بھی یاد کروں
وہ میرا یار میرے درد کی دوا بن کر

دعا میں مانگ رہی ہوں یہ روز و شب سیماؔ
لبوں پہ آئے وہ عشق کی دعا بن کر

○

دُرّ انجم

(لاہور)

میں آج ہوں مجھکو کل کا خوف و ہراس کیوں ہو
میں خود سمندر ہوں مجھکو پانی کی پیاس کیوں ہو

میں کسقدر تلخ ذائقوں کو نگل رہی ہوں
مرے رگ و پے میں لذتوں کی مٹھاس کیوں ہو

میں اپنی کشتی کو خود بھنور سے نکالتی ہوں
مری نگاہوں میں کوئی خوئے سپاس کیوں ہو

میں اک سراپا ہوں ایک مرکز ہوں ایک دل ہوں
مرے نہیں ہو تو تم مرے آس پاس کیوں ہو

میں لمحہ لمحہ حقیقتوں کی پیامبر ہوں
یہ زندگی مجھ سے پوچھتی ہے اداس کیوں ہو

مجھے یقیں ہے خدائے واحد کی رحمتوں پر
تو پھر مرا ان خداؤں سے التماس کیوں ہو

میں بزم انجم سے اٹھ کے دنیا میں آ گئی ہوں
یہ پوچھتے ہیں کہ تم ستارہ شناس کیوں ہو

○

ثمریز بک

(شام میں انقلاب کے لئے آخری حدوں تک جانے والی جی دار خاتون)

سلمٰی اعوان (لاہور)

2008ء کے اُن دنوں جب میں دمشق میں تھی۔ایک گرم سی صبح عرب رائٹرز یونین کے مزہ Mezzeh میں واقع دفتر شامی لکھاریوں سے ملنے لگی۔

مزہ Mezzeh میں دفتر ڈھونڈ نا مصیبت بن گیا تھا۔چلو زینبیہ کا عباس ہوتا تو سود یدسو لحاظ والا معاملہ یقینی تھا کہ وہ جگہیں ڈھونڈنے میں ڈنڈی نہیں مارتا تھا۔مگر اس ڈرائیور نے تو ماتھے پر آنکھیں رکھی ہوئی تھیں۔بڑا ہی بدلحاظ اور بے مروتا سا۔بارے خدا ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے رک کر اُس نے بتایا کہ یہی آپ کی مطلوبہ جگہ ہے۔

سچی بات ہے بڑی متاثر کن عمارت تھی۔بڑے بڑے شاندار آراستہ پیراستہ کمرے۔پبلیشنگ سے متعلق مختلف شعبے،ہال،کیفے ٹیریا۔

میں نے چلتے ہوئے خیال ہی نہیں کیا کہ دن جمعے کا ہے۔ہمارے لوگوں اور مسجدوں کی طرح دمشق میں بھی جمعے کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔لوگ بارہ بجے ہی دفتر خالی کر جاتے ہیں۔

''جی جمعہ پڑھنا ہے۔''

ساڑھے نو بجے تو ہوٹل سے چلی تھی۔جگہ ڈھونڈنے میں خجل خواری بھی بہت ہوئی۔ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔جب مطلوبہ جگہ پہنچی۔پہلے تو پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں ماریں۔کسی ذمہ دار فرد کی متلاشی ہوئی۔یونین کے چیئرمین بارے جانا کہ وہ تو کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔ڈائریکٹر بھی غائب تھے۔

ہاں البتہ رابطہ آفیسر قاسم دیب سے ملنا ہوا۔جنہوں نے کہا تھا۔

''آپ کیسے وقت آئی ہیں؟ لوگ جمعے کی وجہ سے چلے گئے ہیں۔ ذرا جلدی آتیں تو بہت سے لوگوں سے ملنا ہو جاتا۔''

اُن سے تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔میں نے سوال تو بتیرے نو کیلے کئے مگر مجال تھی کہ کسی ایک کا جواب مجھے منفی شکل میں ملا۔صحافیوں اور ادیبوں کے لئے حکومت کی عنایات و نوازشات کی لمبی چوڑی فہرست گنوا دی۔گھر کے لئے قرضے اور طبی سہولتوں کا ذکر بڑی شد و مدّ سے کیا۔

سیریا کی ادبی روایات اس کے خوبصورت امیرانہ ثقافتی ورثے کی طرح بہت حسین ہیں۔اس نے بہت سی مشکلات اور سختیوں کو سہا ہے۔وضاحت ہوئی تھی۔

اُن کے اضطراری انداز،کلائی کی گھڑی کو دو تین بار اچٹتی سی نگاہ سے دیکھنے کی فضول سی کوشش نے مجھے تنبیہ کی۔

''پاگل ہوا ٹھو۔وہ تم سے جان خلاصی چاہتا ہے اور تم چمٹی جاتی ہو۔''

بہر حال جو مسئلہ تھا وہ بھی جلد ہی سمجھ آ گیا تھا کہ ہم اکٹھے ہی باہر نکلے تھے۔مرکزی دروازے سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لیتے ہی وہ آہستگی سے بولے تھے۔

''کمروں میں کیمرے نصب ہیں۔گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔''

''اوہو۔''

ثمریز بک سے ملنا بھی ایک خوبصورت تجربہ تھا۔اس کا ایڈریس قاسم دیب نے دیتے ہوئے کہا تھا۔

آپ اُس سے ضرور ملئے۔بہت ہی منفرد صلاحیتوں کی حامل خاتون ہے۔رائٹر اور جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ فلم سکرپٹ،ٹی وی ڈرامہ رائٹر،ہیومن رائٹس ایکٹیوسٹ اور وویمن رائٹس کی علم بردار ہے۔دبنگ عورت آپ کے سوالوں کے جواب زیادہ عمدگی سے دے گی۔یہیں مزہ میں ہی فی الحال اپنی ایک عزیزہ کے پاس چند دنوں کے لئے رہ رہی ہے۔پتہ بھی انہوں نے دیا اور جائے وقوع بھی اپنے کارڈ پر لکھ دی کہ ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھنے میں سہولت رہے۔

''سمر بڑی دبنگ ہے۔آپ کو اُس سے ملنا یقیناً اچھا لگے گا۔''

خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہی ایک بار پھر اسی بات کو دہراتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔عرب روایات کے برعکس انہوں نے مجھے لفٹ کی پیش کش نہیں کی۔کیا یہاں بھی انہیں کوئی خوف لاحق تھا یا بے اعتنائی تھی؟

میں نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔خوش قسمتی کہ سواری بھی فوراً مل گئی اور گھر کی تلاش میں بھی زیادہ بھٹکنا نہ پڑا۔

چار منزلہ فلیٹ کے پہلے فلور پر جب گھنٹی پر ہاتھ رکھا میرا دل دھڑک رہا تھا۔جانے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ پروردگار اب اتنی خجل ہوئی ہوں تو ملاقات ہو جائے۔جب کسی بندے کی شخصیت میں اتنے بہت سے اوصاف شامل ہوں۔وہ اتنی جہتوں کا مالک ہو تو پھر اُس کا ملنا کارے دارد والے معاملے جیسا ہی ہوتا ہے۔

ایک سیاپا کہہ لیجیے یا احساس کمتری کا احساس جو کچھ اپنے لباس اور حُلیے کے سلسلے میں تھا کہ ایک تو پانچ چھ کلو کا عبایا پہنے ہوئے ہوں۔صورت ویسے ہی مسکینوں جیسی ہے۔شامی عورتیں بہت حسین دلبری اور انتہائی فیشن ایبل ہیں۔حجاب اور عبایا پہننے والیاں بھی کون سا کسی سے کم ہیں۔نک سک سے آراستہ چاند کی طرح چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں۔

اب سیڑھیوں پر رُک کر ہلکا سا سپرے کیا تھا۔بالوں کو درست اور تھوڑا سا ہونٹوں کو لال کرنا ضروری سمجھا تھا۔ایسا سب کرتے ہوئے دل ذرا سا بھی مطمئن نہیں تھا۔کمبخت یہ تو اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے والی بات تھی۔مگر کرتی کیا؟ سدا سے ایسی اللّی بلّلی ہوں۔

بہر حال یہ سب کرنے کے بعد بسم اللہ پڑھ کر بٹن پر انگلی رکھ دی۔میری بیٹی کی عمر کی ہوگی وہ جس نے دروازہ کھولا تھا۔خوبصورت،دل کش خدوخال

اورسنہری بالوں والی۔ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر چند لمحوں کی حیرت اُس کے چہرے پر بھی بکھر گئی تھی۔ میں نے دیر نہیں لگائی۔فوراً ہی تعارف کروا دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ جب اُس نے پاکستان کا نام سنتے ہی مجھے گرم جوشی سے پذیرائی دی اور آنے کا راستہ دکھایا۔ یہ بے حد خوبصورت اور آراستہ پیراستہ فلیٹ تھا۔ لیونگ روم میں آ کر بیٹھنے تک کے وقفے میں میری نظر بازی نے مکینوں کی خوش حالی وخوش ذوقی کی کہانی سنا دی تھی۔ثمر کی آنکھیں ہیرے جیسی چمک لئے جگمگاتی تھیں۔

مگر بڑا سیاپا پڑا۔ثمر انگریزی میں نری پیدل تھی۔ اس کے ہاں بس کہیں کہیں ایک آدھ جملے کی ہی گنجائش تھی۔ مگر اوپر والا بھی بڑا رحیم و کریم ہے۔ بندے کو مشکلات سے نکالنا جانتا ہے۔سفر میں اس کے لئے خیر و برکت کے دروازے کھولنا فرض سمجھتا ہے۔

یہی بس اس وقت ہوا جب کمرے میں ایک ایسی خاتون داخل ہوئی جو ادھیڑ عمری کے باوجود ایسی حسین تھی کہ بس ٹک ٹک دیدم ودم نہ کشیدم والا معاملہ تھا۔میرے اس درجہ جذب کو اس نے پسندیدگی سے دیکھا اور مسکرا دی۔

اُس کی انگریزی بھی لاجواب تھی۔اتنی لاجواب کہ گمان پڑتا تھا کہ اصلاً نسلاً انگریز ہے۔مگر نہیں وہ ثمر یزبک کی رشتے دار تھی۔اس کی ماں کی عزیز۔وہ اسامہ بن لادن کی پہلی بیوی کی بھی رشتے دار تھی۔ڈھیروں ڈھیر باتیں تو بعد میں ہوئیں۔ثمر اور میرے درمیان ترجمانی کے فرائض بھی اس نے بعد میں ادا کئے۔ پہلے ایک بڑا سنسنی خیز سا انکشاف ہوا جو کسی طور ایک دلچسپ سی کہانی سے کم نہیں تھا۔

تو قصّے کا آغاز 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ جسے یوم کپور کی جنگ بھی کہتے ہیں سے ہوا۔ زمانہ بھٹو کا تھا جو عرب ممالک کے کم و بیش سبھی حکمرانوں کے یاروں کے یار تھے۔درخواست شام کے حافظ الاسد کی جانب سے آئی تھی کہ انہیں چند بہترین جنگی ہوا بازوں کی ضرورت ہے۔

اِس جنگ میں حصہ لینے کے لئے پاکستان ایئر فورس کے چند جیالے پائلٹ شام سدھارے جنہوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور کسی حد تک فتح کو ممکن بنانے میں مدد دی۔اسرائیل کو اپنی ہزیمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

یہاں تک تو جو واقعہ تھا اس سے میں خود بھی تھوڑی سی واقف تھی۔مگر آگے جو سننے کو ملا وہ بڑا دلچسپ تھا۔

جنگ کے بعد ان ہوا بازوں کو حافظ الاسد نے اپنے صدارتی محل میں خصوصی ڈنر پر مدعو کیا۔ یہ ایک طرح دوست ملک کے لئے اظہار محبت تھا۔ اظہار ممنونیت تھا۔اسد فیملی کے چند افراد بھی مدعو تھے۔حافظ الاسد کی بیوی کی ایک کزن بھی تقریب میں مدعو تھی۔

اور یہ کزن اصل وہی خاتون تھیں۔ پاکستانی ہوا بازوں میں تین چار بہت وجیہہ صورت، دراز قد اور بڑی ڈیشنگ قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ پتہ چلا کہ ایک پاکستانی پائلٹ تو ایسا بھایا کہ میل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر لیا۔ میں نے نام جاننے کی بہتیری کوشش کی مگر انہوں نے گریز کیا۔ پاکستانی شادی شدہ دو بچوں کا باپ تھا۔اِس کہانی کا انجام تو بہر حال المیہ ہی تھا۔تاہم اس طوفانی قسم کے عشق کی داستان، بہت عرصے تک خاندان میں گردش کرتی رہی۔

ثمر کا فیملی پس منظر علوی فرقے سے ہے۔وہ جبلہ Jableh ایک ساحلی علاقے جو لاطاکیہ کے قریب ہی واقع ہے 1970ء میں انتہائی دولت مند اور صاحب ثروت Alawi گھرانے میں پیدا ہوئی۔ پانچ بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے منفرد انقلابی سوچ وذہن رکھنے والی باغی سی بچی تھی۔

اپنے بھائیوں کے مقابلے میں اُس کا طرز زندگی کیوں مختلف ہے؟ ٹوک ٹوک کا سلسلہ لڑکیوں کے ساتھ زیادہ کس لئے ہے؟ ترجیح لڑکوں کو کیوں دی جاتی ہے؟ اور وہ سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔

میں آزادی چاہتی تھی۔اس ماحول میں میرا دم گھٹتا تھا۔ ہمارے روایتی معاشرے میں یہ بڑی قبیح حرکت تھی۔ایک لڑکی کے لئے۔لوگوں کا خیال تھا کہ میرے ساتھ کوئی مرد ہے۔ جو کہ بالکل غلط تھا۔ مجھے تنہا اپنا مستقبل خود بنانے میں دلچسپی تھی۔ میں رائٹر بننے کی خواہش مند تھی ۔لکھنا چاہتی تھی ۔ معاشرے کے دوغلا پن اور منافقتوں پر کھل کر بات کرنے کی متمنی تھی۔

''مجھے اعتراف ہے کہ اپنی فیملی کے لئے میں اذیت اور شرمندگی کا باعث رہی۔اکثر مجھے ندامت بھی محسوس ہوتی تھی۔''

انیس سال کی عمر میں وہ ایک بار پھر بھاگی۔کچھ عرصہ اکیلا رہنے کے بعد اُس نے شادی کر لی اور پیرس چلی گئی جہاں بیٹی بھی پیدا ہوئی۔شادی صرف چار سال رہی۔دوسالہ بیٹی کے ساتھ وہ پھر دمشق میں آ گئی۔ بہت سے کام شروع کئے۔ڈرامے، فلم سکرپٹ، ڈاکومنٹری بنانے کا سلسلہ۔ وویمن آف سیریا جیسے پرچے کی ادارت۔انتون مقدسی Anton Maqdesi شام کے عظیم مفکر، سیاست دان اور انسانی حقوق کا علمبردار جیسی شخصیت پر ڈاکومنٹری بنائی۔ ہیومن رائٹس اور وویمن رائٹس کے لئے کام شروع کر دیا۔ یہ اُس کے لئے کس قدر مشکل وقت تھا۔ ناولوں کی اشاعت سے قبل بہت سے دیگر شعبوں میں کام کرنے سے گو اُس نے اپنے معیار زندگی کو غربت سے تھوڑا سا اوپر ضرور رکھا تاہم اپنے خاندان اپنے عزیزوں سے کسی قسم کا کوئی میل جول نہیں استوار کیا۔شہر سے باہر مضافاتی علاقے میں ایک کمرے کے گھر میں رہتی رہی۔

اُس کے ناول طفلت اس سماء Tiflatas Sama (آسمانی لڑکی) اور سلسل salsal نے بڑی دھوم مچائی اِن ناولوں نے شامی معاشرے میں موجود منافقتوں، دوغلا پن اور دیگر بہت سی قباحتوں کو عریاں کیا۔

دمشق میں گزرے میرے خوبصورت دنوں میں ایک مزید حسین دن کا اضافہ ہوا۔ دل میں سدا بسیرا کرنے والی یادوں میں ایک مزید یاد شامل ہوئی۔ اُن کے گھر اُس دن ملقوبہ پکا تھا۔ چاندی کی سینی میں اُس کی خوش رنگی بہت بھائی۔ ذائقہ بھی کمال کا تھا۔ زیتون کے کالے اور سبز پھل میں جھانکتے کھیرے کے قتلوں اور قہوے نے لطف بڑھایا۔

دوپہر گزرنے اور شام اُتر آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ جب میں رخصت ہوئی۔ میں نے ثمر کا سیل نمبر اور ای میل ضرور لیا۔ تاہم پاکستان آنے کے بعد کبھی اُس سے رابطہ ممکن نہ ہوا۔

اُس کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی تحریک ڈاکٹر ہدا کی اُس میل سے ہوئی تھی۔ جب جنگ کے دنوں میں وہ مجھ سے رابطے میں تھی۔ دو لائنوں کی خبر نے بھولی بسری یاد کو تازہ کر دیا تھا۔

کچھ احمد فاضل کچھ ڈاکٹر ہدا اور کچھ انٹرنیٹ سے میں نے اُس کے بارے مزید جانا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ تلخ ہوتی گئی۔ انقلاب اور جمہوریت کی باتیں کرنے لگی۔ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھی کہ پکڑ دھکڑ نے پریشان کیا۔ 2011ء میں جب مزاحمت شروع ہوئی۔ اُس نے بلند آہنگ زبان میں صرف ایک نعرہ لگایا تھا۔ یہ انقلاب ہوگا۔ غریب کا امیر کے خلاف، کمزور کا طاقتور کے خلاف اور جمہوری روایات کا آمریت کے خلاف۔

2012ء میں اُس کی بڑی منفرد قسم کی کتاب A Woman in the Cross Fire مارکیٹ میں آئی۔ یہ ناول نہیں ڈائری ہے۔ کسی ڈراؤنے خواب کی مانند یہ کتاب اس جدوجہد کی کہانی کو پرت در پرت کھولتی ہے۔ جب وہ اسد حکومت کے خلاف مظاہرین کے ساتھ سینہ تان کر کھڑی تھی۔ مار کھاتی، بے عزتی کرواتی۔ متاثرین کے زخموں پر پھاہے رکھتی۔ اسپتالوں میں بھاگتی، اخبارات کو مضمون بھیجتی۔ بیٹی کے ساتھ جگہیں اور گھر تبدیل کرتی تھی۔ مظاہرین کے انٹرویو لینے، اسپتالوں میں ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرنے، گلی محلوں میں متاثرین کو چیزیں فراہم کرنے اور یہ سوچنے کہ وہ اپنے ملک اور اس کے لوگوں کے لئے مزید کیا کر سکتی ہے؟

یہی وہ دن تھے جب اُسے دھمکیاں بھی ملتیں۔

چاقو ہمیشہ ایک سہارے کے طور پر اس کے ساتھ ہوتا۔ ایسے ہی دنوں میں سیکورٹی فورسز کے چند لوگ اس کے گھر آئے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُسے ایک ایسی جگہ لے گئے جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ اُس کی کلائی کو جلایا گیا۔ زدوکوب کیا گیا۔ ذرا سا ہوش سنبھالنے پر اس نے اپنا چاقو نکالا اور تشدد کرنے والے پر پل پڑی۔ مرد نے دھکا دے کر اُسے زمین پر گرایا۔ کچھ دیر بعد اُسے اٹھایا گیا اور دو آدمی اُسے ایک اور سیل میں لے گئے جہاں اس نے تین نوجوان مردوں کو دیکھا۔ اُن کے ہاتھوں پر دھاتی شکنجے چڑھے ہوئے تھے۔ اُن کی انگلیوں کے ننگے سرے زمین کو چھوتے تھے۔ انہوں نے اُسے ایک جگہ کھڑا کیا۔ ایک نے اُس کا سر اوپر کیا۔ ایک ماسک سا جس میں سے صرف اس کی ناک باہر تھی پہنایا۔ اس کے بعد وہاں کیا تھا؟ چیخیں۔ کراہیں، دردناک منظر، خوفناک سانس کو روکنے والے لمحے۔ ہمت تو اس نے ان سب کے باوجود نہیں ہاری تھی۔ ہاں مگر وہ بڑا کٹھن وقت تھا۔

پن (Pen) انٹرنیشنل سوسائٹی ایوارڈ کمیٹی نے اسے ایوارڈ سے نوازا۔ دراز قد، خوبصورت، حسین آنکھوں اور سرخ و سفید رنگ والی بیٹی ماں کی حرکتوں سے بہت عاجز تھی۔ سکول میں تھی تو کلاس فیلوز کے طعنے سنتی تھی۔ پاؤں پٹخ پٹخ کر وہ کہتی۔ مظاہروں میں جانے کی بجائے گھر میں رہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ گھر لاک کر جاتی۔

مجھے اپنی ماں پر فخر ہے۔ مگر میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی ہوں جو خوف اور تناؤ سے بھری ہوئی ہو۔ انقلاب کے لئے خود کو مصیبتوں میں ڈال لو۔ مجھے ایسا انقلاب نہیں چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے ناراض رہتی ہے۔

گزشتہ جمعے کو جب میری بیٹی کو اطلاع ملی کہ اُس کی ماں ہٹ لسٹ پر ہے۔ اُس نے شدید غصیلے انداز میں کہا کہ میں ٹی وی پر جا کر صدر سے اپنی غیر مشروط معافی کا اعلان کروں۔ انکار پر جب ظالمانہ ہتھکنڈے میری بیٹی کے خلاف استعمال کرنے کی دھمکی ملی۔ اُس نے مجھے ہلایا اور رلایا ہی نہیں بلکہ اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ بیٹی میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔

فرانس بھاگنے اور وہاں پناہ لینے کا فیصلہ میرے لئے بہت کٹھن تھا۔ شام کو چھوڑتے ہوئے مجھے افسوس نہیں گہرا دکھ تھا۔ کرب تھا جو میرے اندر سے آہوں اور آنسوؤں کی صورت نکلتا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں اپنے ملک سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔

مجھے لگتا تھا جیسے میرا دم گھٹ جائے گا جیسے میں شام سے دور جا کر زندہ نہ رہوں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں دنیا گھومنے کی خواہش مند تھی۔ فرانس ہمیشہ سے میرا بہت پسندیدہ ملک ہے۔ میں بار بار یہاں آنا یہاں رہنا پسند کرتی تھی۔ مگر میں نے بہت آنسوؤں میں خود سے کہا تھا۔

''ایسے اور ان حالات میں تو میں نے کبھی آنے کی خواہش نہیں کی تھی۔''

بہت دنوں دکھ کے الاؤ میں جلنے کے بعد میں نے خود کو سنبھالا۔ حوصلہ دیا۔ خود کو اُمید کی ایک نئی راہ دلائی۔

ہمیں ابھی انتظار کرنا ہے۔ اپوزیشن بھی اپنے راستے سے بھٹک گئی ہے۔ اس میں غلط لوگ شامل ہو گئے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے مفادات کا ٹکراؤ ہونے لگا ہے۔ اِس وقت صورت بہت گھمبیر ہے۔

حقیقی انقلاب تو اُس وقت شروع ہوگا جب اسد اپنے تخت و تاج سے اُترے گا۔ عورتوں کی حقیقی آزادی اسی وقت ممکن ہوگی ایک تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر بالغ معاشرے کی تکمیل تبھی ممکن ہو سکے گی۔

2015ء میں وہ پھر اپنے مادرِ وطن گئی۔ خیر خواہوں نے کہا مت جاؤ۔

نہیں میں بہت مضطرب ہوں۔ بہت بے چین ہوں۔ وہ ترکی کے بارڈر سے آہنی باڑ کے ایک چھوٹے سے موگھے سے رینگ کر اس سرزمین پر داخل ہوئی جو اُس کی اپنی تھی۔ جس کے لوگ اس کے اپنے تھے۔

یہاں فری سیریئن آرمی اور ISIS کی کہانیاں تھیں۔ سپاہیوں، بچوں، عورتوں اور مردوں کے دکھوں کی کہانیاں، لاشیں اٹھاتے گھروں کو برباد

ہوتے، بچوں کو مرتے دیکھنا کتنا کٹھن تھا۔ My Journey to the Shattered Heart of Syria اس کی روزمرہ یادداشتوں پر مبنی دستاویزی کتاب ہی نہیں بلکہ ایک ادبی شاہ پارہ ہے۔

تقریباً ایک سال کے عرصے میں اس نے تین بار ترکی کے راستے سرحد پار کی۔ دوبار اندر داخلے کی کوشش بہت اذیت ناک تھی۔ خاردار تاروں نے کمر کو لہولہان کر دیا تھا۔ اِن ملاقاتوں نے اُسے جہادیوں کے اصلی چہرے دکھائے۔ غیر ملکی شازشوں کی گہرائی سے آگاہی ہوئی۔

بہت سے سنجیدہ اور سمجھدار شامیوں کی طرح وہ بھی اِس صورت سے دل گرفتہ اور پریشان تھی کہ اسد حکومت کے جانے اور جہادیوں کے آجانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کہ یہ صرف ایک آمریت سے دوسری بدترین تنگ نظر اور متعصب آمریت کے دوزخ میں گرنے والی بات ہوگی۔

احرارالشام اور القاعدہ کے مقامی لیڈران سے اُس کا ملنا، ان کے خیالات ونظریات سے آگاہی بہت سے حوالوں سے اس جیسی روشن خیال خاتون کے لئے بہت مایوس کن تھی۔ وہ عورتوں اور اُن کی آزادی کے حوالے سے بے حد متعصب تھے۔ شام کے خوبصورت چہرے کے پیچھے اس کے سٹرانڈ مارتے اندر نے ویسے ہی غلاظتوں سے بھرے رہنا تھا۔ بس تھوڑی نوعیت نوعیت تبدیل ہو جاتی۔ اُسے تو یہ بھی احساس ہوا کہ یہ جنگ تو غیر ملکیوں کی ہے۔ متشدد پسند لوگوں کی جن کی مدد بھی نہیں کی جاسکتی۔ عام سادہ لوح شامی تو بس اسی نظریئے پر ایمان رکھے ہوئے ہیں کہ یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ کی رضا تھی اور اللہ ہی بہتر کرے گا۔

ایک جگہ اُس نے لکھا۔

بوسنیا کی لڑائی کو دنیا نے سنجیدگی سے دیکھا اور محسوس کیا جب کہ شام کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی بجائے بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے مفادات کی آڑلی۔

2012ء تک اُسے احساس تھا اور شاید جب بھی اس کی بات چیت باغیوں کے زیر تسلط علاقوں کے اسلامی امیروں سے ہوئی۔ اس نے یہی جانا کہ وہ سول سیکولر ریاست کے قیام کو پسند کریں گے۔ یہ احساس تو اُسے بعد میں ہوا کہ سب توان کی چالیں تھیں ہتھیار اور جنگی سامان لینے کی۔ وہ اپنے زیر تسلط علاقوں میں نہ رشوت ختم کر سکے اور نہ جرائم۔ دوسرے اور تیسرے چکروں میں یہ تلخ حقائق اور کھل کر سامنے آئے۔ اصرارالشام کے امیر ابواحمد نے کس قدر رعونت سے کہا تھا۔

نقاب کے بغیر کوئی عورت باہر نہیں آسکتی۔ علوی تو شام میں رہ ہی نہیں سکتے۔ دوروز اور اسماعیلی بھی۔ ہاں اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو ٹھیک۔ کچھ ایسا ہی رویہ القاعدہ کے لیڈر کا تھا۔ جس نے اُسے ملنے کے بعد کہا تھا۔

''تمہاری بہادری کہ تم ہم سے ملنے آئیں۔''

''آپ اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا بہادر نہیں؟''

وہ ہنسا اور بولا۔

''میں مرد ہوں اور یہ قدرتی امر ہے۔''

''اور میں عورت ہوں اور یہ بھی قدرتی امر ہے۔'' اُس کی ہنسی یکدم رک گئی تھی۔

مسلسل بیرل بموں سے متاثرین کے دکھوں کی تفصیلات جہاں ہر آن وہ موت کی سولی پر لٹکے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے دھرتی موت کا ہی راگ الاپتی ہے۔ اسی کی عظمتوں کے گن گاتی ہے اور اسی کو اپنا فاتح قرار دیتے ہوئے اس کے قدموں میں بچھی جاتی ہے۔ پہاڑی علاقوں کے غاروں میں پناہ لینے والے ہزاروں سالوں کے اِس تہذیبی ملک کے شہری ایک بار پھر پتھروں کے زمانے میں پہنچے ہوئے لگتے ہیں۔ اُس نے اپنی گیلی آنکھوں کو پوروں سے صاف کرتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

وہ حکومتی نظروں میں ہی معتوب نہ تھی۔ بلکہ جہادی اور باغی قبائل کو بھی مطلوب ہوگئی تھی۔ ایک سوال کے جواب میں کہ اس نے خود کو کیوں مصیبت میں ڈالا؟ اس نے قدرے حیرت اور دکھ سے کہا۔

''مصیبت میں ڈالنا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کیا یہ میرا ملک نہیں؟ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے جنم لیا اور بڑھی پلی۔ میرے لوگ جو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں وہی میری زبان ہے۔ مجھے کیا چیز خوف زدہ کر سکتی ہے۔''

اس کے باربار کے چکروں نے اُسے سمجھایا تھا کہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔

یہ جگہ جو کبھی بہت پر لطف روایات اور محبتوں سے بھری ہوئی بڑی ہی پرامن سی تھی۔ ویسی نہیں رہی۔ اب یہاں خوف زدہ، ڈرے سہمے ہوئے لوگ ہیں۔

ISIS کے بارے میں وہ برملا کہتی ہے کہ یہ غیر ملکیوں کی فوج ہے۔ پھر ذرا واشگاف الفاظ میں کہتی ہے کہ راہزنوں اور لٹیروں کے ٹولے ہیں۔

اُسے تو مغرب کی اُن نوجوان مسلمان لڑکیوں پر بھی شدید غصہ ہے۔ جو مغرب سے ISIS میں شمولیت کے لئے سفر کر کے آتی ہیں۔

یہ نوجوان لڑکیاں جو مغربی معاشرے میں پیدا ہوئیں وہیں بڑھی پلی۔ انہیں شام کے بارے کچھ علم ہی نہیں۔ عرب جنگجو ہیرو کی مردانہ وجاہت اور شجاعت اُن کی فینٹسی ہے۔ گھوڑے پر سوار بندوق کے ساتھ جن کی کہانیاں انہو ں نے پڑھی اور سنی ہوں گی۔ مغرب کی پرسکون زندگی جس سے انہیں بوریت ہوتی ہے۔ تھرل اور کچھ نیا کرنے کی آرزو دھکیل کر یہاں لے آتی ہے۔

مذہبی خانے موجود تو پہلے بھی تھے پر اتنے گہرے کبھی نہ تھے۔ ہم جب چھوٹے چھوٹے تھے تو یہ سنی، یہ شیعہ، یہ علوی۔ یہ دروز کہیں نہیں تھا۔ ہم سب شامی تھے۔

مجھے خوف ہے کہ اگر دنیا شام کے لوگوں کے مسائل نہیں سمجھے گی اور حکومت گرانے میں حقیقی لوگوں کی مدد نہیں کرے گی تو ایک اور بڑا خطرہ جنم لے گا۔ یہ میری اُمید بھی ہے اس میں وہ خطرات بھی مضمر ہیں کہ اسد حکومت ایران، روس سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ امریکیوں اور یورپی لوگوں کی حمایت کے لئے کوشاں ہے۔ مغرب ابھی اس معاملے میں اتنا واضح نہیں۔ بٹا ہوا ہے۔ تاہم وہ اس کے اقتدار کے لئے اس کی مدد کر رہے ہیں اور یہی چیز خطرناک ہے۔

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۸

میری نیند کافور ہو چکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں دم سادھے پڑا رہا۔ پھر آہستہ سے اپنا جسم خود سے چمٹے ہوئے بدن سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں اس کا سر ٹٹولا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی بچے کا سر تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو روفی مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ میرا خوف جاتا رہا اور میں نے ایک گہری سانس لے کر اس سے پوچھا، تم ٹھیک تو ہو روفی؟ اکیلے کمرے میں مجھے ڈر لگ رہا ہے بھائی۔ روفی نے سہمے ہوئے لہجے میں مجھے جواب دیا۔ روفی کے بھائی کہنے کا انداز مجھے بہت بھلا لگا۔ تمہیں کس شے سے ڈر لگتا ہے روفی؟ میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا، اندھیرے سے اور کس سے۔ میں نے کہا، تمہیں جب بھی ڈر لگا کرے تم ممی ڈیڈی کے پاس جا کر سو جایا کرو۔ روفی بولا، وہ اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے سوتے ہیں۔ دادا جان کے پاس جا کر اس لیے نہیں سوتا کہ اگر وہ سو رہے ہوں تو خراٹے لیتے ہیں اور اگر جاگ رہے ہوں تو کھانستے رہتے ہیں۔ آپی مجھے اپنے کمرے میں گھسنے نہیں دیتیں۔ اس لیے آپ کے کمرے میں آ گیا ہوں۔ میں نے اس کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا، تم نے یہ بہت اچھا کیا۔ اب ڈر کی کوئی بات نہیں اس لیے تم آرام سے سو جاؤ۔ کچھ دیر بعد وہ میرے بازوؤں کے سائے تلے سکون سے سو گیا۔ اس کو سوتا دیکھ کر میں بستر سے اٹھ کر قریب پڑے ہوئے صوفے پر لیٹ گیا۔

صبح دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھلی۔ آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو دروازے پر روفی کی ماں مارلا، پریشانی کے عالم میں مجھ سے روفی کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں مسکراتا ہوا اسے کمرے میں لے آیا جہاں روفی میرے بستر پر ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ روفی کو دیکھ کر اس کی پریشانی دور ہوئی تو کہنے لگی، اس لڑکے نے صبح سویرے ہم سب کو پریشان کر دیا ہے۔ ہم لوگ اسے تمام حویلی میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور یہ یہاں مزے سے سو رہا ہے۔ میں نے مارلا سے کہا، اسے نہ جگائیں کیونکہ روفی ڈر کی وجہ سے رات کو کافی دیر سے سویا تھا۔ پھر میں نے اسے رات والا واقعہ سنایا تو ہنس کر کہنے لگی، اس نے خواہ مخواہ آپ کو تکلیف دی۔ اگر ہمیں جگا دیتا تو کیا ہو جاتا۔ میں نے تفصیل میں جانے کی بجائے کہا، اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ روفی مجھے کسی قابل سمجھ کر ہی میرے پاس آیا تھا۔ وہ روفی کو وہیں میرے بستر پر سوتا چھوڑ کر جاتے ہوئے کہنے لگی، اچھا میں باقی گھر والوں کو اس کے بارے میں بتا کر کم از کم ان کی پریشانی تو دور کر دوں۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے، مارلا کے جانے کے بعد میں غسل خانے میں تیار ہونے کے لیے چلا گیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو دلاور کو کسی اجنبی کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ دلاور نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی توجہ سوتے ہوئے روفی کی طرف دلاتے ہوئے انہیں کمرے سے باہر آ کر بات کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر دلاور نے اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے کہا، یہ بڑے صاب کا درزی ہے اور آپ کا ناپ لینے آیا ہے۔ بڑے صاب نے آپ کے لیے کچھ کپڑے بنوانے کو کہا ہے۔ میں نے پہلے انکار کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ سوچ کر چپ رہا۔ درزی نے برآمدے میں کھڑے کھڑے میرا ناپ لیا اور میرے جوتوں کا ناپ مانگا، پھر کچھ کہے بنا دلاور کے ساتھ چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں نے دلاور کو یاد دلایا کہ مجھے نزان کے وقت بلا لے۔

اس سے فارغ ہو کر میں دوبارہ کمرے میں آیا ایک کتاب اٹھا کر مطالعے میں محو تھا کہ روفی جاگ گیا۔ وہ جاگتے ہی سیدھا میرے پاس والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ تمہیں اب تو ڈر نہیں لگ رہا روفی؟ میں نے پیار سے اس کے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ بڑی دلیری سے بولا مجھے دن کے وقت بالکل ڈر نہیں لگتا بھائی۔ بس رات کو اندھیرا ہونے کے بعد ڈر لگتا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں دن کو ڈر نہیں لگتا۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو مجھے دن کے وقت بھی ڈر لگا کرتا تھا اور رات کو تو ڈر اور زیادہ لگتا تھا، میں نے بات گھڑتے ہوئے روفی سے کہا۔ اچھا بھائی! پھر آپ کا ڈر کیسے دور ہوا؟ اس نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرا ایک گرو تھا جن کا نام گرو گھنٹال تھا۔ اس نے مجھے ایک بار منتر والا دھاگا دیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نہ رات کو ڈرا اور نہ ہی دن کو، میں نے بڑے سنجیدگی سے روفی کو بتایا۔ اچھا! آپ اس دھاگے کا کیا کرتے تھے بھائی کہ آپ کو ڈر نہیں لگتا تھا؟ روفی نے سوال پوچھا۔ کچھ بھی نہیں بس منتری دھاگا لے کر اسے اپنے بستر پر تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا اور اس دھاگے کے ڈر سے میرا سارے کا سارا خوف بھاگ گیا۔ اگر تم کہو تو میں اپنے گرو گھنٹال جی والا دھاگا تمہیں دے سکتا ہوں پھر تمہیں بھی میری طرح رات کو ڈر نہیں لگا کرے گا، میں نے مسکراتے ہوئے روفی سے کہا۔

اچھا بھائی اگر آپ مجھے وہ دھاگا دیں گے تو پھر آپ کو ڈر تو نہیں لگے گا؟ روفی نے تجسس سے پوچھا۔ بالکل نہیں۔ اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں نا۔ اس لیے نہ تو مجھے اب ڈر لگتا ہے اور نہ ہی مجھے اب اس منتر والے دھاگے کی ضرورت ہے۔ تم جب میری طرح بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی ڈر نہیں لگے گا اور پھر تم یہ دھاگا کسی اور ڈرنے والے بچے کو دے دینا۔ اچھا بھائی! تب تو آپ مجھے وہ دھاگا ضرور دیں، روفی بولا۔ میں نے اسے کہا، اچھا تم یہاں بیٹھو میں ابھی تمہارے لیے منتر دھاگا لاتا ہوں۔ غسل خانے میں گھس کر میں نے اپنے پاجامے کے آزار بند سے ایک بڑا سا دھاگا توڑ کر ہاتھ میں لیا اور باہر آ کر روفی کو دیتے ہوئے کہا، تم اس دھاگے کو ابھی جا کر اپنے بستر پر تکیے کے نیچے رکھ دو تا کہ یہ پھر کہیں ادھر اُدھر نہ ہو جائے اور رات کو سونے سے پہلے اس دھاگے کو ہاتھ لگانا نہ بھولنا۔ وہ دھاگا میرے ہاتھ سے لے کر جانے لگا تو میں نے کہا، اور ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس منتری دھاگے کا ذکر کسی اور سے مت کرنا۔ کیوں بھائی؟ اس نے مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس

لیے کہ گرو گھنٹال جی اس دھاگے کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں، میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔اور روفی اچھا بھائی کہہ کر خوشی خوشی دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

روفی کو گئے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دلاور نے نران کی تیاری کی خبر دی۔ دلاور نے ہی میری رہنمائی کھانے کے کمرے تک کی۔ گوبیندر جی کے ساتھ میز پر سریندر اور مارلا تھ۔ روفی اور پونم وہاں موجود نہیں تھے۔ سب نے کھڑے ہو کر بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ گوبیندر جی نے مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ گوبیدر جی کو آج قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اسی سال سے اوپر پتلی جسامت کے تھے۔ ٹھیٹھ پنجابی زبان بولتے تھے۔ان کی آواز میں کھنکھناہٹ تھی اور ان کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ان کے گھر والے ان کی موجودگی میں اس وقت تک نہیں بولتے تھے جب تک وہ ان سے مخاطب نہ ہوتے تھے۔ گھر کے تمام افراد ان کا سچے دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ سب سے بڑے صاب تھے۔ان کی بہوئیں اور بچے ان کو باباجی کہتے تھے اس لیے میں نے بھی انہیں باباجی کہنا شروع کر دیا۔انہوں نے میری پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا، پچھلے دو برس سے کوئی روز ایسا نہیں تھا جب میں نے کسی بہانے سے اس گھر میں تمہارا ذکر نہ کیا ہو۔ میں روز گرو سے تمہارے درشن کرانے کی پرارتھنا کرتا تھا اور اس نے گھر بیٹھے بٹھائے میری مراد پوری کر دی۔ اگر میری پوتی مجھے تمہارے بارے میں آ کر نہ بتاتی تو میں تم سے مل کر بھی نہ مل سکا ہوتا۔

میں خاموشی سے باباجی کی باتیں سنتا رہا تو انہوں نے کہا، اب تو مجھے اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتا۔ میں نے انہیں ٹھیٹھ پنجابی میں جواب دیا، جی باباجی آپ جو جی چاہے پوچھیں۔ میرے ٹیٹھ پنجابی لہجے نے اور باباجی کے الفاظ نے جیسے ان کی محبت کی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔ کہنے لگے، صدقے جاواں تو بڑی ستھری پنجابی بولتا ہے۔ مجھ سے میرے بچوں نے آج تک اتنی خالص پنجابی میں بات نہیں کی۔ اور تمہارے باباجی کہنے کے انداز نے تو میرا دل تڑپا دیا ہے۔ بلبیر نے مجھے بتایا تھا کہ تم سکول بھی جاتے ہو۔ جی ہاں باباجی میں گیارہویں جماعت میں پڑھتا ہوں، میں نے اپنے جواب کو مختصر ہی رہنے دیا۔ بابا بولے، تم کب سے یہاں ہو؟ میں تین روز پہلے مہارج کے ہاں آیا تھا باباجی، میں نے جواب دیا۔ اور کب تک یہاں ہو؟ بابا نے پوچھا۔ جی میں چند روز کے لیے مہاراج کے ہاں آیا تھا۔ اچھا تو تم چھٹیوں کے باقی دن ہمارے ساتھ گزارو۔ جی میرے باپو گھر پر اکیلے ہیں۔ میں کچھ دن ان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ تمہارے باپو کیسے ہیں؟ انہوں نے باپو کے بارے میں پوچھا جیسے وہ باپو کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ جی ٹھیک ہیں، میں نے اپنے جواب کو بدستور چھوٹا رکھتے ہوئے کہا۔ بابا بولے، اچھا تم کچھ روز ہمارے ہاں ٹھہر کر اپنے باپو کے پاس چلے جانا۔ بابا زیادہ دیر تک کرسی پر نہیں بیٹھ سکتے تھے اس لیے اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میز پر بیٹھے ہوئے باقی لوگوں میں گویا جان پڑ گئی۔ مارلا بولی، کل تمہاری شکل وصورت کے ساتھ انگریزی بولتا سن کر میں تمہیں مہاراج کا کوئی برطانوی مہمان سمجھی تھی۔ سریندر نے اس بار مجھ سے، شاید اپنی بیوی کی وجہ انگریزی میں بات شروع کرتے ہوئے کہا، تم انگریزی، ہندی اور پنجابی کسی اہلِ زبان کی طرح بولتے ہو۔ جی وقت کے ساتھ ساتھ یہ زبانیں سیکھ لی ہیں، میں نے جواب دیا۔ تمہیں اور کون کون سی زبانیں آتی ہیں؟ مارلا نے پوچھا۔ مجھے بنگالی اور اردو کے علاوہ کئی ایک علاقائی زبانیں بھی آتی ہیں، میں نے جواب دیا۔ تمہیں زبانوں کے لہجوں پر حیرت انگیز قدرت ہے۔ تمہاری مادری زبان کون سی ہے؟ مارلا نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ یہ ساری زبانیں میری مادری زبانیں ہیں۔ اس پر وہ مسکرانے گی۔ پھر بولی، تم سے جو باتیں منسوب ہیں ان کے مطابق تو تمہیں بالکل دیہاتی ہونا چاہیے تھا اور تم سے ملنے سے پہلے میرے ذہن میں تمہارے بارے میں ایک قسم کا دیہاتی عکس تھا۔ ویسے نہ تم شکل وصورت سے سپیرے لگتے ہو اور نہ ہی باتوں سے۔ میں سپیرا ضرور ہوں لیکن کتابوں نے مجھے عام سپیروں سے کچھ بہتر بنا دیا ہے۔ جب بھی موقع ملتا ہے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ کر دن گزراتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ تم کون سی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہو؟ مارلا نے پوچھا۔ ہر کتاب اچھی ہوتی ہے کیونکہ ہر کتاب کچھ نہ کچھ سکھاتی ہے۔ اس لیے جو کتاب میسر آتی ہے پڑھ لیتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ کس زبان میں کتابیں پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہو؟ سریندر نے پوچھا۔ جس زبان کی کتاب میسر آجائے، بشرطیکہ وہ زبان مجھے آتی ہو۔ وہ میرے جواب پر مسکرایا اور کھانے کی میز سے اٹھتا ہوا بولا، اچھا ہمیں اپنے چند پرانے دوستوں سے ملنے جانا ہے، واپسی پر باتیں ہوں گی۔ مارلا اور سریندر چلے گئے تو میں اکیلا ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ مجھے اپنا وقت بیکار گزارنے کی عادت نہیں تھی گھر میں یا ہاسٹل میں میرا ایک ایک منٹ کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس بے کاری کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں نے یہاں رکنے کی حامی ہی کیوں بھری تھی۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے کام پر چلے گئے ہیں۔ بابا اپنے کمرے میں ہیں اور میں بور ہونے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ بابا کو ڈھونڈ کر ان سے جانے کی آ گیا لیتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ان سے اس سلسلے میں پہلے ہی بات کر چکا ہوں اور انہوں نے دو ایک دن اور رکنے کو کہا ہے۔ پھر سوچا، اچھا آج کا دن جیسے تیسے کاٹ کر کل بہر صورت یہاں سے مہاراج کی حویلی میں جاؤں گا اور مہاراج سے کہہ کر واپس پاہیرالہ چلا جاؤں گا۔ اسی سوچ کے درمیان میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ چند کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں پھر ایک کتاب اٹھا کر پہلے اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آیا اور تالاب کے کنارے جا کر ایک کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔ معلوم نہیں کب تک پڑھتا رہا۔ کتاب پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو ایک بار پھر کمرے کا رخ کیا۔ یہاں سے باپو کو خط لکھ کر دلاور کے حوالے کیا کہ وہ ڈاک سے بھجوا دے۔ کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا تو نیند آ گئی۔ تین بجے کے قریب کمرے میں کھٹکے سے آنکھ کھلی دلادر کو کمرے میں ایک بڑا سا سوٹ کیس رکھتے دیکھا۔ مجھے اُٹھتا دیکھ کر دلاور نے مجھے بتایا کہ اس سوٹ کیس میں میرے لیے کپڑے آئے تھے۔ سوٹ کیس کھول کر دیکھا تو اس میں سوٹ، کرتے پاجامے، نئے جوتوں کے جوڑے، ٹائیاں، جرابیں

اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں دلاور سے چائے لانے کا کہہ کر خود غسل خانے میں جا گھسا۔ نئے سوٹ کیس سے کرتا پاجامہ نکال کر پہنا۔ باہر آیا تو دلاور کی لائی ہوئی چائے پینے لگا۔

ایسے میں روفی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں نے پوچھا؟ اچھا یہ بتاؤ کہ تم آج سارا دن کہاں غائب تھے روفی؟ کہنے لگا ہم لوگ آپ کے کپڑے لینے گئے تھے بھائی۔ اچھا، میں نے حیرت سے کہا، اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی، مجھے بھی ساتھ لے جانا تھا۔ وہ بولا، نہیں! آپی اور میں گئے تھے۔ میرے لیے یہ خبر اور بھی حیران کن تھی کہ پونم آج سارا دن میرے لیے کپڑے لیتی اور سلواتی رہی تھی۔ ابھی میں کچھ کہنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ روفی بولا، بھائی تالاب پر چلیں۔ چلو، میں نے روفی کا دل رکھنے کے لیے کہا اور روفی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل کر تالاب کی جانب چل پڑا۔ تالاب کے کنارے پونم کل والی جگہ پر بیٹھی تھی۔ آج اس نے جامنی پھولوں والا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ میں نے اسے کرتے پاجامے میں دیکھ کر کہا، آپ روایتی لباس میں زیادہ جچتی ہیں۔ شکریہ، کیا آپ کو اپنے کپڑے پسند آئے ہیں؟ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا؟ جی ہاں مجھے یہ کپڑے، بہت بھلے لگے ہیں۔ میں نے اپنے کرتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے خواہ مخواہ میرے لیے اتنی زحمت اٹھائی۔ اس میں زحمت کی کیا بات ہے، بس میرا جی چاہا تھا کہ میں آپ کے لیے کچھ کروں اس لیے میں نے داداجان سے کل رات ہی اجازت لے لی تھی، اس نے جواب دیا۔

میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ روفی مجھے بٹھا کر خود ایک طرف چلا گیا تو میں نے پونم سے کہا، آپ لوگوں نے ایک دن کے اندر میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ بولی، آپ تو خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے تمام خاندان کو اسقدر متاثر کیا تھا کہ سب لوگوں کی طرح میرا بھی آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن آپ کے بارے میں میرے تصورات کا خاکہ ایک مجہول سے یا ایک مغرور سے لڑکے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ایک ایسے لڑکے کا جس کو سانپوں پر قابو پانے کی جادوئی طاقت سے ہمارا تمام گھرانا مرعوب تھا۔ لیکن آپ سے مل کر اندازہ ہوا کہ آپ نہ مجہول ہیں اور نہ ہی مغرور ہیں۔ کل رات جب داداجان آپ کا تعارف مہمانوں سے کرا رہے تھے تو آپ نظریں جھکائے ایسے کھڑے تھے جیسے آپ کو سب کے سامنے کوسا جا رہا ہو۔ جب ہمارے خاندان کے لوگ آپ کے گرد جمع تھے تو آپ اپنی تعریفیں سن کر غرور سے گردن اکڑانے کی بجائے حیا سے سرخ ہو رہے تھے۔ آپ سے ملنے سے پہلے میرے گھر والے آپ کی صرف ایک صفت سے متاثر تھے۔ آپ سے ملنے کے بعد میری ممی آپ کی زبان دانی سے، میرے داداجان آپ کی پنجابی سے، میری ڈیڈی آپ کی سادگی سے، اور میرا بھائی روفی آپ کے اندازِ گفتگو سے متاثر ہیں۔ اور مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میں آپ کی سادگی، آپ کی زبان دانی، آپ کے اندازِ تکلم اور یا آپ کی جادوئی شخصیت یا کسی چیز سے متاثر ہوں۔ آپ سے ملنے کے بعد سے اب تک میرے ذہن نے آپ کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا۔

اس کو بولنے سے روک کر میں نے کہا، آپ نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہوں؟ اس نے جھینپے لہجے میں کہا، اگر آپ کو میرا زیادہ بولنا برا لگا ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ نہیں، بات زیادہ بولنے کی نہیں ہے۔ آپ بولتے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کل رات سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے پوچھا۔ میری بات سن کر وہ ہنس کر کہنے لگی، اوہ وہ!۔۔۔ وہ تو کل جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ آپ کچھ دن کے لیے ہمارے مہمان بن کر رہیں گے تو مجھے بڑے زور کی بھوک ستانے لگی تھی۔ کل رات اور آج سارا دن میں نے جی بھر کر کھایا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے مہمان بنا کر یہاں روکنے کا سہرا آپ کے سر ہے؟ میں نے پونم سے پوچھا۔ ہاں بھی اور نہیں بھی، پونم نے جواب دیا۔ نہیں اس لیے کہ ہمارے خاندان کے تمام لوگ خصوصی طور پر میرے دادا جی، آپ سے ملاقات کو ترستے تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میرے دادا سفر نہیں کرتے اس لیے میں نے ان کی آپ سے ملنے کی ایک بہت بڑی خواہش پوری کر دی۔ اگر آپ ان سے ملے بنا یہاں سے چلے جاتے اور انہیں آپ کے جانے کے بعد حقیقت معلوم ہوتی تو انہیں بہت دکھ ہوتا۔ اسی لیے میں نے سب سے پہلے انہیں خبر دی۔ اور ہاں اس لیے کہ میں آپ کو کچھ قریب سے جاننا چاہتی تھی۔ اگر آپ کل جیسے چپکے سے آئے تھے ویسے ہی خاموشی سے چلے جاتے تو میری زندگی کی کتاب کا ایک خوبصورت باب نامکمل رہتا۔

ایسے میں روفی واپس آ کر پونم کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور پونم نے اپنی باہیں روفی کے گرد ڈالتے ہوئے کہا، کل سے آپ کی باتوں نے روفی کی آپی کو بالکل ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ یہ تبدیلی نہ صرف میں اپنے اندر محسوس کر رہی ہوں بلکہ روفی کے علاوہ میرے ممی اور ڈیڈی نے بھی محسوس کی ہے۔ ایسے میں روفی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، بھائی، میں نے آپ کی دی ہوئی وہ خفیہ چیز اس خفیہ جگہ پر رکھ دی ہے۔ اچھا کیا ہے، میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بھی تو سنو کہ آخر کونسی خفیہ شے اور کس خفیہ جگہ کا ذکر ہو رہا ہے؟ پونم نے حیرت سے پہلے مجھے اور پھر روفی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا، بھئی آپ اس خفیہ بات کو ہم دونوں بھائیوں کے درمیان ہی رہنے دیں۔ میں آپ سے تھوڑی پوچھ رہی ہوں، یہ تو میں اپنے پیارے بھائی سے پوچھ رہی ہوں، پونم نے روفی کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ روفی نے منتر والے دھاگے کا ذکر کیا تو پونم نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا، کاش کوئی مجھے بھی ایسا دھاگا دیتا۔ روفی بولا، منتری دھاگے کی وجہ سے آج میں اپنے کمرے میں سوؤں گا۔ بہت خوب روفی یہ تو بڑی اچھی خبر ہے، میں نے روفی کو خوش کرتے ہوئے کہا۔

اچانک ایک جانب سے دلاور وادر ہوا اور مجھے بتایا کہ بابا جی نے آپ کا پوچھا ہے۔ چلو، میں نے اٹھتے ہوئے کہا، میرے ساتھ پونم بھی اٹھ کھڑی

ہوئی۔ میں روفی کی انگلی پکڑے، دلاور کے ساتھ بابا کے پاس گیا۔ دلاور نے باہر رک کر ہمیں اندر جانے کو کہا۔ بابا اپنے کمرے میں ایک صوفے پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ان کے ساتھ دو مہمان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے کل رات بابا کے مہمانوں کے درمیان دیکھا تھا اور دوسرا شاید ان کے ساتھ آیا تھا۔ بابا مجھے دیکھتے ہی سیدھے بیٹھ گئے۔ میں نے کپڑوں کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولے یہ تو کچھ بھی نہیں، میں تو تمہارے لیے ابھی بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے مہمانوں کا تعارف مجھ سے کراتے ہوئے بولے، یہ نواب ادریس خان ہمارے بچپن کے دوست ہیں، ان کے ساتھ ان کے داماد اور بھتیجے نوابزادہ ایاز خان ہیں۔ ادریس خان اجمیر کے خاندانی نواب ہیں اور ان کا شجرہ نسب نواب آف کرناٹک سے ملتا ہے۔ موٹی جسامت کے نواب صاب سفید شیروانی میں ملبوس تھے۔ ان کی موچھیں صاف تھیں لیکن چہرے پر سفید ریش تھی۔ جب کہ نوابزادہ نے کرتا پاجامہ پہنا تھا اور ان کے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ دونوں نے بڑے ادب سے کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ ایسے میں بابا کو خیال آیا کہ میں ابھی تک کھڑا ہوں انہوں نے مجھے اپنے داہنے ہاتھ صوفے پر بٹھا لیا اور پونم ان کی دوسری جانب بیٹھ گئی، روفی میرے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ نواب صاحب نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ روفی اور پونم کی جانب دیکھ کر چپ ہو گئے۔ بابا نے ان کا اشارہ سمجھ کر دونوں کو چلے جانے کو کہا۔ پونم حیرت سے مڑ مڑ کر اپنے پیچھے دیکھتی ہوئی روفی کا ہاتھ پکڑے کمرے سے چلی گئی۔

پونم اور روفی کے جانے کے بعد نواب ادریس نے ایک گہری سانس لے کر پہلے خود کو کچھ کہنے کے لیے تیار کرتے ہوئے کہا، پچھلے دو سال سے میں اس اس گھر میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سنتا آیا ہوں۔ آپ سے ذاتی ملاقات اور کل کے تعارف کے بعد میں مسلسل اسی کشش و پیچ میں تھا کہ آیا آپ سے اپنی ایک مشکل کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ میرے داماد نے میری ڈھارس بندھائی کہ آپ سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کرنے والی تو خدا کی ذات ہوتی ہے لیکن وسیلہ انسان ہی کا بنتا ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ ہمارے کام ضرور آئیں گے اور خدا نے آپ کو یہاں ہمارے لیے ہی بھیجا ہے۔ جس بات کا ذکر میں آپ سے کرنے والا ہوں، اپنی اس مصیبت کا ذکر میں نے آج تک کسی سے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ گوبیندر جی بھی اتنے پرانے تعلقات ہونے کے باوجود آج پہلی بار میرے منہ سے یہ سب کچھ سن رہے ہیں۔ پچھلے پانچ سال سے میں ایک عذاب سے دوچار ہوں جس کا ذکر تک کرتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے۔ اس خوف نے میری رات کی نیندیں اور دن کا چین حرام کیا ہوا ہے۔ وہ سانس لینے کے لیے رکے تو میں نے جلدی سے کہا، اس سے پہلے کہ آپ اپنا اتنا بڑا ذاتی راز مجھ پر افشا کریں ، میں چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ جی فرمائیے، نواب صاب نے کہا۔ میں آپ کو یہ جتا دوں کہ میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔ نہ ہی میں کوئی پیشہ ور سپیرا ہوں۔ میں تو بس ایک شوقیہ سپیرا ہوں۔ اگر آپ کا کام میرے بس کا ہوا تو کروں گا ورنہ صاف کہہ دوں گا۔ میں کبھی اپنے کام کی کوئی قیمت نہیں لیتا اور جہاں تک آپ کے اس راز کا تعلق ہے تو یہ راز ہر حالت میں راز ہی رہے گا۔ میں آپ کے کسی کام آؤں یا نہیں۔ اب آپ اگر چاہیں تو مجھے اپنے راز میں شریک کریں۔

میرے خاموش ہونے پر نواب ادریس بولے، اگر میں آپ کو کوئی پیشہ ور سپیرا سمجھتا تو آپ کو کچھ بھی نہ بتاتا۔ جس انداز سے آپ نے بلبیر کی جان بچائی تھی اور اس کے بعد کے تمام حالات بڑے سردار نے تفصیل سے ہمیں بتائے تھے ان کی روشنی میں میں آپ کو کم از کم سپیرا نہیں سمجھتا۔ کل سے مسلسل سوچ بچار کے بعد ہی میں آپ سے بات کرنے کو تیار ہوا ہوں۔ ہماری جاگیر کا ایک بڑا حصہ کلکتے میں ہے۔ آج سے پانچ برس پہلے کی بات ہے، فصلوں کی کٹائی کے دوران اپنی جاگیر پر میں نے ایک سانپ مارا تھا۔ اس روز کے بعد سے آج تک سانپوں نے مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ سانپ کبھی میرے جوتے سے نکلتے ہیں اور کبھی میرے کپڑوں کی الماری سے اور کبھی میری کار سے سانپ برآمد ہوئے ہیں اور کبھی میری ٹم ٹم میں سانپ ہوتے ہیں۔ میری حویلی کے ہر کونے میں سانپ پایا جاتا ہے۔ میرے سونے کے کمرے میں سانپ ہوتے ہیں اور ہر اس جگہ سانپ ہوتے ہیں جہاں جہاں میں جاتا ہوں۔ کبھی میرے سوٹ کیس میں گھس کر میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک سانپ میرے سوٹ کیس میں لنڈن تک میرے ساتھ گیا تھا۔ میں ان سانپوں کی وجہ سے پچھلے چار سالوں سے اپنی جاگیر پر نہیں جا سکا جس کی وجہ سے وہ جاگیر تقریباً بے آباد ہو کر رہ گئی ہے۔ اب میرا حال یہ ہے کہ میں نے ایک خادم خصوصی طور پر اسی کام کے لیے رکھا ہے۔ وہ میرے استعمال سے پہلے میرا کمرہ، میرا غسل خانہ، میری گاڑی، میرا بستر، میرا صوفہ، میرے سفری سوٹ کیس اور میری ہر چیز کی تلاشی لیتا ہے۔ کئی بار اس تلاشی کے نتیجے میں سانپ برآمد ہوئے ہیں۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سانپ صرف میرے بیری ہیں۔ انہوں نے کسی اور پر کبھی وار کرنے کی کوشش نہیں کی۔

نواب صاب رُکے تو میں نے پوچھا، سانپوں نے آج تک کسی کو ڈسا بھی ہے یا نہیں؟ الحمدللہ کہ آج تک میں اور میرے گھر والے ان موذیوں سے محفوظ ہیں۔ صرف ایک بار ایک سانپ نے مجھ پر وار کیا تھا لیکن اس کے دانت میرے موٹے جوتے میں پھنس گئے تھے، نواب صاب بولے۔ میرا خیال ہے آپ مجھے یہ تو نہیں بتا سکیں گے کہ سانپ ایک قسم کے ہیں یا کئی اقسام کے؟ میں نے نواب صاب سے پوچھا۔ وہ بولے، آپ کی بات درست ہے میں سانپوں کی قسم کے بارے میں بالکل لاعلم ہوں۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ جو سانپ آپ نے کلکتہ میں سب سے پہلے مارا تھا اس کی گردن کے پیچھے دو کالے نشان تو نہیں تھے؟ میں نے سوال کیا۔ وہ بولے مجھے یہ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایک دو بار میں نے ویسے کالے نشان والے ناگ اپنے گھر میں دیکھے ضرور ہیں۔ ان کی بات سُن کر میں نے مسکرا کر پوچھا، کیا یہ سچ ہے کہ آپ سانپ مارنے کے بعد دفن کر دیتے ہیں؟ میرے سوال پر وہ غیر ارادی طور پر حیرت سے کھڑے ہو کر پوچھنے لگے۔

حیرت ہے، آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ ہم سانپ مارنے کے بعد دفن کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کی حیرت کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا، تو اس کا مطلب ہے کہ میرا قیاس درست ہے کہ آپ سانپ مارنے کے بعد دفن کر دیتے ہیں۔ جی جی بالکل، آپ نے سو فیصد درس قیاس لگایا ہے حضور۔ تو پھر میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ میرا جواب سن کر دونوں کے چہرے گویا روشن ہو گئے۔ انہوں نے کہا، تو حضور پھر دیر کس بات کی، آپ ابھی ہمارے ہاں تشریف لائیں۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، بابا بول پڑے، میں نے بلونت کور اور بلبیر کو تمہاری یہاں آمد کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ دو چار دن بعد یہاں آنا چاہتے ہیں۔ میری دلی اچھا ہے کہ تم کچھ اور دن یہاں رک جاؤ تا کہ وہ لوگ تم سے مل جائیں، لیکن میرے دوست کو تمہاری ضرورت ہے اس لیے تم جو مناسب سمجھو فیصلہ کرو۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا، بابا جی میں یہاں صرف آپ کی محبت کی وجہ سے رک گیا تھا۔ اگر آپ مجھے جانے کی آ گیا دیں تو آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ بابا نے ہمیں جانے کی اجازت دی تو نواب صاب اٹھتے ہوئے بولے، تو پھر ہمیں ابھی چلنا چاہیے۔ میں نے بابا سے کہا، میں آپ کے دئے ہوئے کپڑے یہاں رکھ کر جانا چاہتا ہوں تا کہ آپ کے ہاں جب بھی آؤں تو کپڑے یہاں موجود ہوں۔ بابا بولے نہیں یہ کپڑے تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہارے لیے اس گھر میں کپڑوں کی کبھی کمی نہیں ہوگی۔ جب بھی آؤ گے کپڑے موجود ہوں گے۔ میں نے بابا سے کہا کہ نواب صاب کے ساتھ جانے سے پہلے مجھے مہاراج کی حویلی جا کر اپنا سامان لینا ہوگا۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ بابا بولے تم مہاراج کی حویلی میں اپنا سامان پڑا رہنے دو۔ نہیں بابا، وہاں میرے یعنی ایک سپیرے کے ہتھیار ہیں۔ ان کے بغیر میرا نواب صاب کے ساتھ جانا بے کار ہوگا۔ بالکل ایسے، جیسے آپ کسی بڑھئی کو اس کے اوزاروں کے بغیر کہیں کام کرنے کو بھجوا دیں۔ تینوں نے اپنے سروں کو ایسے ہلایا جیسے میری بات اُن کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا، آپ مجھے یہاں سامان سمیٹنے کے لیے کچھ وقت دے دیں۔ میں سامان کے ساتھ یہیں واپس آؤں گا تو یہاں سے مہاراج کی حویلی چلیں گے۔

بابا کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے جا کر میں نے سامان سمیٹتے ہوئے دلاور کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ دلاور آیا تو میں نے اسے روفی کو بلانے کے لیے کہا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا روفی کے ساتھ پونم بھی میرے کمرے میں آئی تھی۔ میں نے انہیں اپنے جانے کی اطلاع دی تو پونم جیسے سن ہو کر رہ گئی اور اس کا چہرہ اچانک بجھ سا گیا۔ پھر اس نے پوچھا، کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟ جی ہاں، کچھ لوگوں کو میری مدد کی سخت ضرورت ہے، میں نے کہا۔ آپ کو ہماری ضرورت کا خیال نہیں آیا؟ اس نے پوچھا۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ کا خیال مجھے ہر روز آئے گا، میں نے جواب دیا۔ آپ نے یہاں میرے قیام کو ایک مقصد دیا ہے۔ اور ہاں آپ مجھے یہ بتائیے کہ ان کپڑوں میں سے آپ کو سب سے اچھے کپڑے کون سے لگتے ہیں تا کہ میں وہ کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنے سکول کا پتہ لکھ کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، اگر آپ چاہیں تو اس پتے پر مجھے خط لکھ سکتی ہیں۔ اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ کچھ کہے بغیر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں نے روفی سے کہا، دیکھو میں جا رہا ہوں تم اپنا اور اپنی آپی کا خیال رکھنا۔ روفی بولا، اچھا بھائی، آپ ہمارے ہاں پھر کب آئیں گے؟ ابھی معلوم نہیں لیکن ہم پھر ضرور ملیں گے، میں نے اس کے گال کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ اگرچہ میرا اتنی جلدی چلے جانا میزبانوں کے علاوہ میرے لیے بھی اداس کن تھا لیکن سانپوں کا کھیل میری زندگی کا ایک ضروری حصہ بن گیا تھا۔ مجھے جب خصوصی طور پر اس کھیل میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی تو میں خود کو ہر لمحے اس دعوت پر لبیک کہنے کو تیار پاتا تھا۔ میں نے چند کپڑے اٹھا کر اپنے سوٹ کیس میں رکھے باقی کپڑے کمرے کی الماری میں رہنے دئے۔ سوٹ کیس اٹھایا اور روفی کی انگلی تھامے کمرے سے نکل کر بابا کی جانب چل پڑا۔

بابا کے پاس گیا تو وہ بھی میرے جانے سے کچھ اداس دکھائی دیتے تھے۔ مجھے گلے لگا کر بولے، بیٹا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کبھی کبھار اس بوڑھے کو اپنی شکل دکھانے آ جایا کرنا۔ میں نے آہستہ سے کہا، بابا جی، آپ کو ہم سب کی عمر لگ جائے۔ آپ میری جانب سے تمام گھر والوں سے معذرت کر لیں کہ میں جاتے وقت ان میں سے کسی سے بھی نہیں مل سکا۔ وہاں سے نکل کر ہم حویلی کے صحن میں آئے جو تالاب سے گزرتا تھا۔ پونم تالاب کے پاس بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اس کو الوداع کہا لیکن اس نے جواب میں اپنا ہاتھ نہیں ہلایا، بس ٹکٹکی باندھے ہمیں جاتا دیکھتی رہی۔ میں نے اب بھی روفی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ نواب صاب کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر روفی کا گال چوم کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ چند لمحے مجھے گاڑی میں بیٹھا دیکھتا رہا پھر بھاگ کر پونم کے پاس چلا گیا اور ہماری گاڑی حویلی کے بڑے پھاٹک سے نکل گئی۔ اچانک نواب صاب نے گاڑی روک دینے کو کہا۔ پھر مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے ہمارا مہاراج کی حویلی میں ان کی اجازت کے بغیر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ ڈرائیور کے ساتھ جا کر مہاراج کی حویلی سے اپنا سامان لے کر سیدھا ہماری حویلی آ جائیں ہم دونوں گوبیندر جی کی گاڑی لے کر اپنی حویلی چلے جاتے ہیں۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک بار پھر حویلی کی جانب موڑ دی۔ ہم نے نواب اور نوابزادہ کو پھاٹک کے قریب اتار دیا اور گاڑی موڑ کاٹ کر مہاراج کی حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔

مہاراج کی حویلی کے راستے میں سوچا کہ مہاراج سے یا راج کماری سے جانے کی اجازت کیسے لوں گا؟ پھر سوچا کہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد میرے لیے وہاں کرنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ مہاراج کی حویلی میں کل کا دن اور بابا کی حویلی میں آج کا دن میرے لیے بوریت کے علاوہ کچھ نہیں لے کر آیا تھا۔ اور میں

یہاں نہ کسی سے مستقل رابطے رکھنے کے لیے آیا تھا اور نہ مستقل رہائش کے لیے آیا تھا۔ جس کام کے لیے مجھے یہاں لایا گیا تھا میں نے وہ کام مہاراج کی حویلی میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہاں میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ جیسے کوئی مزدور اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اپنی راہ لیتا ہے ویسے ہی مجھے ہر جگہ اپنا کام سمیٹنے کے بعد اپنا سامان بھی سمیٹنا چاہیے۔ مجھے ان لوگوں سے ذاتی بنیاد پر تعلقات قائم کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مہاراج سے میرے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ وہ مجھے اپنا بیٹا یا داماد بنا کر اپنے گھر نہیں لے گئے تھے۔ وہ مجھے ایک سپیرے کی حیثیت سے اپنے گھر لے گئے تھے۔ جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا میں ان کی حویلی کو اور ان کو سانپوں کی مسلسل یلغار سے بچاؤں۔ اگر انہوں نے میری کارکردگی سے متاثر ہو کر یا میری ذات سے مرعوب ہو کر مجھے اپنے پریوار کا ایک جزو بنایا تھا یا مجھے اپنے دل میں کوئی جگہ دی تھی یا مجھے اپنے گھر میں کوئی جگہ دی تھی تو اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں ان کے لیے بوجھ بن کر رہ جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں میرے چلے جانے کی خوشی ہونی چاہیے کہ میں نے ان کی اپنائیت کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

انہی سوچوں کے درمیان ہم مہاراج کی حویلی پہنچ گئے۔ مجھے گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر چوکیداروں نے پھاٹک کا دروازہ کھول دیا۔ گاڑی اندر جا کر رکی اور میں نے گاڑی سے اتر کر دیکھا تو بھگوان داس حویلی کے ایک ملازم کو کسی بات پر جھڑک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جھڑکنا بند کر دیا اور ہاتھ جوڑے میرے پاس آ کر کہنے لگا، سرکار یہ کام چور لوگ ایک کام کو دس بار کہنے کے باوجود بھی نہیں کرتے۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، مہاراج کہاں ہیں؟ وہ بولا، اس وقت حویلی میں خادموں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ مہاراج اپنے پریوار کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔ مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ گھر میں کوئی نہیں تھا جس کی وجہ سے میرا یہاں سے نکلنا آسان ہو جائے گا۔ میں نے کہا، اچھا مجھے کہیں جانا ہے اپنا سامان لینے آیا ہوں۔ میں مہاراج کے لیے تمہیں ایک خط لکھ کر دیتا ہوں۔ انہیں یہ خط دے کر میری طرف سے معذرت کر لینا کہ مجھے ان سے ملے بنا جانا پڑا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ میں نواب ادریس خان کے ہاں جا رہا ہوں۔ نواب صاحب تو مہاراج کے پرانے بیلی ہیں سرکار۔ میں ان کی گاڑی دیکھ کر پہچان گیا تھا، بھگوان داس میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ کمرے میں بیٹھ کر مہاراج کو معذرت کا خط لکھ کر بھگوان داس کے حوالے کیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے مسہری کے پاس لٹکی ہوئی رسی کو کھینچ کر خادم کو بلایا۔ خادمہ آئی تو میں نے اسے شلپا کو بلانے کو کہا۔ اسی دوران ایک خط راجکماری روپا کے لیے لکھا:

راجکماری جی

آداب۔

چند ناگریز وجوہات کی بنا مجھے اچانک جانا پڑ رہا ہے۔ اگر نادانستگی میں مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہو تو مجھے شما کر دیجیے۔ بھگوان نے چاہا تو پھر ملیں گے۔

رامو

شلپا کمرے میں آئی تو میں نے خط اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، مجھے اچانک کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ شلپا جی، یہ خط راجکماری جی کو دے دینا۔ اس نے خط میرے ہاتھ سے لے کر پوچھا، بس جی۔ میں جاؤں؟ جی بی بی آپ جائیں، میں نے اس کی بات کے مطلب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شلپا کے جانے کے بعد میں نے اپنے کپڑے اور سوٹ کیس وہیں پر رہنے دئے۔ سوٹ کیس سے بین، منکے، رات کی رانی کی گل پتی اور کالی والا بیگ اٹھا کر پھاٹک پر آیا تو بھگوان داس نے پوچھا، سرکار پھر آپ کے درشن کب ہونگے؟ بہت جلد، میں نے کہا اور گاڑی میں رکھے ہوئے نئے سوٹ کیس میں بین، منکے، رات کی رانی کی گل پتی رکھنے کے بعد کالی کے بیگ کو ہاتھ میں لے کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا اور ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کالی کل رات سے میرے لیے بے قرار ہوگی اس لیے گاڑی کے چلتے ہی مین نے بیگ سے کالی کو نکال کر ہولے ہولے اس سے ایسے باتیں کرنے لگا کہ ڈرائیور کو کالی نظر نہ آ سکے۔ جے پور سے اجمیر تک کا فاصلہ میں نے کالی کے ساتھ گزارا۔

جس وقت ہماری کار اجمیر شہر سے باہر ایک حویلی کی اونچی چاردیواری میں داخل ہوئی، اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے کالی کو بیگ میں رکھا اور باہر حویلی کو دیکھنے لگا۔ چاردیواری کی پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا باغ تھا۔ باغ میں کئی اقسام کے پھلوں کے درخت تھے۔ باغ کے درمیان ایک بڑا سا فوراہ تھا۔ باغ کے اختتام پر ہی بڑا دروازہ تھا۔ دروازے پر نواب صاب اور ان کے داماد کے علاوہ دو اور نوجوان میرے منتظر تھے۔ گاڑی رکتے پر نواب صاب نے خود ہی میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر انہوں نے میرا تعارف نوابزادہ ایاز کے علاوہ نوابزادہ کلیم اور نوابزادہ علیم سے کروایا۔ یہ دونوں بھائی نواب صاب کے بھانجے اور داماد تھے۔ نواب صاب نے شاید میرا تعارف ان سے پہلے ہی کرا دیا تھا۔ تعارف کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا، آپ کا سفر کیسے کٹا؟ میں نے کہا الحمدللہ سفر ٹھیک سے کٹ گیا۔ باپو کی طرح میں بھی لوگوں سے ان کے دھرم یا عقیدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بات کرتا تھا۔ اگر یہ سوال کوئی ہندو کرتا تو میرا جواب ہوتا بھگوان کی کرپا سے سفر اچھا کٹا۔ میرے جواب سے نواب صاب کے علاوہ ان کے دامادوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر ان کے چہروں پر کچھ رونق آ گئی جیسے وہ مجھے مسلمان سمجھتے ہوں۔

نواب صاب نے ایک بار پھر میرا اپنے ہاں آنے پر شکریہ ادا کیا اور مجھے اپنی قیادت میں لے کر حویلی میں داخل ہوئے۔ حویلی اندر سے چار حصوں پر منقسم تھی۔ سب سے اندر والے حصے کو گھرانہ خانہ کہتے تھے جس میں خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ اس کے بعد خدام خانہ تھا جس میں ساری حویلی کے ملازمین رہتے تھے۔ تیسرے حصے کو مہمان خانہ کہتے تھے۔ مہمان خانہ میں دور سے آئے

ہوئے مہمان خاندان اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے۔آخر میں مردان خانہ تھا جو گھر کے مردوں، عارضی مہمانوں، اور مرد مہمانوں کی رہائش گاہوں پر مشتمل تھا۔مردان خانہ حویلی کی بیٹھک کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔نواب صاب مجھے اپنے دامادوں کے ہمراہ مردان خانے میں لے گئے جہاں میرے لیے ایک کمرہ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا۔اس میں ایک نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔میرا تعارف نوجوان سے کراتے ہوئے کہا، یہ کرم دین ہے۔جس کو میں نے یہاں آپ کے قیام کے دوران آپ کی خدمت کے لیے مقرر کیا ہے۔یہ آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھے گا۔

کرم دین نے مجھے سلام کیا تو میں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ سلام کا جواب سن کر سب کے چہروں پر مسرت کے کچھ آثار اور گہرے ہو گئے۔ نواب صاب نے مجھے کمرے میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود میرے سامنے بیٹھ گئے۔ان کے دو دامادان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئے اور تیسرا میرے ساتھ بیٹھ گیا۔آپ عشائیہ کس وقت تناول فرماتے ہیں؟ کرم دین نے مجھ سے پوچھا۔جس وقت مل جائے، میں نے جواب دیا۔میرے جواب پر وہ چاروں مسکرا دیئے۔کرم دین نے کہا، کھانا تیار ہے حضور۔آپ جب مناسب سمجھیں مجھے بتا دیں۔اگر آپ کہیں گے تو میں آپ کو کھانا کمرے میں دے جایا کروں گا۔پھر اس نے دیوار پر نصب ایک بٹن کی جانب میری توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا، اس بٹن کی گھنٹی میرے کوارٹر میں بجتی ہے۔جب بھی آپ کو میری خدمت کی ضرورت ہو مجھے بلا لیجیے۔نواب صاب نے کرم دین سے کہا کہ ہم شان صاب کے ساتھ عشائیہ یہاں مہمان خانے میں کریں گے۔تم تیاری کر کے ہمیں خبر کرو۔کرم دین نے جاتے جاتے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں گوشت کھانا بھی پسند کرتا ہوں یا نہیں۔ کھانے میں گوشت ہو یا سبزی، سب چلتا ہے۔میرا جواب سن کر کرم دین مسکراتا ہوا چلا گیا۔

کرم دین کے جانے کے بعد ایک ملازم میرا سوٹ کیس کمرے میں لے آیا۔نواب صاب نے آنے والے کا تعارف کراتے ہوئے بتایا، یہ ہمارا خادمِ خاص ہے۔یہ صرف نام کا ہی نہیں کام کا بھی بہادر ہے۔یہ میرے کپڑے، جوتے، سوٹ کیس غرض ہر چیز خوب جھاڑ کر مجھے دیتا ہے۔اس کی وجہ سے میں کئی بار سانپ کی کاٹ سے بچا ہوں۔بہادر نے جواباً مجھے آداب کہا تو میں نے اسے آداب کے جواب میں سلام کیا تو وہ بھی خوش ہو گیا۔پھر میں نے اس سے پوچھا تم نے آخری بار اس حویلی میں سانپ کب مار کر دفن کیا تھا؟ اس نے جواب دیا، حضور دو روز قبل میں نے ایک سانپ مار کر اسے گھران خانہ کی جانب پچھلے باغیچے میں دفن کیا تھا۔ میں نے کہا، اچھا کل صبح ناشتے کے بعد مجھے وہاں لے چلنا۔اس کے ساتھ ہی میں نے نواب صاب کی جانب رُخ کر کے کہا، کل آپ کا وہاں ہونا بھی ضروری ہے۔ جی انشاءاللہ میں وہاں پر ہوں گا۔لیکن کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ سانپ مار کر دفن کرنے اور سانپ مار کر پھینکنے میں کیا فرق ہے؟ یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا یا دکھاؤں گا، میں نے جواب دیا۔کرم دین نے کمرے میں داخل ہو کر ہمیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو ہم کھانے کے لیے اٹھ گئے۔کھانا کھاتے کھاتے رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا اس لیے نواب صاب کل صبح ناشتے پر ملنے تک کے لیے مجھے شب بخیر کہہ کر چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

رات کو خواہ میں کتنی دیر سے سوؤں، مجھے صبح ہمیشہ جلد اٹھنے کی عادت ہے۔اس لیے آج بھی حسبِ معمول صبح جلد آنکھ کھلی۔نہا کر جین کی پتلون اور شرٹ پہنی۔غسل خانے سے نکلا تو کرم دین نے مجھے ناشتہ کی تیاری کی خبر سنائی۔ ناشتے کی میز پر نواب صاب اکیلے تھے۔میں ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات کو کھانا دیر سے کھایا تھا جو ابھی تک ہضم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے نواب صاب کے زور دینے کے باوجود صرف چائے کی ایک پیالی پر ہی اکتفا کیا۔ناشتے کی میز پر سے اٹھنے سے پہلے میں نے کرم دین سے بہادر کو بلوایا اور نواب صاب کو اپنے کمرے میں لے آیا۔کمرے میں آ کر میں نے کالی والا بیگ اٹھایا اور نواب صاب کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ہر جاندار اپنے جسم سے ایک قسم کی بُو یعنی (Pheromones) مسلسل خارج کرتا ہے۔ہم، یعنی انسان بعض قسم کی بُو سونگھ سکتے ہیں اور بعض قسم کی بُو نہیں سونگھ سکتے۔مثال کے طور پر ہم خوشبودار بدبو سونگھ لیتے ہیں لیکن اور اقسام کی بُو سونگھنے پر قدرت نہیں رکھتے۔اسی طرح دوسرے جانور نہ صرف ایک دوسرے کی بُو بلکہ انسانوں کی بُو بھی سونگھ لیتے ہیں۔کھوجی کتے انسانوں کی کھوج بھی اسی بُو کی سہارے لگاتے ہیں۔چونٹیاں اسی بُو سے اپنی خوراک تلاش کرتی ہیں اور اسی بُو کے بل بوتے پر سانپ اپنے اپنے جوڑوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔پانچ سال پہلے آپ نے جو سانپ مارا تھا اگر اسے دفن کرنے کی بجائے جنگل میں یا کسی کوڑے میں پھینک دیتے تو آپ کو اس مصیبت سے نہ گزرنا پڑتا۔کوڑے پر پھینکا ہوا یا جنگل میں پھینکا ہوا سانپ گدّھوں، چیل، کوؤں یا جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتا ہے۔اس لیے اس کی باس یا بُو باقی نہیں رہتی۔اس کے برعکس اگر سانپ دفن ہو تو اس کی باس نہ صرف اس کے جسم میں اور اس کے مدفن کی مٹی میں شامل ہو کر امر ہو جاتی ہے بلکہ اپنے جوڑوں کے متلاشی سانپوں کو مسلسل اپنی جانب متوجہ کرتی رہتی ہے۔جوڑے کی تلاش میں آنے والے سانپ جب مدفن کے قریب آ کر مٹی سونگھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی مارنے والے کی بُو بھی سونگھتے ہیں اور یہ بُو سونگھ کر وہ پاگل ہو کر مارنے والے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔اور اسی بُو کے سہارے وہ ہزاروں میل کا سفر کرتے ہوئے مارنے والے سے اپنے ہم جنس کے قتل کا انتقام لیتے ہیں۔آپ پچھلے پانچ سال سے سانپوں کے اسی انتقام کی زد میں ہیں۔

میری باتیں سن کر نواب صاب کا منہ حیرت سے لٹکا ہوا تھا۔چند لمحوں تک نواب صاب سے کچھ بھی نہیں کہا گیا، بس وہ حیرت سے میرا منہ تکتے رہے۔پھر ان کے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا، حضور، آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ نہ صرف میں نے اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا ہے کہ یہ

دردِسر میں نے خود ہی نادانستگی میں اپنے سر مول لیا ہے۔ جی ہاں، میں نے نواب صاب کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ آپ کی نظر میں اب اس کا کیا حل ہے؟ نواب صاب نے سوال کیا۔ ابھی میں آپ کی موجودگی میں ایک تجربہ کروں گا۔ آپ کے سوال کا جواب تجربے کے بعد آپ کو دوں گا۔ کیسا تجربہ؟ نواب صاب نے پوچھا۔ میری بات شروع ہوتے ہی بہادر بھی کمرے میں آ کر ایک جانب کھڑا ہو کر میری باتیں سننے لگا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں بیگ لے کر نواب صاب کو دکھاتے ہوئے کہا، اس بیگ میں میرا ایک پالتو سانپ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری موجودگی میں آپ کو اس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے میں اس کو کھول کر آپ کے آگے کروں گا۔ اس کے بعد ہم اس سانپ کو آپ کی حویلی میں سانپ کے کسی مدفن کو سنگھوائیں گے پھر اسے آپ کے قریب لا کر اس کا ردِعمل دیکھیں گے۔

کالی کو بیگ سے نکالنے سے پہلے میں نے نواب صاب کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا، حضور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسے اپنے بیگ سے نکالوں؟ نواب صاب نے بہادر کی جانب دیکھا، پھر مجھے کہا، جی آپ نکالیے۔ میں نے بیگ کھول کر کالی کو نکالا۔ کالی کو دیکھتے ہی نواب صاب اور بہادر چونکنا ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے کالی کو اپنی گردن میں ڈال کر نواب صاب سے کہا، حضور میں اس سانپ کو آپ کے قریب لاؤں گا۔ آپ بغیر کوئی حرکت کیے اسی حالت میں بیٹھے رہیں۔ میں اپنی ہر حرکت سے پہلے نواب صاب کو جان کر آ گاہ کرتا تھا جس کا مطلب انہیں تیار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کالی کو اپنی گردن میں لٹکائے نواب صاب کے اور پھر بہادر کے قریب آیا۔ کالی نے دونوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، بس میری گردن میں لٹکی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد میں نے کالی کو واپس بیگ میں رکھ کر نواب صاب سے کہا، آپ نے دیکھا کہ میرے سانپ نے آپ دونوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ اب آپ مجھے اپنے ساتھ آخری سانپ کی جائے مدفن تک لے جائیں۔

کالی کے بیگ میں واپس جانے پر دونوں اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ بہادر نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کو کہا، آیئے حضور میں آپ کو گھران خانہ کے پیچھے باغ میں لے جا کر وہ جگہ دکھاتا ہوں جہاں میں نے چند دن پہلے سانپ دفن کیا ہے۔ میں نے نواب صاب کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم ایک بڑے برآمدے سے ہوتے ہوئے گھران خانے کے بڑے دروازے تک آئے جہاں بہادر نے مجھے روک کر کہا، حضور پچھلے باغ کی جانب جاتے ہوئے محرم خانے سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ یہاں رکیں میں اندر پردے کا انتظام کروانے کے بعد آپ کو اپنے ساتھ لے کر چلوں گا۔ مجھے باہر روک کر نواب صاب اور بہادر اندر چلے گئے۔ چند منٹ بعد بہادر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اندر نوکرانیاں اِدھر اُدھر کام کاج میں مشغول تھیں۔ میں کالی کا بیگ تھامے اپنی نظریں جھکائے بہادر اور نواب صاب کے پیچھے چلتا ہوا برآمدے کے پچھلے دروازے سے نکل کر باغ میں داخل ہو گیا۔

باغ میں آ کر میں نے اپنی نظریں اُٹھائیں۔ یہ باغ باہر کے باغ سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس باغ کے درختوں سے چند جھولے بھی لٹک رہے تھے۔ باغ کی پچھلی دیوار کے پاس گلاب کی جھاڑیوں کے قریب بہادر نے چلتے چلتے ایک جگہ رک کر مجھے بتایا کہ چند دن پہلے اس نے ایک سانپ یہاں دفن کیا تھا۔ میں نے سانپ کا مدفن دیکھا کر نواب صاب سے کہا، حضور اب میں اپنے سانپ کو ایک بار پھر نکال کر یہ مدفن سنگھواؤں گا۔ پھر اس کو آپ کے قریب لے آؤں گا۔ لیکن اس بار آپ مجھ سے کچھ دُور رہیں۔ نواب صاب اور بہادر اس بار مجھ سے کچھ پیچھے رہ گئے، میں نے بیگ کھول کر کالی کو نکالا اور اس کا رخ سانپ کی جائے تدفین کی جانب پھیر دیا۔ کالی چند لمحے مدفن کو سونگھتی رہی پھر پیچھے مڑ کر پھنکاری اور پھر پھنکار کر اُڑتی ہوئی نواب صاب اور بہادر پر حملے کے لیے لپکی۔

بہادر اور نواب صاب کالی کے کڑے تیور دیکھ کر کئی قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔ اگر کالی کی دُم میرے ہاتھوں میں نہ ہوتی اور اگر میں کالی کے اس ردِعمل کے لیے تیار نہ ہوتا تو کالی نواب صاب کو یا بہادر کو ڈس چکی ہوتی۔ جیسے ہی کالی اُچھلی میں نے اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ کالی کا پھن پھیلا ہوا تھا اور وہ مسلسل ایسے پھنکارے جا رہی تھی جیسے سخت غصے کے عالم میں ہو۔ میں نے اس کو آہستہ سے سہلاتے ہوئے اپنے بیگ میں واپس ڈال کر نواب صاب سے کہا، حضور آپ نے دیکھ لیا کہ جس سانپ نے چند منٹ قبل میرے کمرے میں آپ کی جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے اب کس غصے کی حالت میں آپ پر وار کیا ہے۔ اس جگہ کو سونگھنے کے بعد دوسرے سانپوں کا بعین یہی ردِعمل ہوتا ہے۔ پھر میں نے بہادر سے سوال کیا، مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک کتنے سانپ مار کر اس حویلی میں دفن کیے ہیں۔ کوئی ساٹھ کے قریب، وہ بولا۔ تمہیں ان سب کی جائے مدفون تو معلوم نہیں ہوں گی؟ میں نے پوچھا۔ نہیں حضور، کچھ کی تو شاید یاد ہیں۔ لیکن بہت سوں کی قبریں تو مجھے اب یاد بھی نہیں ہیں، بہادر بولا۔ میں نے بہادر سے کہا جو قبریں تمہیں یاد ہیں انہیں کھدواؤ۔ قبروں میں سے سانپ کی باقی ماندہ ہڈیاں نکال کر ایک ڈرم میں ڈال کر آگ لگا دو۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ کھدی ہوئی قبریں مجھ سے پوچھے بنا نہ بھرنا۔ حویلی میں آتے ہوئے راستے میں میں نے کھنگل کے کئی درخت دیکھے تھے کسی کو بھیج کر ایک دومن کے قریب کھنگل کا برادہ بھی منگوا لو۔ کھنگل چڑ کی ایک قسم کا درخت ہے (A variety of pine tree that grows at lower eleation)۔ اچھا حضور میں ابھی یہ سب کچھ کرانے کی ہدایات دیتا ہوں۔

بہادر ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے نواب صاب کی جانب دیکھ کر کہا، جو میری تمام ہدایات کو بڑی توجہ اور حیرت سے سن رہے تھے۔ میں نے کہا، کیا آپ کم از کم آج کے دن کے لیے یہ حویلی خالی کروا سکتے ہیں؟ وہ کیوں؟ نواب صاب نے پوچھا۔ بہادر کو پچھلے پانچ سالوں میں دفن کیے گئے تمام سانپوں کی قبریں یاد نہیں ہوں گی۔ حویلی میں اگر ایک آدھ قبر بھی رہ گئی تو آپ کی یہ مصیبت

کبھی نہیں ٹلے گی۔اس لیے میں اپنے سانپ کو استعمال کر کے باقی ماندہ قبروں کا کھوج لگاؤں گا۔جس کے لیے مجھے اپنا سانپ کھلا چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے اس حویلی کے چپے چپے پر چلنا پڑے گا۔یہ سانپ بُو پاتے ہی قبروں پر رک کر ان کی نشان دہی کرتا جائے گا۔اس سانپ نے آپ کو سونگھا ہے اس لیے میں یہ سانپ خصوصی طور پر آپ کی موجودگی میں کھلا نہیں چھوڑ سکتا اس لیے کہ یہ کھل کر صرف آپ کی اور بہادر کی بُو پر جائے گا۔اس لیے آپ کو ہر حالت میں یہ حویلی اس وقت تک چھوڑنا ہوگی جب تک میں آپ کو واپس نہ بلواؤں۔باقی لوگوں کی موجودگی میں یہ سانپ کھلا چھوڑ کر میں مکینِ خانہ کے لیے بھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا۔اس لیے آپ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کم از کم آج کا دن کہیں بسر کریں تو میں کسی خوف کے بغیر کھلے دل سے کام کرنا شروع کر دوں گا۔آپ میرے ساتھ کم از کم دو خادموں کو لگا دیجیے تا کہ میں بوقتِ ضرورت انہیں کام میں لا سکوں۔

میرا تفصیلی جواب سن کر نواب صاب نے پوچھا اور آپ نے کھگل کا برادہ کس لیے منگوایا ہے؟ میں نے جواب دیا، یہ برادہ سانپ کی باس مارنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔اس کو خالی قبروں کی مٹی میں ملا کر قبروں کو دوبارہ بھرا جائے گا۔جس کے نتیجے میں پھر کوئی اور سانپ آپ کی حویلی میں اپنے جوڑے کی تلاش میں آ کر آپ کی بو نہیں سونگھ پائے گا۔میرا جواب سن کر نواب صاب کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔پھر کہنے لگے، میں تو آسانی سے چلا جاؤں گا لیکن تمام اہلِ خانہ کے ساتھ دن بھر کے لیے بے گھر ہونا کوئی آسان کام نہیں۔میں نے جواب دیا، آپ نہیں چاہیں گے کہ میں سانپ کے تعاقب میں آپ کے گھر کے ہر کمرے میں اور زنان خانے میں دندناتا پھروں؟ کیا آپ کمروں میں بھی جائیں گے؟ نواب صاب نے پوچھا۔میں خود کہیں نہیں جاؤں گا لیکن میں ہر اس جگہ جاؤں گا جہاں جہاں میرا سانپ مجھے لے جائے گا۔اور مجھے معلوم نہیں کہ یہ سانپ مجھے حویلی میں کہاں کہاں لے جائے گا۔اس لیے حفظ ماتقدم کا تقاضا یہی ہے کہ حویلی اہلِ خانہ سے خالی ہوتا کہ مجھے ہر جگہ جانے کی کھلی آزادی ہو۔

میری بات نواب صاب کی سمجھ میں آئی تو وہ مجھے وہیں رکنے کا کہہ کر خود گھر ان خانہ کے اندر چلے گئے۔میں قریب پڑے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے نواب صاب کی واپسی تک کے لیے مراقبے میں چلا گیا۔باپو کا کہنا تھا کہ چھوٹے چھوٹے مراقبے ذہن تازہ دم رکھتے ہیں۔معلوم نہیں نواب صاب کو گئے ہوئے کتنا وقت گزرا تھا کہ کسی کے شور مچانے پر میں نے آنکھیں کھولیں۔ابھی میری آنکھیں پوری طرح نہیں کھلیں تھیں کہ میرے سر پر ایک شدید ضرب پڑی۔میں نے اپنا سر بچانے کی کوشش میں اپنا ہاتھ سر کی چوٹ پر رکھنے کے لیے اوپر اٹھایا ہی تھا کہ میرے سر پر ایک اور چوٹ پڑی پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا میرے سر پر ضربوں پر ضربیں لگا رہا ہو اور میں ان تابڑ توڑ ضربوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے حواس کھو بیٹھا۔

☆

"مرحلہ"

شگفتہ نازلی (لاہور)

درس و تدریس کے مراحل میں۔۔۔
مرحلہ ایک یوں بھی آیا کبھی۔۔۔
اپنے شاگردہم کو سمجھائیں۔۔۔
وہ جو ہم نے کبھی تھا سمجھایا۔۔۔
اور۔۔۔پھر سوچتے چلے جانا۔۔۔
لطف انگیز آگہی کو لئے۔۔۔
لذت آمیز سرخوشی کو لئے۔۔۔!

○

"لاجواب"

پطرس بخاری سے پوچھا گیا: کیا آپ کبھی لاجواب ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں ایک بار۔ہوا یوں کہ میری گھڑی خراب ہوگئی۔بازار میں گھڑیوں کی دکان نظر آئی میں دکان میں گیا انہیں گھڑی دی کہ یہ ٹھیک کرانی ہے۔وہ کہنے لگے ہم تو گھڑیاں ٹھیک ہی نہیں کرتے۔میں نے پوچھا: تو آپ کیا کرتے ہیں؟ جواب آیا: جی ہم ختنے کرتے ہیں۔میں نے پوچھا: تو پھر یہ گھڑیاں کیوں لٹکائی ہوئی ہیں؟ دکاندار بولا: تو آپ ہی بتا دیں کہ ہم کیا لٹکائیں؟

○

"تمنا ہے"

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامہ ساؤتھ امریکہ سے انتخاب)

پروین شیر (امریکہ)

آخری قسط

ہوا کی نرم سانسیں اس کی سانسوں میں گھل مل رہی تھیں۔ دیوارِ دل سے غمِ دوراں کی کائی دور کررہی تھیں۔ جس کی زد میں آئے ہوئے احساسات کے دریدہ دامن کے بخیے ہوا کی نازک انگلیاں سل رہی تھیں۔ اور اس پر سرشاری کے پھول ٹانک رہی تھیں۔ ان ہواؤں کا لمس رگوں میں تحلیل ہو کر روح میں اتر رہا تھا۔۔۔ پہاڑوں کی بانہوں میں بادلوں کے سفید پرندے آرام کررہے تھے۔ یہ خوابوں سا سماں کسی مصور کا حسین خیال تھا جیسے رنگ اور خوشبو کے دریچے کھلنے لگے ہوں۔۔۔ صیقل فضاؤں نے وہ سرشاری عطا کی تھی جس کا کوئی نام نہ تھا۔ روحانی سکون کی لذت سے تر بتر احساس کا لمس جس کی روشنی افزوں تر ہو رہی تھی۔ سوچ کے اُفق پر نظم کا سورج طلوع ہونے لگا تھا۔ تخلیقیت کی تتلیاں اڑنے کے لیے اپنے رنگین پروں کو تول رہی تھیں اور اُڑ کر قرطاس کی شاخوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ خواب ناک قدرتی حسن کے ریشم سے اس نے یہ نظم بُن لی تھی۔۔۔

خواب زار

کھلا کھلا یہ آسماں
یہ خواب زار سی زمیں
فرازِ کوہسار کی جبیں پہ شمس کی دراز انگلیوں کے نرم لمس
نیلگوں سما کے بحرِ بے کراں پہ سرمئی
سفید بادلوں کی تیرتی ہوئی یہ کشتیاں
سکوت کے لبوں پہ یہ کہانیاں
یہ نغمہ سنج آبشار، نم ہوا
گلوں کے سرخ، ریشمی لبوں کو چومتی ہوئی
بلند کوہسار کے بدن پہ ابر کی ردا
یہ دھند میں گھنے شجر کے سلسلے
کبھی عیاں کبھی نہاں
نگاہیں سن رہی ہوں جیسے کوئی دلربا غنائی گیت
اس حسین خواب کی لطافتوں نے چھولیا ہے دل
کہ روح میں پگھل کے بہہ رہا ہے لمس کا نشہ
سحر طراز یہ سماں
سحر زدہ یہ دل مرا
ہوا کے دوش پر اُڑا
حسیں جہاں میں کھو گیا!

جادو کا یہ حباب ٹوٹ گیا تھا جب گائڈ کی آواز نے سماعت کے دریچے پر دستک دی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے مناظر کے جواہر کیمرے کی جھولی میں چرا کر رکھ لیے تھے۔ کہ یہ زندگی کے ساتھ رہیں گے۔ وہ اس خواب کدے سے دور ہو جائے گی پھر بھی۔

لمحاتِ سراسیمگی

زندگی کے کچھ لمحات اس طرح ضد پر اُتر آئے ہیں کہ ذہن و دل سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ بے بسی اور سراسیمگی کے بیس منٹ۔۔۔ ایک Traumatic تجربہ جسے وہ کبھی بھول نہیں سکتی۔

کوسکو میں چند گھنٹوں کے لیے سیاحوں کو کیرولینا نے آزاد گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یعنی گائڈ کے بغیر۔۔۔ جسے جہاں جانا تھا وین لے کر جا کر چھوڑ رہی تھی اور ایک مقررہ وقت پر انہیں واپس لانے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ پروین کوسکو کے سب سے بڑے مارکٹ میں رک گئی تھی۔ وین اُسے یہاں چھوڑ گئی تھی اور ایک گھنٹے میں واپس لینے کے لیے آنے والی تھی۔ یہ مارکٹ جس سڑک پر ہے اس کا نام Avenida Elsol ہے۔۔۔ سرخ رنگ کی بڑی سی عمارت میں یہ کوسکو کا سب سے بڑا مارکٹ ہے جس کا نام Centro Artesanal Cusco ہے۔ یہاں تقریباً تین سو پچاس دوکانیں ہیں۔ چھوٹی بڑی۔ شوخ رنگوں کے Textiles اور مصنوعات سے بھرپور۔۔۔ ہر طرف تنگ راستوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں بھی نظر جاتی تھی الپاکا اور لاما کے فر سے بنے ہوئے سامان۔ مصوری، ہینڈی کرافٹ سجے ہوئے تھے۔ سب دوکانیں ایک جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ خوب مول تول ہو رہے تھے۔ پروین اشاروں میں باتیں کر رہی تھی کیونکہ یہاں کوئی انگریزی زبان نہیں جانتا تھا۔ وہ مقامی فنکاروں کی مصوری دیکھنے میں محو تھی کہ اچانک جب گھڑی نے اُسے واپس وین کی طرف باہر چلنے کو کہا تو وہ چکرا گئی تھی۔ جدھر بھی قدم اُٹھتے تھے وہ غلط راستہ تھا۔ بالکل بھول بھلیاں۔۔۔ پہلے وہ اطمینان سے راستہ تلاش کر رہی تھی لیکن جب یہ احساس ہوا کہ وہ تو یونہی بھٹک رہی تھی۔ صحیح راستہ تو کھو گیا تھا۔ تب۔۔۔ اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئی تھیں۔ پیشانی پر اضطراب کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ قدم تیز ہو گئے تھے اور نظریں بدحواس۔ نہ تو ہوٹل کا فون نمبر ساتھ تھا نہ پتہ۔ وہ تیزی سے کبھی اس گلی کبھی اُس گلی دوڑ رہی تھی۔ باہر جانے کا دروازہ غائب تھا۔ بالکل جیسے کبھی روح جسم کے اندر بھٹکتی ہے۔ جسم کی دیواروں سے سر ٹکراتی ہے لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ یہ لمحات بھی کچھ ویسے ہی تھے۔ یہ تجربہ بھی ویسا ہی تھا۔ وہ اس مارکٹ کی بھول بھلیوں میں تنہا تھی،

گونگی تھی۔اشاروں کی دنیا میں۔ایک جم غفیر کے ساتھ۔لیکن بالکل تنہا۔گرچہ کہ اس مارکٹ کی دنیا سے باہر بھی یہی عالم ہوتا ہے۔یہ پوری دنیا بھی اسی مارکٹ کی طرح تو ہے۔بھول بھلیوں میں لوگ بھٹکتے ہیں۔۔۔راستے کی تلاش میں جو منزل تک لے جائے۔۔۔لیکن!

وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔۔۔بھاگتی جارہی تھی لیکن ناکام تھی۔اس وقت پھر ایک احساس پوری طرح جاگ اٹھا تھا کہ زبان کتنا بڑا سہارا ہے۔تحفظ کا ذریعہ ہے۔ورنہ اس زمین اور کسی دوسرے سیارے میں کوئی فرق نہیں۔۔۔ سینکڑوں لوگوں کے درمیان ہوکر بھی وہ کسی سے مدد نہیں مانگ سکتی تھی۔بیس منٹ تک ہراساں ہونے کے بعد یکا یک کامیابی حاصل ہوئی تھی۔۔۔گویا بیس تک وہ کسی دوسرے سیارے پر تھی۔۔۔تنہا، بے بس اور پریشان اپنی زمین پر پہنچنے کے لیے۔جیسے ہی باہر جانے کا دروازہ نظر آیا، ساری پریشانیاں دور ہوگئی تھیں۔

وین میں بیٹھی ہوئی وہ سوچنے لگی تھی۔۔۔کوئی ہم زباں نہ ہو تو کس طرح بے بسی دہلا دیتی ہے۔۔۔اس دنیا میں۔۔۔کچھ لوگوں کو روحانی ہم زبان کبھی نہیں ملتا۔وہ زندگی بھر دنیا کے بازار میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔۔۔جسمانی ہم زباں کے درمیاں لیکن بالکل تنہا۔۔۔!

آخری رات

آج پیرو (لیما) میں آخری رات تھی۔دیگر ممالک کی طرح یہاں بھی الوداعی ڈنر کا اہتمام تھا، خوبصورت ریستوران تھا، تمام سیاحوں اور کیرولینا کا ساتھ تھا۔تین ہفتوں کا مستقل ساتھ ایک دوسرے سے بچھڑنے کی اُداسی پیدا کر رہا تھا۔۔۔گروپ ٹور میں اتنے دنوں ہر وقت ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک خاندان کا احساس ہونے لگتا ہے۔ہر بار یہی کیفیت ہوتی ہے۔

شام بہت خوشگوار تھی۔Pacific Ocean کے قریب۔ روشنیوں سے شہر جگمگا رہا تھا۔بھیگی ہواؤں کا اڑتا ہوا آنچل آ کر پھر سے اس سے لپٹ گیا تھا۔سامنے حسین پارک تھا۔جہاں درختوں کی ڈالیاں سبز، ریشمی دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں جو ہوا میں لہرا رہے تھے۔پودے سرخ پھولوں کی قبا میں چھپے ہوئے تھے۔خیابانوں میں رنگوں کا دریا تھا۔دور افق کے ہونٹ سرخ تھے اور فلک کے رخسار گلابی ہو رہے تھے۔درختوں کی شاخیں اپنے ہاتھوں میں رنگ تھامے ہوئے مستی میں جھوم رہی تھیں۔فضاؤں کا چہرہ کچھ مصنوعی کچھ قدرتی رنگوں سے گلنار تھا۔کسی مصور کا پیلیٹ معلوم ہو رہا تھا۔

سب سیّاحوں کے چہروں پر اُداسی کے رنگ تھے۔اس حسین ملک کو چھوڑنے کی اُداسی بے فکری کے لمحات ختم ہونے کی اُداسی، واپس مشینی ماحول میں جانے کی اُداسی، دلچسپ حال کے ماضی بن جانے کی اُداسی، ایک دوسرے کا ساتھ چھوٹنے کی اُداسی۔

سب سیاح باری باری کھڑے ہوکر حسب دستور اپنے تاثرات اس سفر کے متعلق بیان کر رہے تھے۔ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔اور یادگار گروپ تصویریں ایک دوسرے کو تحفے میں دے رہے تھے۔کیرولینا کو بھی اس کی مہمان نوازی کے لیے تحفے دیے جارہے تھے۔جب آخر میں کیرولینا نے الوداعی تقریر کی تھی تو پروین کے ساتھ کچھ اور سیاحوں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔سبھی نے اُٹھ کر کیرولینا کو اس کی حد درجہ خوش مذاقی اور مدد کے لیے گلے لگا لیا تھا۔ایک دوسرے سے ای میل تبدیل کیا تھا تا کہ رابطے میں رہ سکیں۔

تجریدی

کیرولینا آج اپنی ذاتی زندگی کی کہانی سنا رہی تھی۔جدا ہونے سے پہلے۔بتیس سال کی ہوکر اس نے اب تک اس لیے شادی نہیں کی تھی کہ اُسے کوئی ایسا نہیں ملا تھا جو اس کو پوری طرح سمجھ سکے۔اُسے کسی وفادار اور ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس کا آئینہ ہو۔جو اس کی بات بغیر کہے سمجھ لے اس گروپ میں ایک جوڑا یونان کا تھا جس کی شادی دو ماہ بعد ہونے والی تھی۔مغرب میں گوروں کا زیادہ تر یہ دستور ہے شادی سے قبل ایک ساتھ سفر کرتے ہیں تا کہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں۔اتنی احتیاط کے بعد بھی اکثر انجام المناک ہی ہوتا ہے۔کیرولینا کے تنہا ہونے کی یہی وجہ تھی۔اور یہ وجہ سچ ہی تو تھی۔۔۔کون کس کو جان سکا ہے؟ دو زندگیاں شکر اور پانی کی طرح کب ایک دوسرے میں گھل سکی ہیں؟ تیل اور پانی ایک ساتھ تیرتے ہیں لیکن بالکل جدا۔ایک دوسرے میں گھُل تو نہیں سکتے۔۔۔

کیرولینا شکر اور پانی والے رشتے کے لیے بھٹک رہی تھی۔پروین اُس کی نادانی پر مسکرا رہی تھی۔۔۔اور اُسے اپنی یہ نظم سنائی تھی جسے کیرولینا اپنی ایک دوست کو اسپینی زبان میں ترجمہ کر کے سنانے لگی تھی۔۔۔

تجریدی آرٹ

تری یہ دنیا
ہے خوبصورت نگار خانہ
چہار جانب
تری ہی تخلیق جا بجا ہے
جدھر بھی دیکھیں
جہاں بھی جائیں
حسین شہکار ہیں نمایاں
نگار خانے کے رنگ ہر سو
چمک رہے ہیں
نظر نظر میں سما گئے ہیں
مگر یہاں تیرا ایک پیچیدہ کارنامہ بھی ایسا ہے جو
سبھی کے سر سے گزر گیا ہے
کہ جس نے دیکھا وہ اپنی منطق
سے ہار کر دور جا چکا ہے
ہیں کچھ جواب بھی کھڑے ہوئے ہیں

بہت ہی پیچیدہ گتھیوں میں الجھ الجھ کر
اسے سمجھنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں
ہزار جتنوں کے بعد بھی وہ نہ تہہ میں اس کی پہنچ سکے ہیں
نہ اس کو اب تک سمجھ سکے ہیں۔۔۔
خدائے برتر
بنا کوئی قدرداں بھی ایسا
جو حل کرے تیرا یہ معمہ، اسے سراہے
کوئی تو ہو جو مجھے بھی پڑھ لے!

سب سیّاح اور کیرولینا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ پروین سوچ رہی تھی ناپائیدار رشتوں کے متعلق کہ اب یہ سب ایک دوسرے کو شاید ہی کبھی دیکھ سکیں۔ تین ہفتوں کے مستقل ساتھ نے ایک دوسرے کو قریب کر دیا تھا۔ دنیاوی رشتے تو ایسے ہی ہوتے ہیں زیادہ تر۔ خواہ وہ خون کے رشتے ہوں یا جذبوں کے۔ کچھ سانسوں کے دوران ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور کچھ سانس ٹوٹنے کے بعد۔۔۔ یہ حباب کی طرح ابھرتے ہیں اور بکھرتے ہیں۔ اکثر رشتے سانس ٹوٹنے کا انتظار نہیں کرتے۔ اُس سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔

زندگی یونہی گزر جاتی ہے۔۔۔ رشتوں کے ٹوٹنے میں نئے رشتے بننے میں پھر۔۔۔ وہ بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ انسان اس صورتِ حال کا یوں عادی ہو جاتا ہے کہ یہ سب نارمل لگتا ہے لیکن کچھ لوگ اس کے عادی نہیں ہو پاتے۔ رشتے کے بلبلے ٹوٹنے پر خود بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔۔۔

ذہن کا ضدی بچہ

طیارہ کینیڈا کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ حسب دستور۔۔۔ اڑتے ہوئے۔۔۔ زمین سے بہت دور۔۔۔ اُسے زمین یاد آنے لگی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے خلاؤں میں بکھرے ہوئے ستارے چھوٹے چھوٹے گھر ہوں۔۔۔ اور زمین اس کا گھر تھی اور وہ اس سے بہت دور تھی۔ بے گھری کا عجب احساس تھا۔ اپنی زمین سے ایک خاص کشش کا انوکھا احساس۔ اس وقت وہ زمین پر ہزاروں ہزار تفرقوں کی دیواروں کو بالکل بھول چکی تھی۔ آنسوؤں اور نفرتوں کے عذاب بھول چکی تھی۔ ظلم و تشدد کچھ یاد نہ تھے۔ زمین صرف اپنے پیارے گھر کی صورت یاد آئے جا رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہاں خواب کدوں کے ساتھ تلخ حقائق کے سنگ کدے بھی تو ہیں۔ اس وقت صرف اپنی زمین پر اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔۔۔ گھر کے سامنے کھڑا ہوا اس کا دیرینہ دوست۔۔۔ پرانا درخت یاد آ رہا تھا۔۔۔ جو سفید لباس پہنے ہوئے کھڑا ہوگا۔ لیکن زمین نظروں سے اوجھل تھی۔۔۔ بہت دور۔۔۔ اور پھر اس کی نظریں طیارے کی چھوٹی سی کھڑکی سے آسمان کے سمندر میں غرق ہو گئی تھیں۔ ستاروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور چاند کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر اس سے بہت کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔ وہ کہکشاں کی پگڈنڈی پر جا پہنچی تھی۔ سوچ میں گم۔۔۔ کہ لامتناہی کائنات کی حد کیا ہے؟ اس کا سرا کہاں ہے، شروع کہاں اور ختم کہاں؟ یا پھر لامتناہی؟ خلا میں بکھری ہوئی اور کتنی دنیائیں ہیں؟

کائنات کے تخلیق کار کی اس کاریگری کی کیا وجہ ہے؟ اس کے ذہن کا بچہ ضد پر اتر آیا تھا اور سوالات کی بوچھار کرتا ہی جا رہا تھا۔۔۔ پھر یہ نظم بے چین ہو کر اڑتی ہوئی آ گئی تھی۔۔۔

تجسس

تجسس کی عجب ساعت
نظر حیران، استغراق میں پیہم
قدم آ کر رکے جب
کہکشاں کی دور تک جاتی ہوئی پگ ڈنڈیوں پر
سوچ کے کویا سے پھر نکلے
سوالوں کے یہ ریشم۔۔۔ دن بدن الجھے!
خلائے بے کراں میں
ان ستاروں اور سیاروں کے لاکھوں جال یوں بکھرے ہوئے
اور آسماں اسرار کی چادر میں یوں سمٹا ہوا
بحرِ خلاء کی بے کرانی میں
ہوئیں غرقاب استفسار سے لپٹی ہوئی نظریں
جو پیہم ڈھونڈتی ہیں سیپیاں سارے جوابوں کی
سوالوں کی بہت مضبوط زنجیروں میں جکڑا ذہن کا بچہ
ہمکتا ہے، مچلتا ہے!
کہ اوراقِ خلاء پر کیوں رقم ہیں اتنے افسانے؟
کہ سچ مبہم بھلا کیوں ہے؟
تسلسل یہ حیات و موت کا ہر پل ہے کیوں جاری؟
کوئی مشفق، کوئی کاہن تو کھولے
ناخنِ تدبیر سے اسرار کی گرہیں!!

سیکنڈ کا اربواں حصّہ

ناسا کے ماہرین نے ایسی سٹاپ واچ ایجاد کر لی ہے جو سیکنڈ کا اربواں حصّہ معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس ایجاد کی مدد سے گلیشیئرز کے پگھلنے اور جنگلات کی کمی بیشی کے حوالے سے انتہائی باریک بیں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بلندی کی پیمائش کے لیے ہر رنگ کی چھ لیزر بیم نصب ہوں گی جس کی مدد سے زمین سے خلاء میں موجود سیٹلائیٹ کے درمیان فاصلے کی پیمائش ہو سکے گی۔ یہ سٹاپ واچ بادلوں اور سیٹلائیٹ (آئس سیٹ ٹو) کے لیے بنائی ہے جو 2018ء میں لانچ کی جائے گی۔

''بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ؟''

لاوارث سامان

حسن منظر
(کراچی)

گندے نالوں کی پُلیوں کے نیچے
خالی ڈبّوں میں ٹرینوں کے
بیٹھی قبروں،
لاوارثوں کے
تکیوں، قبھوں میں
جو پڑی ہیں گٹھڑیاں، پٹلیاں
میں ان میں کبھی بھی
نہیں جھانک کر دیکھتا ہوں

بلکہ کپڑے میں لپٹے بندے کو
جن پہ ہوتا ہے دھوکا
ٹونے ٹوٹکے کا
ڈر سے انہیں بھی نہیں کھول کر دیکھتا ہوں

اور یوں بھی کہ
ڈر ہوتا ہے اُن میں
بم ہوگا یا اسلحہ
یا چوری کے گہنے
نقدی اور روکڑ۔
کوئی چور تھا
جس کے پیچھے پولس تھی
اور وہ اس پوٹ کو
پھینک کر
ہوگیا گم شہر کے دھوئیں میں۔

اور لگتا ہے کبھی ہے:
وہ بے سدھ، اندھی بھری
باردانا کی بوری
گویا ہے مجھ سے
''راہ گیر! بتک پاس آؤ
میرا سُونا پن آ کر مٹاؤ
میرے پاس بیٹھ جاؤ
دو گھڑی میرا دکھڑا بٹاؤ۔''

سوچتا ہوں ہوگیا کیا اس میں
ناج، بے بسی سرخ مرچیں؟
برادا یا ڑھ لکڑی کا،
بھُوسا، کھلی یا دلدّر
کسی پاس کے ہی گھر کا۔
تب، مجھ سے کہتا ہے
میرا ہی خیال،
خیریت چاہتے ہو؟
تو لو اپنی راہ۔

روز کے کھر چنے سے تنگ آ کر
ایک دن پوچھیئے
ایک گندی سڑیلی
گاڑ سے دھبے لگی
چار پائی پے سونے کی
بند منہ کی چدریا کو
کھول کر میں نے جھانکا
اُس اندھے کنوئیں میں:
گُرمُڑی مارے

جیسے رحمِ مادر میں ہو
مچی آنکھیں اور ہونٹ
پیوستہ یک بہ دگر۔
اُس نے پوچھا
بِاَیِّ
ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ؟
(جرم کیا تھا میرا
جس پہ ماری گئی میں؟)
ہوگی وہ ابھی
پانچ، چھے
سات اک سال کی۔
گُم سُم تھا میں
دل میرا گنگ تھا
پھیپھڑے دم بخود
کہ دِگر بار، اب کے
بند آنکھوں نے پوچھا
بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ؟

گو میرے ہونٹ چپکے رہے
ایک سے ایک پر
ڈوبتے میرے دل نے کہا:
اے کسی کی کلی
جس نے مسلا تجھے
اس کی نظروں میں
ایک عورت تھی تو بھی،
پوری عورت،
اور یہی ایک
مصرف تھا تیرا۔

ندا فاضلی کی پہلی برسی پر

ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

اگرچہ وقت بڑا حسبِ حال بھی گزرا
گزر کے اس کو مگر ایک سال بھی گزرا

بس ایک دَور بہ نامِ جدیدیت بھی کٹا
پھر اس کے بعد تو شبِ خون کال بھی گزرا

زمینِ حاتم ، میر وؔلی سراج و ولی
کبھی کبیر کا اس کو خیال بھی گزرا

یہ اور بات ہے دنیا تھی اس کے قدموں میں
یہ اور بات ہے جینا محال بھی گزرا

رہی جمال پسندی کمال کی اس کی
وہ خود پسند بہ حیل و حوال بھی گزرا

اُسے نہ گھیر سکے حادثات رستوں میں
وہ بچ بچا کے مگر بال بال بھی گزرا

وہ شہرتوں کا طلب گار بھی رہا لیکن
وہ بے نیاز عروج و زوال بھی گزرا

بڑے مزے سے تو دیوار و در کے بیچ کٹی
وہ لاجواب کبھی بے سوال بھی گزرا

اُسے خیال رہا خاندان کا اپنے
وہ بے خیال نہ ہو یہ خیال بھی گزرا

اڑان بھرتا رہا مایا جال کے اندر
پرندہ لے کے شکاری کا جال بھی گزرا

بساطِ عشق کا شاطر کمال کا ماہر
دیارِ حسن سے آشفتہ حال بھی گزرا

یہ قلم و علم کی دنیا پھسلتی رہتی ہے
وہ فتح کر لے گا یہ احتمال بھی گزرا

وہ جانتا تھا کہ اَن ہونیاں ہی ہونی ہیں
کبھی اداس کبھی تو بحال بھی گزرا

وہ اپنا مال لٹاتا تھا دونوں ہاتھوں سے
جو مالِ غیر پہ ٹپکاتا رال بھی گزرا

وہ چھیڑ چھیڑ کے کیا کیا مزے بھی لیتا تھا
خلافِ طبع بہ صد اشتعال بھی گزرا

کبھی وہ مؔیر کا قائل کبھی وہ میؔرا کا
یہ ہم پہ سانحۂ ارتحال بھی گزرا

بڑا بھروسا اُسے اپنے فکر و فن پہ رہا
ہر آئینے سے لیے خدوخال بھی گزرا

وہ کھول کھول کے بتلا دیا بھی کرتا تھا
جو درمیانِ فراق و وصال بھی گزرا

کبھی غزل کبھی دوہے کبھی تو نظمیں گیت
وہ یوں سناتا ہوا عرضِ حال بھی گزرا

میں سن رہا تھا بغور ایک ایک بات اس کی
ہر ایک لمحہ صدی سا وشال بھی گزرا

گوالیار کی مٹی کہاں کہاں پہنچی
وہ اپنی خاک ہمیشہ سنبھال بھی گزرا

بڑے بڑوں سے رہیں اس کی بھی ملاقاتیں
وہ نسلِ نو کے لیے اک مثال بھی گزرا

وہ ''مور ناچ'' کا رسیا سُروں کا دیوانہ
وہ راگ رنگ سے لے کر گلال بھی گزرا

وہ کہہ رہا تھا کہ اے شہر میرے ساتھ تو چل
کہیں سناتے ہوئے حال چال بھی گزرا

رہا نہ واسطہ آنکھ اور خواب کے مابین
وہ پار لفظوں کے پُل سے نڈھال بھی گزرا

ہزار ڈھونڈا کہ ''کھویا ہوا سا کچھ'' تو ملے
بڑا ملال ہے وہ بے ملال بھی گزرا

لگا رہا تھا وہ اک جست ''زندگی کی طرف''
مگر وہ موت کی لے کر اچھال بھی گزرا

سمٹ کے آئے ہیں ''گاؤں میں شہر'' ''شہر میں گاؤں''
کہ اس پہ بار یہی انتقال بھی گزرا

بڑے خلوص سے دیتا تھا گیان دھیان اپنا
لٹا لٹا کے وہ مال و منال بھی گزرا

ندؔا تو خیؔر ندا تھا وہ چپ ہوا کیسے
سنا رہا تھا جو کچھ خال خال بھی گزرا

رؤف خیؔر ذرا بھی یقیں نہیں آتا
ندؔا کو گزرے ہوئے ایک سال بھی گزرا

داستانِ حسرت

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

میرا حالِ دل نہ پوچھو کہ سناؤں کیسے ہمدم
نہ گلے انہیں لگاتے نہ ہی دل فگار ہوتا

انہیں جب سے ہم نے جانا تو یہی خیال آیا
نہ گزرتے ہم وہاں سے نہ ہی انتظار ہوتا

یہ ہے داستانِ حسرت میں سناؤں کیسے اُن کو
یہ زباں بھی ساتھ دیتی جو نہ بیقرار ہوتا

میں بتاؤں ہجر کیا ہے کہ وہ غم کی اک فضا ہے
یہ فضا مہک ہی جاتی جو وصالِ یار ہوتا

وہ جو نقش دلنشیں ہے وہ خیال بھی حسیں ہے
نہ جھلک ہمیں دکھاتے نہ خیالِ یار ہوتا

وہ تو وعدہ کر چلے تھے کہ رہیں گے ساتھ مل کر
یونہی چھوڑ کر نہ جاتے اگر دل میں پیار ہوتا

وہ فسانۂ محبت جو ہمیں سنا رہے تھے
تکمیل گر وہ کرتے تو یہ دل نثار ہوتا

نہ گلہ کوئی ہے ان سے، نہ ہمیں کوئی شکایت
گر وعدہ وہ نبھاتے ، تو وصالِ یار ہوتا

وہ حسابِ یومِ محشر یہ عمل ریاضؔ اپنا
جو نہ دل کی راہ چلتے، وہ جہاں بھی پار ہوتا

○

''رنجیدہ ہوں میں''

(دوست کے نافرمانبردار بیٹے سے متاثر ہوکر)

یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

اے میرے نورِ نظر، لختِ جگر
بے رُخی سے تری
لہولہو ہے قلب وجگر
تو کہ
منکر ہے ابھی تک شفقتِ پدر
ماں کی ممتا کی بھی نہیں تمکو کوئی قدر
اُن کی پیری کا نہیں تمکو خیال
ماں کی علالت کا نہیں، رنج وملال
کیسے کھُلیں گے تجھ پہ جنت کے در، اے میرے نورِ نظر
جب جب آتا ہے مجھے
تیرے فردا کا خیال
کانپ اٹھتی ہوں، لرز جاتی ہوں میں
میں نے تو چاہا کہ تُو
محفوظ رہے زمانے کے گرم وسرد سے
مگر
تُو نے جو بویا ہے، تو کاٹے گا وہی
ہوتا ہے ہر عمل کا ردِّ عمل
ببول کے پیڑ نہیں دیتے شیریں ثمر
اے میرے نورِ نظر، لختِ جگر

○

میں نے اپنالباس برہنگی کو بخش دیا

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

امسال
زمستاں کا استقبال کرتے ہوئے
گرمجوشی میرے لہو کی شاخ سے جھڑ گئی
برف
میری رگوں میں راستہ بناتی ہے
مرے حصے کے گرم ہاتھ
کسی دُور افتادہ سرزمین پر
میرے حصے کا سوت کات رہے ہیں
اور میں اپنے ٹھٹھرتے ہاتھوں سے
آسمان کا بوسیدہ پیرہن سی رہا ہوں!
میرے ہاتھ سرد ہیں
اجنبی مردوں کے پہلو گرم کرنے والی
عورتوں کے لہجوں سے بھی زیادہ سرد
زمین کے شمال کناروں پر صدیوں سے جمی
برف سے بھی زیادہ سرد
سو میں نے اُس اجنبی عورت کے لیے
عریاں ہونے سے پہلے
کسی اور کے گرم خواب میں پناہ لے لی
(خواب جو بچپن سے میرا پیچھا کر رہا ہے)
عارضی رفاقت
مجھے مزید سنا کر گئی!
میرا درد
وہ عورت سمجھتی ہے
جو اپنے وفادار شوہر کے بازو پر سر رکھے
کسی اور پہلو کا خواب دیکھتی ہے
یہی سوچ کر میں نے اپنا بدن
اُس اجنبی عورت کے پہلو سے سمیٹ لیا
میں نے اپنا لباس برہنگی کو بخش دیا
اور اپنے نا آسودہ جسم پر
فراق کی راکھ مل لی

کاش

روپا صبا (چندی گڑھ، بھارت)

سر پھری گلیوں
سے اٹھتا
وحشتوں کا دھواں
کاش سُن سکتا
چاہتوں کی زباں
چاہتیں پھولوں سی
چاہتیں کلیوں سی
چاہتیں خوشبو سی
چاہتیں جگنو سی
چاہتیں متوالی
چاہتیں دیوانی
بے خبر بہتی ہوئی
جھیلیں مستانی
بہتی دُور تلک
سرحدوں سے بے خبر
چاندنی اوڑھے ہوئے
راگنی چھیڑے ہوئے
بانسری کی تان کوئی
اُجلی اذان کوئی
جس کی دھڑکن میں ہے
جس کی تھرکن میں ہے
غیر کا درد تمام
جس کی سسکن میں ہے
سر پھری گلیوں سے اٹھتا
وحشتوں کا دھواں
کاش سن سکتا
وحشتوں کی زباں

درد کی گود میں کہی نظمیں

(۱۲۔جنوری۲۰۱۶ءاور۱۲۔فروری۲۰۱۶ءکے دوران کہی گئیں جب Sciatica کے شدید درد سے جوجھ رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ درد کی شدت کم ہوتی گئی)

وشال کھُلر (لدھیانہ، بھارت)

(۱)

''بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے''

یقین وگماں کے درمیاں
موت اور زندگی کے درمیاں
لٹکا ہوا ہے شخص جو
شعر پڑھ رہا ہے یا
لکھ رہا ہے دعا کوئی

(۲)

''موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی''

روح اور جسم کے
رشتے کو سمجھنے میں
جب رات گزرتی ہے
درد کے صحرا میں
روزن کھلنے پر
اک آنچ سی اٹھتی ہے
آواز کوئی مدھم
دور سے آتی ہے

(۳)

''آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی''

درد میں
موت کا
خیال آتا ہے
لیکن یوں
مغفرت
نصیب نہیں
فصیل اک
درمیاں
تنی ہے ابھی

(۴)

''کوئی تدبیر بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی''

سب دوائیں کام آ گئیں
اب دعاؤں میں
تلاش جاری ہے
کچھ اثر ان میں یا الٰہی اب!
فرش سے عرش تک
نالے بندھتے ہیں

(۵)

''گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے''

درد میں آرام کہاں ہے مجھ کو
دھیان میرا لگا ہے کہیں اور کی اور
دھند جو مجھ کو اماں دیتی تھی
تنہا راہوں پہ مجھے
ڈھونڈ رہی ہو گی کہیں
منتظر ہوں میں
ان گھنی راہوں کا

فقط جہاں دل کی وادی کے لیے
چاند کھِلا کرتا تھا

(۶)

''اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''

کب کوئی راہ نظر آئے گی
کب کوئی راہ نظر آتی ہے
گل تو کھلتے ہی ہیں مرجھانے کو
ٹِکٹکی باندھ کے بیٹھا ہوں
شاید تو کوئی
چاند نظر آئے کہیں

(۷)

بجھ چکا ہوں چراغ ہوں پھر بھی
پاس میرے تو اے ہوا رہنا

پھر امیدوں کے دیئے کچھ
ٹمٹمانے لگ گئے
آس کی پہلی کرن میں
چہچہاتے پنچھیوں نے
پھر بھری اونچی اڑان
خواب تھے جو درمیاں
اب ہر پرواز
خاک میں لیکن ابھی بھی
گمشدہ ہیں دائرے

(۸)

''اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا''

اگنی اگنی
گنگا جل سے
وار کے تارا
چھوڑ دیا ہے
کون دشا میں
چنچل من کی
گاگر بھر کر
خالی خالی
نوک بدن پر
تھالی، گڑوی
پران سدھا میں
رس برسا ہے
ادھ چھلکا ہے
ادھ برسا ہے
اور آدھا اب بھی
باقی ہے

(۹)

''غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''

جلتے بجھتے ہوئے دن رات
زمین وآسماں کی حدیں
دھڑکتے دل کی آرزو لیے
چراغ چراغ ہو گئے
دھواں دھواں صداقتیں
ہوا ہوا مصیبتیں
خلا میں رنگ رکھ دیئے
گھٹا، بہار، آگہی
سب اداسیاں کہیں
سخت سخت فلسفوں میں
دب کے رہ گئی ہنسی
زندگی ہے موت کی پناہ میں

○

نشاطِ غم

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

شعر وسخن سے شغف رکھنے اور تخلیقی ہنرمندی کا اظہار کرنے کا فطری جذبہ ہر صاحب ذوق کی دسترس میں ہوتا ہے، مگر شعری بنت کاری اور نوبہ نو موضوعات کی جستجو صرف باکمال شعرا کا نشان امتیاز تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی فکر رسا اور مشق و ممارست سے کام لے کر نئے جہان آباد کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں آوازوں کے ریلے اور لہجوں کی کھنک اپنی جگہ، لیکن فکر تازہ کے معجزے کم کم ظاہر ہوتے ہیں، خصوصاً صنف غزل میں تکرار معنوی اور اسلوب کی بازگشت عمومی رویہ ہے۔ ہمارے عہد کا قاری اس عمومی رویے پر نظر رکھتے ہوئے بعض اوقات انقباضی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے پڑھنے کے لیے نئی غزل دستیاب نہیں ہوتی، روٹھے ہوئے قاری کو وہی منا سکتا ہے جو روایت سے ہٹ کر غزل میں نئے امکانات پیدا کرنے کا بیڑا اٹھائے گا، بلاشبہ یہ کارِ دشوار اشرف جاوید نے بڑی حد تک آسان کر دیا ہے اور قاری کو پڑھنے کے لیے تازہ اور نئی غزل دی ہے۔ غزل پر نیم وحشی صنف سخن کا الزام رد کرنے میں ہمارے شعرا بامراد رہے۔ غزل آج بھی محبوب ہے، لیکن اس کی مثال ایسے خوش رنگ گلدستے کی ہے، جس میں خوشبو تو ہے، لیکن مشام جاں کو معطر کرنے کا عمل وہ نہیں جو پہلے تھا، مگر ایسا بھی نہیں، کسی نہ کسی طرف سے تازہ ہوا کا جھونکا یا فکر و خیال کا غنچہ نورس نشاط روح کا سبب بنتا ہے۔ اس مختصر تمہیدی گفتگو کا مقصود ہمارے عہد کے باشرف غزل نگار اشرف جاوید کی تخلیقی ثروت مندی کا مظہر ''نشاطِ غم'' شعری مجموعہ ہے، جسے پڑھتے ہوئے یہ اعتبار آیا کہ غزل کی شجر کاری اور بہار بے خزاں کا مشاہدہ نئے آفاق کی گرہ کشائی کا شاخسانہ ہے۔

اشرف جاوید نے دشتِ غزل کی بادیہ پیمائی میں اپنی عمر عزیز کے صبح و شام صرف کیے، جہاں انھوں نے آتشِ غم میں طناب خیمۂ دل کو سلگتے پایا۔ تحمل اور سکون کے ساتھ ہر منظر پر نظر رکھی۔ جینے کا سلیقہ اور قدم آگے بڑھانے کی عزیمت نے کامیابی اور ناکامی نیز تنہائی میں غور و فکر کرنے کی عادت ڈال دی۔ خامۂ مژگاں سے شعر کی نوک پلک سنوارنے اور حرف و معانی میں جمالیاتی رنگ و آہنگ کا لحاظ رکھنے کا عمل ذوق سلیم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اشرف جاوید جہاں دیدہ بیدار سے کام لیتے ہیں، وہاں ان کی ذوقی تربیت رہنما بن جاتی ہے اور یوں شعری بنت کاری اور ان کا فن مسلسل ارتقائی منزل سر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ابتدا سے موضوعات کے انتخاب میں نکتہ آفرینی اور لفظی پیکر تراشی کا حسین امتزاج پیش نظر رکھتے رہے۔ اس تخلیقی سفر میں ''نشاطِ غم'' ان کا وہ پڑاؤ ہے، جہاں سے انھیں اپنی منزل اس موڑ سے آگے دکھائی دے رہی ہے۔ انھوں نے اس مرحلے میں روایتی موضوعات کو پرکھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ غزل میں سطحی اظہار کو دیکھا تو اس روش سے منہ موڑ لیا، روایتی موضوعات کی بھرمار سے دل بھر گیا، اور جب اسلوب کی ہم رنگی سے آنکھوں میں چبھن سی محسوس ہوئی تو اپنے لیے نیا اسلوب تراشنے کی سوجھی۔ اپنا اسلوب متعارف کرنے کی ٹھانی، مگر غزل میں ہیئت کی تبدیلی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، مگر اشرف جاوید نے یہ کام احساس، جذبے، قوافی، ردائف اور اظہار کی سطح پر کیا ہے اور اپنی اس انفرادیت کو بحال رکھنے میں اشرف جاوید کامیاب ہیں۔ ان سے پہلے یہ التزام بہت کم شاعروں کے ہاں برتا گیا۔

''نشاطِ غم'' ایک ایسا عنوان ہے جو زندگی میں اثباتِ عمل کا بلیغ استعارہ کہلائے گا۔ غالب کے بہ قول گرمی نشاطِ تصور میں زندہ رہنے کے امکانات موجود ہیں اسی طرح ''نشاطِ غم'' کی خوبصورت ترکیب غم زندگی سے مستعار لی گئی ہے، نغمہ ہائے غم کو غنیمت جاننا غالب نے بتایا، نشاطِ غم میں زندگی کرنے اور حظ اُٹھانے کی بات اشرف جاوید کر رہے ہیں۔ اُن کی غزل میں غالب اور میر کو یاد رکھنے کا عمل قاری کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اپنے ذوق مطالعہ کی تشہیر نہیں چاہتے، بل کہ ان بڑے غزل گو شعرا سے استفادہ کیے ہوئے ہیں:

غزل طراز بدن ہے، غزل بھی غالب کی
دلیل میر کا دیوان اٹھا کے دیکھتے ہیں

عہد موجود میں تمام تر سائنسی انکشفات کے بعد خود انسان اپنی ذات کی کما حقہ، معرفت حاصل نہیں کر پایا، یہی نہیں، بل کہ ہم تخلیقی انداز نظر سے بیگانہ وار زندگی بسر کرنے کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں، معاشرہ اور فرد ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ اشرف جاوید اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ ہم نے صحت مند رویہ اپنانے میں کوتاہی برتی ہم اپنے ناقد نہ بن سکے۔

انگلیاں دوسروں پہ اُٹھتی ہیں اپنا کردار کون دیکھتا ہے

شاعری اور ادب میں قاری کی دلچسپی اسی صورت میں برقرار رہتی ہے کہ وہ اپنی ان کہی بات کا عکس جمیل لفظ و معانی کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں اسے یہ معجزہ فن دکھائی دے اور اس کے جذبات کی ترجمانی کا اہتمام کیا گیا ہو، وہاں وہ پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ اشرف جاوید کی غزل میں یہ وصف خاص بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہاں قاری موضوعات کی رنگارنگی میں ڈوب کر اپنے جذبوں کا سراغ پا جاتا ہے، یوں بھی شاعری میں پاکیزہ جذبوں کا اظہار بنیادی اہمیت رکھتا ہے، غزل میں بہت سے نئے موضوعات راہ پا چکے ہیں، لیکن محبت ایسا آفاقی اور فطری جذبہ ہے، جس کی کارفرمائی اور فرماں روائی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ اسی جذبے کی بدولت نظام کائنات قائم ہے، باہمی روابط میں یہی جذبہ محبت سر فہرست نظر آتا ہے۔ شاعری میں اس کا اظہار جذب دروں کے بغیر ممکن نہیں، فنون لطیفہ کا ارتقا اسی جذبۂ محبت کا مرہون منت ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جنھیں اشرف جاوید نے لبادہ شعر میں نذر قارئین کیا۔ وہ تخلیقی ثروت مندی اور پیرایہ اظہار کی فکری سطح کے اعتبار سے قاری کو یقین دلاتے ہیں کہ

جمالِ لمحہ تخلیقِ فن بھی کیا شے ہے
رگِ غزل میں لہو دوڑتا دکھا دیا

اسے لحہ جاں گداز بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاعر کی آنکھ پہروں نم رہتی ہے، تب کہیں ایک مصرعِ تر کی صورت دکھائی دیتی ہے، اسی آزمائش کی ساعت میں اسے گمان گزرتا ہے کہ اس کے باطن میں سورج طلوع ہوا چاہتا ہے۔ وہ سرخوشی میں خود کلامی کرتا ہے اور صفحۂ قرطاس پر غزل کا مطلع جلوہ نما ہوتا ہے۔

اشرف جاوید نے غزل کی روایت کا احترام پیشِ نظر رکھا ہے، لیکن وہ تکرار یا جمود کو تسلیم نہیں کرتے۔ انھیں غزل میں ہیئت کے تجربوں سے اتنا ہی واسطہ پڑا کہ وہ ردائف میں واحد متکلم کا صیغہ برتنے میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی امثال وہ غزلیں ہیں، جو معنوی اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں، جیسے

وہ مجھ کو دیکھ کے بنتا سنورتا رہتا ہے
جمالِ یار کی خاطر اک آئنہ ہوا ہوں
مری تباہی میں غیروں کا ہاتھ ہے، لیکن
کمال یہ ہے کہ دشمن سے بھی ملا ہوا ہوں
کہیں پہ ظلمتِ شب کا سفر تمام بھی ہو
ازل سے جانبِ صبحِ ازل چلا ہوا ہوں
تری تلاش میں صدیاں گزر گئیں، لیکن
نہ تو ملا ہے، نہ میں خود سے آشنا ہوا ہوں
جو شہرِ فیض و ندیم و منیر سے تھا نہال
خوشا نصیب ! وہاں میں غزل سرا ہوا ہوں

کوئی لایا نہ کسی کا ہوں بلایا ہوا میں
چھوڑ کر تختِ فلک خاک پہ آیا ہوا میں
شاید آجائے ترے لمسِ کفِ پا سے بہار
کوئی صحرا ترے رستے میں بچھایا ہوا میں
ہویدا ہونے لگی روشنی کہاں مجھ میں
یہ کون دینے لگا صبح کی اذان مجھ میں
اُڑوں تو اپنے پروں کی تپش سے جل جاؤں
بھڑک رہی ہے رگِ آتش رواں مجھ میں
جس گلی میں عمر گزری دوستوں میں کھیلتے
اُس گلی جاتے جاتے اب تو ڈر جاتا ہوں میں
چاند کے ہمراہ پھرتے اک زمانہ ہو گیا
وہ کدھر جاتا ہے جانے اور کدھر جاتا ہوں میں

غزل کی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ کیا گیا، مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ وہ آج بھی اسی بنیاد پر قائم ہے، البتہ طویل اور مختصر بحروں میں قوافی اور ردائف نے قاری کو چونکایا ہے کہ شاعر الفاظ یا تراکیب میں کلاسکی اندازِ اظہار سے قدرے مختلف رویہ اپنانے کا رجحان رکھتے ہیں، اشرف جاوید جہاں ایک طرف روایت کو عزیز رکھتے ہیں، وہاں وہ جدت پسندی کے حق میں ہیں، اجتہاد کے بغیر تخلیق میں تازگی سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں، وہ معانی کی ترسیل میں ابہام سے دامن بچا کر تازہ کاری سے غزل کا پیرہن خوب صورت تراکیب سے جاذبِ نظر بنانے کا فن آزماتے ہیں۔

شاخِ امکاں پہ کھلا کوئی ستارہ ،کوئی خواب
پھر ہوا سمت نما کوئی ستارہ ،کوئی خواب
رنگ آرا ہے ہر اک نقشِ کفِ پا اس کا
جس طرح کوئی دیا، کوئی ستارہ ،کوئی خواب

کنارے ساتھ تو چلتے ہیں مل نہیں پاتے
ہمارے بیچ بھی دریا لکیر کھینچتا ہے
یہ خط کشیدہ عبارت ،یہ حاشیوں کی سطور
پھر ان پہ تیرا حوالا لکیر کھینچتا ہے

چڑھے ہیں تیر کماں در کماں، گرا کہ گرا
پرندہ اڑتے ہوئے بے اماں، گرا کہ گرا
میں اس نظر سے گرا ہوں تو ایسا لگتا ہے
مری نظر سے یہ سارا جہاں گرا کہ گرا

کرو تکلف بے جا نہ ہچکچاؤ میاں
رہو خوشی سے، یہاں روز آؤ جاؤ میاں
کہاں سے آئے ہو، جانا کہاں ہے، کون ہو تم!
سناؤ حالِ دلِ زار ،کچھ بتاؤں میاں

اشرف جاوید غزل کی نزاکتوں کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ غزل کی مثال کسی سرمہ سا چشمِ غزال اور اس میں بھری نشیلی نمناک حیرت کا عکس جمال ہے ، جسے وہی دیکھ سکتا ہے، جسے دیدہ بینا اور دلِ شکستہ جیسی نعمت سے نوازا گیا، جس پر ''نشاطِ غم'' کے معانی کھلے ہوں یا جس کے پہلو میں جمالِ یار کا الاؤ روشن ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی شاعر، کوئی فنکار یا تخلیق کار تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کلاسیکی اور ہمعصر فنکاروں سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہتا ہے، الگ رہ کر وہ اپنی اہمیت کا تعین نہیں کرسکتا، اسے گزشتہ اور موجودہ شاعروں اور فن کاروں کے درمیان خود اپنا مقام پرکھنا یا تقابل کرنا ہوگا، اس حوالے سے اشرف جاوید کی شاعری کا غالب مضمون محبت ہے، مگر یہ محبت وسیع تر معنوں میں ان کی غزل میں درآئی ہے اور غزل اپنی ساخت کے اعتبار سے ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ کا فن ہے، اس میں کسی طرح کوئی تفصیل پیش کرنے کی گنجایش نہیں، اس لیے قاری کا یہ خوش گوار فریضہ ہے کہ وہ غزل کی معنویت کو دل میں جگہ دیتے ہوئے اپنے تجربے

اورمشاہدہ کی روشنی میں تفہیم کی راہ ہموار کرنا سیکھے۔اشرف جاوید کی غزل میں ہر شعر میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ان کی لفظیات میں جہان معانی کے آفاق چشم بصیرت دیکھتی ہے اور نہاں خانہ دل میں رنگ ونکہت کا ہمہ جہت آئینہ قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔انھوں نے جو تراکیب اپنی غزل کے اشعار میں برتیں وہ بہ جائے خود تخلیقی ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سوادِ شب کو نشاطِ سحر بناتے ہوئے
اندھیرا ہانپ رہا تھا دیا جلاتے ہوئے
الاؤ تیز ہوا، آتشیں ہوا چوپال
مگر وہ بجھتا گیا داستاں سناتے ہوئے
بنا رہا ہے سرِ چاک کوزہ گر کیا کیا
سفالِ نم کو کمالِ ہنر دکھاتے ہوئے
اس اجنبی کی نگاہوں میں راستے گم تھے
میں راہ بھول گیا راستہ بتاتے ہوئے

رقص کرتا نظر آتا ہے سرِ دشتِ حیات
یہ بگولا کوئی طوفان بھی ہو سکتا ہے

اترتا جاتا ہے سیلِ خمارِ دردِ فراق
تھکن قریب ہے دل کو سلا کے دیکھتے ہیں
وہ بیٹھ جاتا ہے آکے قرینِ چشمِ خیال
دل و نگاہ پہ پردہ گرا کے دیکھتے ہیں

اشرف جاوید کے ہاں اپنے گردوپیش کی زندگی اور زوال پذیر صورتِ احوال کا شعور غزل کے فنی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے آمادہ اظہار نظر آتا ہے۔وہ اس معاشرے کی زبوں حالی اور سیاسی کشاکش کا ادراک رکھتے ہیں،مگر وہ بلا واسطہ کسی سیاسی کردار کو اپنانا یا اصلاح معاشرہ کی خاطر کسی تحریک کا حصہ بننا پسند نہیں کرتے،بل کہ وہ ایک شاعر کی طرح اپنی رائے اور اپنی شعری صداقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔وہ صرف اخلاص نیت کے پیش نظر امید افزا بات کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ہمارے ماضی کے شعرانے بھی یہ کردار ادا کیا،انھوں نے نظم وغزل کو اظہار کا وسیلہ قرار دے کر اپنے عہد کی تصویر آفرینی کا حق ادا کیا، اشرف جاوید کی غزل بھی ایک باشعور فرد کا ''عرض حال'' ہے۔

مہر مکالمات سے پگھلے گی برف بھی
موسم کہاں بدلتا ہے جنگ و جدال سے

تمام عمر پھرا ہے وضاحتیں کرتا
اسے بھی کچھ نہ ملا خاک میں ملا کے مجھے

پہلے بھی ترے جیسے فراعین بہت تھے
اب ان کا زمانے میں کہیں نام ونشاں ہے؟

شب کے آثار کون دیکھتا ہے!
دن کے اس پار کون دیکھتا ہے!

''نشاطِ غم''غزل کی نئی تزئین کا بلیغ استعارہ ہے۔غم کی وسعتوں میں ہماری کائنات ایک نقطہ روشن کی مثال ہے۔یہ غم عالمِ انسانیت کا مقدر قرار پایا ہے،جس میں عرفانِ ذات سے بڑھ کر عرفانِ من وتو کی کارفرمائی پائی جاتی ہے، تکمیل ذات کا مژدہ جاں فزا اس وقت سنایا جاتا ہے،جب غم کی اساس پر عہدوفا کو پورا کیا جاتا ہے جس کا عملی نمونہ کرب وبلا میں بے مثال فداکاری اور سجدہ شکر بجا لانا ہے،امام عالی مقام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قاری پر نشاطِ غم کے معانی اشرف جاوید نے اس طرح کھولے کہ غم جاوداں کی ضوفشانی سے دل ونظر پر بارش انوار ہونے لگتی ہے۔

فراتِ چشمِ زماں میں رواں دواں ترا غم
وہاں وہاں ترا ماتم،جہاں جہاں ترا غم
ترے خیال سے آباد ہیں دل و دیدہ
نہ رائیگاں مرا گریہ،نہ رائیگاں ترا غم
ہر آنے والا زمانہ ترا زمانہ ہے
تری طرح ہوا جاتا ہے جاوداں ترا غم
ترے علم سے لہو آج بھی ٹپکتا ہے
چمک رہا ہے سرِ چوبِ دشتِ جاں ترا غم

زندگی میں غم ایک مستقل قدر ہے۔علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کو ہمارے گوش گزار کرتے ہوئے کہا تھا

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

نشاطِ غم سے بے بہرہ آدمی زندگی بھر سطحی انداز نظر کا ہدف اور راہ سے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح حواس باختہ تہمتِ زندگی اپنے سر لیے منزل سے بے خبر موت کے قدموں کی آہٹیں سنتا ہے۔اشرف جاوید نے ایک دیدہ ور کی طرح تخلیقی طرز فکر کی بنیاد پر اپنی غزل کا تہذیبی اور تعمیری مرقع پیش کیا ہے۔اس مختصر جائزے میں بہت سی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں،پھر بھی یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے فنی،فکری اور جذباتی سطح پر جو اجتہاد کیا ہے،اُسی کے نتیجے میں نئی غزل تخلیق ہوئی ہے۔اُن کا طرزِ اسلوب اور اظہار کا قرینہ ادب کے قاری کے لیے رہنما بنے گا اور اشرف جاوید کی خود اعتمادی کو سند اعتبار ملے گی،ان کا یہی دعویٰ بہت ہے کہ

رکھ دیا ہے سرِ محرابِ غزل ایک چراغ
سہمی جاتی ہے ہوا دیکھ کے تیور میرے

پنجابی زبان اور اردو کا سوال

ڈاکٹر خالد اشرف

(دہلی، بھارت)

ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا تو بہت سے مسائل حل ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے۔ مسلم لیگ کی قیادت میں اور ہندومہا سبھا اور اشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے مسلم دشمن پروگراموں کے ردعمل کے طور پر مشرق اور مغرب میں ایک ہزار میل کے فاصلے سے دو حصوں پر مشتمل پاکستان وجود میں آیا۔ پانچ قوموں پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور بنگالیوں پر مشتمل اس دیس میں مہاجرین نے اہم مقامات حاصل کیے جن میں سے اکثریت کی مادری زبان اردو تھی۔ ملک کی لیڈر شپ بھی ابتدا میں مہاجرین رہنماؤں قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں وغیرہ کے ہاتھوں میں رہی۔ چونکہ اردو کی جڑیں پاکستان کے بہت سے علاقوں خصوصاً پنجاب میں قبل ہمارے مضبوط تھیں، کراچی اور حیدرآباد (سندھ) وغیرہ کے مہاجرین نے اردو کو حکومت اور قوم کے رابطے کی زبان بنایا۔ یہی صورتِ حال آج تقریباً ستر سال بعد بھی جاری ہے یعنی اردو آج بھی پاکستان کے تمام صوبوں میں رابطے کی زبان Link Language کا درجہ رکھتی ہے اور وہاں کے دفتروں وعدالتوں میں نچلی سطح پر سارا کام اردو ہی میں ہوتا ہے۔

ایک عجیب صورت حال ہے کہ پاکستان کی رابطے کی زبان وہاں کے کسی خطے کی زبان نہیں ہے یعنی ایک درآمد شدہ زبان ہے جس کو عہدِ وسطیٰ سے پنجابیوں نے اپنایا اور تقسیم کے بعد مہاجرین نے فروغ دیا۔ لیکن بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جب پاکستان میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہاں کی سیاست، معیشت اور ثقافت سے متعلق چند تلخ سوالات اٹھنے شروع ہوئے اور حمود الرحمان کمیشن کی خفیہ رپوٹ کے حصے عوام تک پہنچنے لگے تو بالخصوص پنجاب اور سندھ کے ادیبوں اور دانش وروں نے اردو کی مرکزیت اور مقامی زبانوں کی عدم ترقی کے بارے میں سوالات اٹھانے شروع کیے۔ بالخصوص پنجاب میں پیپلز پارٹی سے وابستہ مصنف، شاعر اور دانش ور فخر زمان وغیرہ نے یہ تجزیہ کیا کہ تقسیم کے زمانے میں سیاسی و معاشی محرکات اس قدر اہم تھے کہ لسانی اور معاشی مسائل کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا موقع کم ہی ملا۔ پھر کچھ دقیانوسی قسم کے مورخین ومفکرین نے پاکستانی کلچر کے رشتے برصغیر ہندو پاکستان کے بجائے عرب کی سرزمین سے جوڑنے شروع کر دیئے اور زبان وثقافت کی مقامی جڑوں Grassroots کے سوال کو دائرہ بحث سے خارج میں رکھا گیا۔

ان حالات کے ردعمل کے طور پر پنجابی زبان کے ادیبوں اور دانش وروں نے جن میں فخر زمان سرِفہرست تھے، اپریل ۱۹۸۲ء میں ''عالمی پنجابی کانفرنس'' کے نام سے پنجابی زبان کے ادیبوں، دانش وروں، شاعروں، صحافیوں، معلموں اور ہمدردوں کی تنظیم قائم کی جس کے نظریاتی رشتے روشن خیالی، ترقی پسندی اور عالمی بھائی چارے سے ملتے ہیں۔ اس تنظیم W.P.C کے اعلان لاہور میں کیا گیا تھا کہ پنجابی ادب کا مقصد انسان دوستی کا اصول ہے۔ اس کی راویت کا ایک سرا بابا فرید سے چل کر موجودہ زمانے تک پہنچتا ہے اور دوسری طرف دنیا بھر کے ترقی پسند ادب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ نتیجتاً یہ ادب سیکولر ہے۔ اعلان نامے میں مزید کہا گیا تھا کہ:

''ہم اعلان کرتے ہیں کہ ساری دنیا کی آزادی، جس میں تخلیقی آزادی بھی شامل ہے، پنجابی ادب کی اساس ہے۔ ہم اظہار کی آزادی کی راہ میں سنسر، پولیس اور ایسے کالے قوانین کی مذمت کرتے ہیں جو انسان کے جائز اور بنیادی اظہار میں رکاوٹ بنیں۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ اظہار کی آزادی کے ساتھ ساتھ قومی زبانوں اور ثقافتوں کی آزادی کی بھی بہت ضرورت ہے۔ ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ہر قومی زبان اور ثقافت کو برابر پھلنے پھولنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ اگر کوئی زبان اور ثقافت کم ترقی یافتہ ہے یا پھر پسماندہ ہے تو پنجابی لکھاریوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی ترقی اور فروغ کے لیے مدد کریں۔ ہم ہر اس عمل کی مذمت کرتے ہیں جو کسی دوسری زبان یا ثقافت کی آزادی کے حق کو دباتا ہو۔''

ورلڈ پنجابی کانفرنس کے اس منشور میں ادب اور ثقافت کو قومی اور بین الاقوامی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پاکستان کی تقسیم اور پنجاب کی تقسیم در تقسیم کے حوالے سے اس منشور Charter میں کہا گیا تھا کہ پنجاب کی پہلی تقسیم ۱۹۴۷ میں ہوئی دوسری ۱۹۶۰ء میں ہوئی جب مشرقی پنجاب کو ہریانہ، ہماچل اور پنجاب، تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس زمینی تقسیم کے علاوہ بھی پنجاب کی کئی تقسیمیں ہیں، جیسے امیر اور غریب کی تقسیم، ووٹ ڈالنے والوں اور ووٹ چوری کرنے والوں کی تقسیم لیکن پنجاب کی سب سے بڑی تقسیم زبان کی ہے یہاں عوامی زبان پنجابی ہے مگر سرکار اور اس کے دوسرے ادارے اردو کا نفاذ کر رہے ہیں اس کا زہر اب گاؤں تک پہنچ گیا ہے۔

پاکستان میں پنجابی زبان اور ثقافت کے فروغ میں ایک سوال اردو کے مقام کا بھی آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان عوامی سطح پر محدود ہوتی جا رہی ہے اور کچھ اداروں و اخباروں تک سمٹ آئی ہے۔ جب کہ اردو پاکستان میں اس کی بین الصوبائی اور بین العلاقائی حیثیت مضبوط ہو چکی ہے اور ہندوستان کے اردو داں اس بات پر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اردو والوں کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ پاکستان میں جمہوری فکر کا تقاضہ یہ ہے کہ وہاں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی زبانوں کو بھی فروغ حاصل ہو اور ان کی ترقی کے لیے خصوصی اقدام کیے

جائیں۔ پنجابی زبان وثقافت کے فروغ کا مطالبہ ویسے تو جنرل ایوب خاں کی فوجی آمریت کے خلاف ماہنامہ ''پنجابی ادب'' مجلس شاہ حسین اور پنجابی ادب سنگیت کے قیام کے ساتھ ۱۹۶۰ء کے قریب ہو گیا تھا مگر بالخصوص ''پنجابی مجلس'' کے اہلکاروں کا یہ شعورِ عمل اور سیاسی موقف فوجی آمروں کی نظروں میں چبھنے لگا اور مجلس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس امر کی افسوس ناک بات یہ تھی کہ پنجاب کے اعلیٰ طبقوں اور وڈیروں نے ایوب حکومت کے اس جمہوریت کش اقدام کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ کیونکہ انگریزوں کی حاشیہ بردار اشرافیہ اب اپنا قبلہ و کعبہ فوجی آمروں کی طرف موڑ چکی تھی۔

تاہم پیپلز پارٹی کے دور میں فخر زمان، احمد سلیم، امجد علی بھٹی، افضل احسن رندھاوا، بشیر نیازی، بابا نجمی، میجر اسحاق، عبدالحفیظ کاردار اور حفیظ شیخ وغیرہ نے پنجابی زبان اور ثقافت کے فروغ کا منصوبہ بنایا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ فخر زمان نے پنجابی، اردو اور ہندی میں تقریباً تیس کتابیں لکھیں جن میں فکشن بھی ہے اور شاعری، تاریخ بھی ہے اور ثقافت بھی۔ فخر زمان پنجاب پیپلز پارٹی کے صدر رہے، رکن قومی اسمبلی M.N.A بھی رہے اور اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے صدر بھی رہے لیکن ان کا بنیادی دائرہ کار ادبی وثقافتی ہے، سیاسی نہیں۔ ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے انتخاب کے ذریعہ تشکیل دی گئی جمہوری حکومت کو برطرف کر کے قومی رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا تو اس کا اثر فخر زمان پر بھی پڑا۔ پنجاب کی صوبائی حکومت نے جون ۱۹۷۸ء میں ان کی چار کتابوں کو ضبط کر لیا اور فخر زمان کو کسی ممکنہ الزام کے ضمن میں صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا تو انہوں نے حکومت کے اس آمرانہ اقدام کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ اس مقدمے کی رفتار برصغیر کی ہر عدالت کی طرح چیونٹی کی سی تھی، چنانچہ اس رٹ پٹیشن کا فیصلہ اٹھارہ برس بعد فروری ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ یہ زمانہ فخر زمان اور ان جیسے دوسرے روشن خیال اور انسان دوست ادیبوں، شاعروں، فنکاروں کے لیے گرفتاریوں، مقدموں، حملوں اور میڈیا بلیک آؤٹ کا دور تھا۔ لیکن اسی دور میں اشفاق احمد جیسے سرکاری صوفیا اور حفیظ جالندھری جیسے ''بے آثر'' قصیدہ خواں بھی تھے۔ جن کے بارے میں احمد فراز مرحوم نے کہا تھا:

خوش آ گئی ہے ضیاء کو 'جلندھری' تیری
وگرنہ شعر ترا کیا ہے شاعری کیا ہے

فخر زمان نے اپنی کتابوں پر لگائی گئی ناجائز پابندی کے خلاف دائر کردہ طویل پٹیشن میں جائز طور پر ایک مقام پر کہا تھا کہ

''درخواست گزار جس پس منظر میں اپنی عرضداشت پیش کر رہا ہے، اس تناظر کی تکمیل اور مسئول الیہ کی معروضیت کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں کارفرما اہم ثقافتی عوام کا ذکر بھی کروں۔ دانشورانہ دوعملی کا یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ پشتو، بلوچی، سندھی اور پنجابی تحریروں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ فی الحقیقت ایسے ادیبوں کو غیر محب وطن قرار دینے اور ان کی تخلیقات کو ضبط کرنے کی ایک کوشش ہے۔ باوجودیکہ یہی وہ ادیب ہیں جو اپنے ہم وطنوں سے بلاواسطہ ہمکلام ہوتے ہیں۔ آج کے پنجابی قلم کار کو مسترد کرنا کل کے بلھے شاہ کو مسترد کرنا ہے۔ آج کے سندھی شاعر کو مسترد کرنا کل کے شاہ عبداللطیف بھٹائی کو مسترد کرنا ہے۔ آج کے پشتو ادیبوں کو مسترد کرنا کل کے رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کو نظروں سے گرانا ہے۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ جامِ دُرک کی تحریروں کا رچاؤ آج کے ادیبوں کی نگارشات میں موجزن ہے؟''

اس قسم کی ٹھوس، تاریخی مقالوں اور قومی و بین الاقوامی قانون دلائل کے سامنے سرکار سایہ بختی اور سیاسی انتقام پر مبنی استغاثہ کا مقدمہ ٹک نہ سکا اور فخر زمان یہ مقدمہ جیت گئے۔ تب تک فوجی ڈکٹیٹر کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔

فخر زمان ایک زندہ مفکر و دانش ور کی طرح مارشل لا کے جبر کے خلاف سیاسی وفنی احتجاج بھی کرتے رہے۔ پیپلز پارٹی کی روشن خیال پالیسیاں بھی تشکیل دیتے رہے۔ اکادمی ادبیات کے ذریعے ماضی اور حال کے عوامی اور صوفی ادبیات کو بھی سیمینار اور کانفرنس کر کے زیر بحث لاتے رہے اور عالمی پنجابی کانفرنس کے جھنڈے تلے پنجابی زبان و ادب اور ثقافت کو پاکستان میں اس کا جائز مقام دلانے کے لیے بھی بڑے بڑے منصوبوں پر عمل پیرا رہے۔ عالمی پنجابی کانفرنس کا تاسیسی اجلاس لاہور میں اپریل ۱۹۸۶ء میں منعقد کیا گیا۔ دوسری عالمی پنجابی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۹۲ء بھی پنجابی زبان و کلچر کے مرکز لاہور میں ہی کی گئی۔ ان دنوں کچھ عرب ممالک میں مغربی سامراجیوں کی پھیلائی گئی خانہ جنگی اور بدامنی عروج پر تھی۔ اس غیر انسانی صورتحال پر اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کانفرنس کی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

''پنجابی لکھاریوں کا یہ اجتماع کیمیائی ناکہ بندی، بے گناہ عراقی عوام کے قتل عام اور ایک سپر پاور اور اس کے حواریوں کی پرزور مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں عوامی آزادی کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں کا ساتھ دینے کا اعلان کرتے ہیں اور دنیا میں فاشزم، بنیاد پرستی اور عوام دشمنی پر مبنی کالے حروف کی مذمت کرتا ہے۔''

اس کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ پاکستان میں تمام مقامی زبانوں کو ملک کی قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے اور پنجابی زبان کے پڑھائے جانے کا بندوبست چھٹی جماعت سے بارہویں جماعت تک ہر اسکول میں کیا جائے۔

اس اجتماع کے بعد دسمبر ۲۰۰۰ء میں سرحد کے دوسری طرف یعنی چنڈی گڑھ میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد کی گئی۔ پھر اپریل ۲۰۰۱ء میں لاہور میں اگلی کانفرنس کی گئی، مئی ۲۰۰۲ء میں لندن میں عالمی کانفرنس کا بین الاقوامی اجتماع ہوا۔ جنوری ۲۰۰۳ء میں دہلی میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد کی گئی جس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر ستندر سنگھ نور تھے۔ اس کے بعد سے لگاتار کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہے۔ فخر زمان اردو مخالف نہیں ہیں لیکن وہ پنجابی زبان و کلچر کی ترقی کے بھی حامی ہیں۔

''حسنِ نگارش''

(نیویارک میں مقیم برادرم مشیر طالب کا کسبِ کمال)

ہے نُطق کچھ عجب سی کشاکش کا ہمقدم
''تسلیم'' پیش کردیں یا پھر دیں ''دعائیں'' ہم؟

پیری اسیر ہیں یا شبابی نصیب ہیں؟
اتنا تو ہے عیاں کہ مجسم ادیب ہیں

ہیں کچھ بزرگ؟ یا ابھی بہ اہتمام ہیں
مانند ''تاڑ'' کے ہیں یا ''قصہ تمام'' ہیں؟

جو بھی ہیں آپ جیسے ہیں ویسا کریں قبول
عادت ہمیں بھی کچھ نہیں باتیں کریں فضول**

کیونکر ہم ایک تشنۂ تحریر رہ گئے!
یعنی بدونِ حرف! ہر قلم گیر رہ گئے

ایسا بھی کچھ نہ تھا کہ نہ فرصت ملی ہمیں
اس درمیاں نہ لکھنے کی رغبت ملی ہمیں

ذہنی کرشمہ سازیاں دامن پناہ تھیں
یا فرصتیں کچھ ایسی عدیم النباہ تھیں

کئی بار ''آج'' دستکیں دے کر نکل گیا
جو کام ''آج'' کرنا تھا وہ ''کل'' پہ ٹل گیا

ہر آج کے نصیب میں ماضی کی دھول تھی
زورِ قلم پہ ناز! ہماری یہ بھول تھی

تحریری کارزار میں خفت پذیریاں
انساں کے ساتھ ساتھ ہیں عادت اسیریاں

تازہ شمارہ شرم سے مسمار کر گیا
اور یہ مراسلہ! سرِ اظہار کر گیا

اس کم لکھے کو خوب سمجھئے گا! محترم
مجھ ناقصِ قلم کو سمجھئے گا! محترم

ملتا رہا ''چہارسوٗ'' باوصف، باکمال
ہے واشگاف آپکی محنت کا یہ رسال

محفل سجائی ہے وہاں کیا خوب آپ نے
اردو ادب کی لاج نبھائی ہے آپ نے

اس دشتِ بے گیاہ میں پرکار آپ ہیں
پرکارِ کشتگاہ میں ''گلزار'' آپ ہیں

تزئین خود کلام ہے، توصیف خود عیاں
''گلزار'' لفظ و معنی کا ''جاوید'' بے گماں

تخلیق کار حسنِ نگارش میں بے مثال
اردو ادب کی زلفِ معنبر کے نونہال

زورِ قلم ہو اور گرانبار وصف سے
اردو ادب کے رمز و معنی و حرف سے

اردو کی زلف سایۂ فرحت فضا رہے
درماندۂ زباں کو میسر سدا رہے

** بقول: دھنّو، قلم شعلے

ایک صدی کا قصّہ
سنیل دت
دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ریڈیو سیلون کی برصغیر میں دھوم تھی۔ یہ واحد کمرشل ریڈیو اسٹیشن تھا جس پر اٹھارہ گھنٹے ہندی گانے بجتے رہتے تھے۔ گانوں کے ساتھ ساتھ فلمی اداکاروں کے انٹرویو بھی نشر ہوتے رہتے تھے۔ ریڈیو سیلون کے ساتھ بلراج ساہنی ہی نہیں بلراج دت بھی وابستہ تھے جو کافی مقبول تھے۔ بلراج دت متحدہ پنجاب کے ایک جاگیردار پریوار کے چشم و چراغ تھے۔ دت ذات سے موہیال برہمن تھے اور جن کا جنم گاؤں کھرد (ضلع) جہلم (قصبہ) پاکستان میں 6 جون 1930 کو ہوا تھا۔ جب وہ پانچ سال کا تھا تو اُنکے والد کا انتقال ہوا۔ ماں نے اُسے بڑے ناز و نعم سے پالا۔ اُسنے جہلم کے DAV اسکول میں آٹھویں تک پڑھائی حاصل کی۔ اُنکا اسکول گھر سے آٹھ میل کی دوری پر تھا۔ چونکہ وہ بہت بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اُن کے گھر میں کئی طرح کے گھوڑے تھے اسلئے اُس کے لئے ایک گھوڑا مختص کیا گیا تھا جس پر بیٹھ کر وہ اسکول جایا کرتا تھا۔ ایک سال دت صاحب نے راولپنڈی کے DAV اسکول میں پڑھائی کی۔ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو ملک میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ ہر طرف موت کا تانڈو شروع ہو گیا۔ انسانیت پر حیوانیت غالب آچکی تھی۔ یعقوب نام کا ایک نیک مسلمان جو کہ اُسکے والد کا دوست تھا جو اُنکے گاؤں سے ڈیڑھ میل کی دوری پر رہتا تھا۔ وہ اُنکے لئے فرشتہ بن کے آیا اور اُسنے اپنی جان پر کھیل کر دت پریوار کو بچالیا اور انہیں موت کے پنجوں سے نکال کر بحفاظت جہلم شہر تک پہونچا دیا اور اسطرح اس نیک بندے نے انسانیت کی شمع کو جلائے رکھا۔ اُنہوں نے ایک چھوٹے سے گاؤں منڈھالی میں عارضی سکونت اختیار کی جو کہ جمنا کے کنارے پر آباد تھا۔ تب یہ گاؤں پنجاب کے مفصلات میں شامل تھا۔ اب یہ گاؤں ہریانہ کی حد بندی میں آتا ہے۔ کچھ وقت یہاں پر گزارنے کے بعد وہ امین آباد گلی لکھنؤ منتقل ہو گئے جہاں پر بلراج دت نے اپنی پڑھائی پوری کی۔ اسی بیچ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ ایک دن بلراج دت کی ماں نے اپنے بیٹے کو یہ سیکھ دی کہ جو لوگ اپنے ماضی کے اسیر رہتے ہیں وہ صرف اور صرف نفرت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ وہ کبھی زندگی میں آگے بڑھ نہیں پاتے ہیں۔ آگے بڑھنا ہے تو ماضی کی تلخیوں کو بھول جاو۔ دت نے ماں کی بات گرہ میں باندھ لی اور اپنے ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر وہ بمبئی چلا آیا۔ ساؤتھ بمبئی میں اُس نے نیوی کی ایک عمارت میں رہائش کا بندوبست کر لیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں پہلے ہی آٹھ لوگ رہتے تھے جن میں کوئی نائی تو کوئی درزی تھا۔ مطلب یہ کہ اس کمرے میں ہر قماش کے لوگ رہتے تھے۔ وہ رات کو کمرے میں کافی گرمی اور گھٹن محسوس کرتا تھا سو وہ اور اُسکے دو چار ساتھی کمرہ چھوڑ کے فٹ پاتھ پر جا کے سو جایا کرتے تھے۔ اُنکی پسندیدہ جگہ ایک ایرانی ہوٹل کا اگھواڑہ تھا جہاں وہ ہوٹل بند ہوتے ہی لیٹ جایا کرتے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے یہ ہوٹل کھل جاتا تھا۔ یہ اُنکے جاگنے کا الارم ہوتا تھا۔ جونہی ہوٹل کھل جاتا تھا وہ چائے کا آڈر دے دیتے تھے۔ دت ہلکا سا ناشتہ کر کے کالج کی طرف نکل جاتا تھا۔ اُس نے جے ہند کالج میں انڈر گریجویٹ کے طور پر داخلہ لیا تھا۔ چونکہ گھر کی مالی حالت ٹھیک نہیں تھی اسلئے گھر والوں پر بوجھ نہ ڈال کر وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ بمبئی کے دادر بسٹ بس ڈپو میں بطور سپروائزر کام کرتا رہا۔

جے ہند کالج میں دت صاحب کی فنی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ اُسے کلچرل سوسائٹی کا سیکرٹری چنا گیا۔ جے ہند کالج میں دت صاحب نے کئی ڈرامے نہ صرف لکھے بلکہ اُن میں کام بھی کیا۔ ایک دن جب وہ جے ہند کالج میں ایک سٹیج شو کر رہا تھا، اس شو میں ایک برٹش ایڈ ایجنسی کے مالک ڈی جی کیمر بھی بیٹھے تھے۔ اُنہیں بلراج دت کی آواز نے اپنی اور کھینچ لیا۔ اُنکی آواز میں بڑی دلکشی اور شیرینی تھی۔ اُنہوں نے اُسے ریڈیو سیلون سے ''لپٹن کے ستارے'' پروگرام پیش کرنے کی آفر کی جو بلراج دت نے فوراً قبول کی۔ اسطرح وہ ریڈیو سیلون میں پہونچ گیا۔ وہ فلمی ستاروں کے انٹرویو کرتا تھا۔ وہ نرگس کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا مگر کوشش بسیار کے باوجود نرگس نے اُسے وقت نہیں دیا اور اسطرح اُسکی یہ خواہش دل میں ہی دب کر رہ گئی۔ فلمی ستاروں سے انٹرویو کرتے کرتے اُس کے دل میں بھی ہیرو بننے کی خواہش بیدار ہوئی۔ وہ کئی فلمی ڈائرکٹروں سے ملتا رہا۔ ایک دن جب وہ بمل رائے کی فلم ''دو بیگہ زمین'' کے پریمیر پر موجود تھا تو اس پریمیر میں شامل ہونے کے لئے نرگس بھی آپہونچی۔ نرگس اُسوقت اپنے عروج پر تھی۔ نرگس کو دیکھ کے بلراج دت کے من کا تار تار بج اُٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نرگس کی ایک نظر نے اُسے مسحور کر کے رکھ دیا۔ وہ نرگس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا مگر بات ہو نہ سکی۔ اس چھوٹی سی ملاقات میں نرگس کی تصویر اُسکے دل و دماغ میں اُتر گئی۔

بلراج دت ریڈیو جاکی کی نوکری کے ساتھ ساتھ ایکٹر بننے کی جدو جہد بھی کر رہا تھا۔ اُنکا پروگرام ''لپٹن کے ستارے'' کافی مقبول ہو چکا تھا۔ اس پروگرام کے لئے وہ دلیپ کمار، دیوآنند جیسے مقبول ترین اداکاروں کا انٹرویو لے چکا تھا۔ ایک دن جب وہ دلیپ کمار اور نلنی جیونت کی فلم ''شکست'' کی کورنگ کر رہا تھا، وہ فلم کے ڈائرکٹر رمیش سہگل سے ملا۔ رمیش سہگل اُسکی آواز سے متاثر تھے۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں اُسکی آواز میں بلا کی مٹھاس اور شگفتگی تھی۔ رمیش سہگل نے اُسے ''شکست'' میں ایک چھوٹا سا رول پیش کیا جو اُسنے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جب تک وہ اپنی گریجویشن پوری نہیں کریں گے وہ کوئی فلم نہیں کریں گے کیونکہ اُس نے اپنی ماں کو یہ وچن دیا ہے۔ جب اُس نے اپنی گریجویشن پوری

کی تو رمیش سہگل نے پھر اُس سے کہا کہ کیا وہ اُسکی اگلی فلم میں کام کرے گا۔ جواب میں دت نے کہا کہ اگر اُسے ہیرو کا رول پیش کیا جائے تو وہ ضرور کریں گے ۔رمیش سہگل نے دلیپ کمار کے کپڑے پہنا کر اُسکا اسکرین ٹسٹ لیا۔وہ کپڑے اتنے چھوٹے تھے کہ پتلون ٹخنوں سے اوپر تھی جب کہ جیکٹ کی آستینیں کلائی تک نہیں پہونچتی تھی۔ایسے چھوٹے کپڑے پہن کر بلراج دت بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اسکرین ٹسٹ تو ہوا۔ دت کو لگا کہ رمیش سہگل اُسے دوبارہ نہیں بلائیں گے۔لیکن رمیش سہگل نے بلراج دت کو دوبارہ بلالیا اور اُسے اپنی نئی فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' کے لئے سائن کیا۔فلم کی ہیروئن نلنی جیونت تھی۔نلنی جیونت اُس زمانے کی ٹاپ کی ہیروئنوں میں شمار کی جاتی تھی۔ بلراج دت نے اس فلم کے ساتھ اپنا نام بدل لیا۔ چونکہ ایک بلراج پہلے ہی فلموں میں انٹری کر چکے تھے مطلب بلراج ساہنی۔اس لئے اُس نے اپنا نام بلراج دت سے بدل کر سنیل دت رکھا۔فلم بنی،ریلیز ہوئی پر کامیاب نہ رہی۔

سنیل دت فلم کاروں کی نظر میں آچکا تھا۔اگلی فلم سہراب مودی کی ''کندن'' تھی جسمیں اُسکا رول مختصر سا تھا۔یہ فلم نمی کے کردار کے گرد گھومتی تھی۔ اس فلم میں نمی کا دوہرا کردار تھا۔سنیل دت انٹرول کے بعد آتا ہے۔ناظرین نے اُسے اس چھوٹے سے رول میں پسند کیا۔فلم بیحد کامیاب رہی۔اس کے بعد سنیل دت کو بی آر چوپڑہ نے اپنی فلم ''ایک ہی راستہ'' کے لئے چنا۔اس فلم کے کلیدی رول میں مینا کماری تھی۔یہ فلم ہندو بیوہ کی دوسری شادی کے موضوع پر بنی تھی جسمیں سنیل دت نے مینا کماری کے شوہر کا رول ادا کیا تھا جسکا انٹرول سے پہلے قتل ہوجاتا ہے۔اس فلم نے باکس آفس پر ڈنکا بجایا۔

اس فلم کے بعد جس فلم نے سنیل دت کی تقدیر بدل دی وہ فلم تھی ''مدر انڈیا''۔محبوب خان نے جب سنیل دت کو اس فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی تو سنیل دت نے فوراً حامی بھرلی۔اُسے اس بات کی آگاہی ہوچکی تھی کہ اس فلم میں نرگس کام کررہی ہے۔وہ اپنی محبوب اداکارہ کے قریب رہنا چاہتا تھا اسلئے اُسنے نرگس کے بیٹے کا رول کرنا منظور کرلیا۔یہ رول پہلے دلیپ کمار کو آفر کیا گیا تھا جسے اُنہوں نے ٹھکرادیا تھا۔وہ نرگس کے بیٹے کا رول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔اس فلم نے سنیل دت کو عزت اور شہرت بخشی اور وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔

فلمی دنیا میں راج کپور اور نرگس کے معاشقے کی زور شور سے چرچا ہورہی تھی۔سنیل دت بھی ان باتوں سے باخبر تھا پھر بھی اُسکی دیوانگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ نرگس کو دل ہی دل میں جنون کی حد تک چاہنے لگا تھا۔وہ خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں پیار کی بیلا کو پروان چڑھاتا رہا اور خاص موقع اور وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ نرگس کو اپنے جذبات سے آگاہ کردے۔اسی بیچ راجکپور کے ایک انٹرویو نے نرگس کا دل توڑ کے رکھ دیا۔راج کپور نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ اصلی بیوی وہی ہوتی ہے جو بچوں کی ماں ہو باقی سب ایسی ہی ہوتی ہیں ۔نرگس نے راجکپور سے کنارہ کرلیا۔وہ داشتہ بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی اسلئے اُسنے راجکپور سے سارے رشتے ناتے توڑ لئے اور وہ خلوت میں بیٹھ کر اپنی برباد محبت کا نوحہ کرتی رہی۔

''مدر انڈیا'' کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ نرگس اور سنیل دت ایک دوسرے کے قریب آئے۔نرگس کو سنیل دت کی معصومیت اور اُسکی سادگی بھا گئی جب کہ سنیل دت کو نرگس کے اندر ایک دردمند انسان نظر آیا۔ایک دن کیا ہوا کہ سنیل دت کی بڑی بہن اچانک بیمار ہوگئی۔سنیل دت بمبئی شہر سے پوری طرح واقف نہ تھا۔اُسے یہ نہیں پتا تھا کہ کون سا ڈاکٹر کہاں رہتا ہے اسلئے وہ اپنی بہن کو فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس لے کے نہ جاسکا۔یہ خبر جب نرگس کو ملی تو وہ سنیل دت کو بتائے بنا اُسکی بہن کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور اُسکا آپریشن کروالیا۔سنیل دت اُسکے اس انسانی جذبے سے کافی متاثر ہوا اور اُسنے سوچا کہ یہی وہ عورت ہے جو اُس کے پریوار کا خیال رکھ سکتی ہے۔شاید قدرت بھی یہی چاہتی تھی۔''مدر انڈیا'' کے سیٹ پر ایک دن آگ لگی۔نرگس آگ میں گھر گئی۔سنیل دت نے اپنی جان پر کھیل کر اُسے اُس آگ سے باہر نکال لیا۔نرگس کو بچاتے بچاتے سنیل دت آگ کی لپٹوں سے بری طرح جھلس گیا۔اُسے اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں رات دن نرگس نے اُسکی تیمارداری کی۔اس حادثے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے بیحد قریب آگئے۔دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر محبوب خان نے اُنہیں ایسا کرنے سے روکا کیونکہ اُنکی شادی سے فلم کے بزنس پر منفی اثر پڑسکتا تھا۔اُنہوں نے محبوب صاحب کی بات مان لی اور وہ چھپ چھپ کے روزمل لیا کرتے تھے۔گھنٹوں بیٹھ کے پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ جب وہ شوٹنگ کے لئے کہیں دور نکل جاتے تھے تو تار اور خطوط سے اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

''مدر انڈیا'' کی ریلیز کے بعد اُنہوں نے 1958 میں چپ چاپ شادی کرلی۔اس شادی میں چند قریبی دوست ہی شامل ہوئے۔کسی نے سنیل دت سے پوچھا کہ یہ جان کر بھی کہ نرگس اور راج کپور ایک دوسرے سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے پھر بھی تم نے نرگس سے شادی کی تو جواب میں سنیل دت نے کہا کہ میں کسی کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔میں حال اور مستقبل میں جینے والا آدمی ہوں۔کس کا کیا ماضی رہا ہے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔میں صرف یہ دیکھتا ہوں کہ جو انسان میری زندگی میں آیا ہے وہ کتنا سچا اور ایماندار ہے۔

شادی کے فوراً بعد نرگس نے فلموں سے کنارہ کرلیا جب کہ سنیل دت کی تواتر سے فلمیں ریلیز ہونے لگیں ۔شادی کے پہلے سال میں ہی بی آر چوپڑہ کی فلم ''سادھنا'' ریلیز ہوئی جسمیں اُسکی ہیروئن وجینتی مالا تھی۔1959 میں بمل رائے کی ہدایت میں بننے والی فلم ''سجاتا'' ریلیز ہوئی جسمیں اُسکی ہیروئن نوتن تھی۔یہ دونوں فلمیں بیحد کامیاب رہیں اور اسمیں سنیل دت کی اداکاری کو کافی سراہا گیا۔1963 میں اپنے ذاتی بینر تلے اُس نے پہلی ہندی فلم بنائی جس کا نام ''مجھے جینے دو'' تھا۔اس فلم میں سنیل دت نے ایک ڈاکو کا کردار بخوبی ادا کیا تھا۔

یہ فلم بھی باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔
اسی بیچ مالک نے اُنہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ 29 جولائی 1959 کو اُنکے گھر پہلا بیٹے کا جنم ہوا جس کا نام سنجے دت رکھا گیا۔ اُسکے بعد دو بیٹیاں ہوئیں۔نمرتا اور پریا۔زندگی کی ہر خوشی ہر سکھ اُنکے قدم چوم رہی تھی۔ایک طرف گھر خوشیوں سے ہرا بھرا تھا تو دوسری طرف سنیل دت کی کامیابی اور کامرانی میں پنکھ لگتے جارہے تھے۔اُسکی ایک کے بعد ایک فلم کامیابی سے ہمکنار ہوتی جا رہی تھی۔ساوتھ کی ''خاندان'' اور ''پڑوسن'' دو ایسی فلمیں تھیں جنھوں نے سنیل دت کو ایک منجھے ہوئے اداکار کے طور پر پیش کیا تھا۔بی آر چوپڑہ سنیل دت کی اداکارانہ صلاحیتوں کا پہلے سے قائل تھا اسلئے بی آر چوپڑہ نے اُسے اپنی آنے والی فلموں میں کاسٹ کیا۔''وقت''''گمراہ'' اور ''ہمراز'' تین ایسی فلمیں ہیں جو سنیل دت کی بہترین فلموں میں شمار کی جاتی ہیں۔اسکے علاوہ ''میں چپ رہوں گی''''چھایا''''یہ راستے ہیں پیار کے''''آج اور کل''''بیٹی بیٹے''''مہربان''''میرا سایہ''''ملن'' اور ''چراغ'' ایسی فلمیں ہیں جسمیں سنیل دت کی جذباتی اداکاری کو کافی سراہا گیا۔
اُسنے عام روش سے ہٹ کے فلمیں بنائیں۔''یادیں'' ایک ایسی ہی فلم تھی جسمیں صرف ایک اداکار نظر آتا تھا۔اسمیں آواز کے تاثرات سے ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔یہ تجربہ کاروباری لحاظ سے کامیاب نہیں رہا مگر قومی سطح پر اس فلم کی کافی پزیرائی ہوئی۔1964 میں اس فلم کو بہترین فلم کے قومی اعزاز سے نوازا گیا۔اسکے بعد سنیل دت نے فلم ''ریشما اور شیرا'' بنائی جو بری طرح پٹ گئی۔اسمیں امیتابھ بچن کو ایک گونگے کے چھوٹے سے رول میں پیش کیا گیا تھا۔اُسنے اپنے چھوٹے بھائی سوم دت کو فلم ''من کی میت'' میں پیش کیا۔یہ فلم بھی چل نہیں پائی۔فلمسازی کے میدان میں ناکام رہنے کے بعد اُسنے ایک بار پھر اداکاری کی طرف رخ کیا۔''پران جائے پر وچن نہ جائے''''ناگن''''جانی دشمن'' اور ''شان'' ایسی چند فلمیں ہیں جن میں سنیل دت نے کام کیا۔اسکے بعد اُسکی مقبولیت کم ہونے لگی۔
ایک طرف اُسکی فلمی چمک دمک ماند پڑتی جارہی تھی تو دوسری طرف نرگس بیمار پڑ گئیں۔جب اُنکے مرض کی تشخیص ہوئی تو دت پریوار پر بجلی گری۔وہ کینسر کے جان لیوا مرض میں گرفتار ہو چکی تھی۔وہ کئی سالوں تک ٹاٹا کینسر انسٹیٹیوٹ میں زیر علاج رہی۔وہ ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ایک طرف نرگس کی علالت تو دوسری طرف وہ اپنے بیٹے سنجے دت کو ہندی سلور اسکرین پر پیش کرنے کی تیاریوں میں تن من سے جٹ گیا تھا۔فلم ''راکی'' میں اُسنے اپنے بیٹے کو اپنے بینر تلے پیش کیا۔فلم ریلیز ہونے سے پہلے نرگس کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ وہ اُسے مزید علاج معالجے کے لئے امریکہ لے گیا۔وہاں وہ موت سے لڑتی رہی۔ادھر فلم ''راکی'' ریلیز ہونے والی تھی۔وہ کسی بھی حالت میں اپنے بیٹے کی فلم کے ٹرائل شو میں شامل ہونا چاہتی تھی۔اُسنے اپنے شوہر سے کہا کہ چاہے اُسے ویل چیر پر جانا پڑے وہ اپنے بیٹے کی فلم ایک بار دیکھنا چاہتی ہے۔جس دن ''راکی'' کا پریمیر شو تھا اُس سے پہلے ہی نرگس موت کی آغوش میں سما گئی۔پریمیر کے دن اُسکی خالی کرسی پر اُس کی تصویر رکھی گئی۔
فلم ''راکی'' ہٹ ہوئی تھی پر سنجے دت کم سن تھا نادان تھا۔اُسے یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی کامیابی پر خوشیاں منائے یا روئے۔اصل میں وہ اپنی ماں سے جذباتی طور پر جڑا ہوا تھا۔ماں کی موت سے اُس کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ اپنے غم بھلانے کے لئے ڈرگس کا سہارا لینے لگا۔اس بات کا علم دت صاحب کو بہت تاخیر سے ہوا۔جب سنجے اندر سے کھوکھلا ہوتا جارہا تھا اور اُسے لگا کہ وہ اب بچ نہیں پائے گا تو اُس نے اپنے باپ سے مدد مانگی۔سنیل دت اُسے لے کے امریکہ چلا گیا اور ساڑھے تین سال تک وہ اُسے وہاں وہاں لے کر گھومتا رہا جہاں اس طرح کے مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔ساڑھے تین سال کے بعد جب وہ اس دوزخ سے باہر آگیا تو اُسکے باپ نے اُسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا کہ اب میں تمہارے لئے کوئی فلم نہیں بناوں گا۔اب تمہیں خود کام ڈھونڈنا ہوگا۔
ایک سال تک وہ گھر میں پڑا رہا۔وہ یا تو سکاش کھیلتا تھا یا گھر میں بیٹھ کر فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ایک سال کے بعد اُسکی زندگی میں ایک بڑا چمتکار ہوا۔سبھاش گھئی نے اُسے اپنی فلم ''کھلنائک'' کے لئے سائن کیا۔فلم زبردست ہٹ ہوئی۔اسکے بعد سنجے نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔جب وہ عروج کی طرف گامزن تھا اچانک اُس پر ایک اور اُفتاد پڑی۔بمبئی کے بم دھماکوں کے بعد سنجے نے اپنے ایک فلم پرڈیوسر کی وساطت سے ایک اے۔کے۔۵۶ ریوالور اور ایک گرینیڈ حاصل کیا تھا۔وہ غیر قانونی طور پر گھر میں اسلحہ رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔اس جرم کی پاداش میں اُسے ڈیڑھ سال جیل کے اندر گزارنے پڑے۔یہ بڑا کٹھن دور تھا جس میں سے دت پریوار کو گزرنا پڑا۔سنیل دت کو حریفوں نے اس حد تک ہدف ملامت بنایا کہ اُسے اپنی پارلیمنٹ ممبر شپ سے استعفا دینا پڑا۔
نرگس نے مرنے سے قبل سنیل دت سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ کینسر کے مریضوں کے لئے کام کرتا رہے گا۔نرگس کی موت نے دت صاحب کو توڑ کے رکھ دیا تھا تاہم اپنی بیوی کو دیا ہوا وچن نبھانے کے لئے اُسنے کمرکس لی اور نرگس دت کینسر فاونڈیشن کی نیو رکھی۔اُسنے اس کینسر اسپتال کے لئے کئی ملکوں میں جا کر فنڈ اکھٹے کئے۔اُن فنڈس سے نہ صرف جدید آلات خریدے بلکہ جو غریب تھے اُن کو مفت طبی سہولیات پیش کیں۔اُس نے سالوں بغیر تھکے اور بغیر رکے اس فاونڈیشن کے لئے کام کیا۔اسی بیچ پاکستانی کرکٹر عمران خان نے سنیل دت سے لاہور میں اپنے کینسر اسپتال کے لئے مدد مانگی تو سنیل دت نے بنا کسی تامل کے عمران خان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ فلائٹ پکڑ کر برمنگھم پہونچ گیا اور اسپتال کے لئے فنڈ اکھٹا کرنے لگا۔گو کہ سنیل دت ہندوستانی تھے اور عمران خان پاکستانی سنیل دت نے ملکی اور مذہبی تفریق کو اس نیک کاز میں آڑے آنے نہیں دیا۔اُس کا کہنا تھا کہ درد اور تکلیف کا کوئی دھرم نہیں ہوتا، کوئی قومیت نہیں ہوتی۔میرا کام ہے انسانیت کی سیوا کرنا۔

1982 میں مہاراشٹر سرکار نے سنیل دت کو بمبئی کا شریف مقرر کیا۔1984 میں سنیل دت نے کانگریس پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔وہ جھونپڑ پٹیوں میں رہنے والوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے لگا۔راجیو گاندھی کی درخواست پر سنیل دت نے 1984 کا پارلیمنٹ الیکشن لڑا۔وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگیا۔1989 میں وہ دوبارہ پارلیمنٹ کے لئے چنا گیا۔سنیل دت انسانیت کا علمبردار تھا۔1987 میں جب پنجاب میں دہشت گردی نے قہر مچا دیا تھا سنیل دت اپنی چھوٹی بیٹی پریا اور اپنے اسی ساتھیوں کے ہمراہ بمبئی سے لے کے پنجاب تک پدیاترا کی۔2000 کلومیٹر کی مسافت اُنہوں نے پیدل طے کی۔یہ وہ دور تھا جب پنجاب میں دہشت گردی اپنے عروج پر تھی۔ایسے حالات میں پنجاب کی پیدل یاترا کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔سنیل دت نے اپنی جان کی پرواہ کئے بنا امن و آشتی اور آپسی بھائی چارے کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال دی اور پنجاب سے ہوتے ہوئے وہ سورن مندر (گولڈن ٹمپل) پہونچ گئے جہاں اُنہوں نے امن و آشتی کے لئے دعا مانگی۔جب کسی نے سنیل دت سے پوچھا کہ اُنہوں نے اس طرح کا خطرہ مول کیوں لیا تو جواب میں اُس نے بھگوت گیتا کے ایک شلوک کا حوالہ دیا۔تمہارا کام ہے کرم کرنا ، پھل کی اُمید مت رکھ۔ایک ہندوستانی ہونے کے ناتے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں دیش کی سیوا کروں۔وہ ایک بار نہیں پانچ بار لوک سبھا الیکشن جیت گئے۔1993 کے بم دھماکوں کے بعد بمبئی میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔دت صاحب نے بطور احتجاج پارلیمنٹ ممبر شپ سے استعفا دے دیا۔2004 میں اُنہیں کھیل منتری بنایا گیا۔

ایک بار جب اُنہیں وزیر اعظم پاکستان محترم میاں نواز شریف نے پاکستان آنے کی دعوت دی تو اُنہوں نے ایک شرط رکھی کہ وہ اس شرط پر پاکستان آئیں گے جب اُنہیں اپنے آبائی گاؤں کی زیارت کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔نواز شریف صاحب نے اُنکی خواہش کا احترام کر کے اُن کے دورے کا پورا انتظام کردیا۔پچاس سال کی لمبی جدائی کے بعد جب وہ اپنے آبائی گاؤں پہونچا تو یہ دیکھ کر اُسکی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اُسنے پورا گاؤں اپنے سواگت کے لئے سڑک کے کنارے کھڑا پایا۔اُسے لگا کہ وہ اس لئے یہاں کھڑے ہیں کہ وہ مقبول فلم ایکٹر ہے۔یہ غلط فہمی تب دور ہوئی جب اُسکے ہم عمر لوگوں نے اُس سے اُسکے چھوٹے بھائی سوم کے بارے میں پوچھا۔بہن رانی اور ماں کلونتی کے بارے میں پوچھا۔وہ محوِ حیرت تھا کہ پچاس سال گزر جانے کے باوجود اُنہیں اب تک اُن کے بھائی بہنوں کے نام یاد تھے۔جب عمر رسیدہ عورتوں نے اُسے دیکھا تو وہ اُسے اُسکے بچپن کے نام بالا سے پکارنے لگیں ، جب اُسنے گاؤں والوں سے کہا کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے تو گاؤں کی عورتیں چھاتیاں پیٹنے لگیں اور سیاپا کرنے لگیں جیسے اُن کے خاندان میں کسی کا انتقال ہوا ہو۔انسانی جذبات اور احساسات ایک جیسے ہوتے ہیں۔وہ کیسے اور کب ان جذبات کا استعمال کرتا ہے یہ اُس شخص پر منحصر ہے۔یہ کہنا تھا سنیل دت کا۔وہ اُسے اُن کھیتوں تک لے گئے جو کبھی اُنکے ہوا کرتے تھے۔اُنہوں نے سنیل دت سے کہا کہ یہ کھیت آپ لوگوں کے ہیں۔یہاں آجاؤ اور اپنے کھیت واپس لے جاؤ۔سنیل دت نے اُن سے کہا کہ یہ کھیت اب آپ لوگوں کے ہیں۔وہ نہیں مانے کہنے لگے کہ یہ کھیت آپ کے ہی ہیں۔وہاں پر پاکستانی ٹی وی چینل کے رپوٹر بھی تھے۔اُنہوں نے کئی کاشت کاروں سے سوال کیا کہ وہ سنیل دت کے تئیں اتنی شفقت اور رفاقت کیوں دکھا رہے تو جواب میں وہ بولے کہ یہ ہم بلراج کے لئے نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُس کے باپ دادا کے لئے ہمارے دل میں جو عقیدت اور احترام ہے وہ ہم کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔وہ بہت نیک لوگ تھے اور ہمیشہ ہمارے مذہب کا احترام کرتے تھے۔وہ بہت بڑے جاگیردار تھے لیکن رہتے تھے انتہائی سادگی اور انکساری کے ساتھ۔ہمارے گاؤں میں ایک صوفی درگاہ ہے۔جب وہ وہاں سے گزرتے تھے تو گھوڑے سے اُتر جاتے تھے اور درگاہ پار کر کے پھر گھوڑے پر بیٹھ جاتے تھے۔جب وہ ہمیں اتنی عزت اور پیار دیتے تھے تو ہم اُن کی اولاد کا کیوں نہ احترام کریں۔سنیل دت کی بیوی نرگس اُس گاؤں کو دیکھنا چاہتی تھی جہاں اُس نے جنم لیا تھا۔اُسے اس بات کو ساری زندگی افسوس رہا کہ وہ اپنی بیوی کی خواہش پوری نہ کرسکا۔

سنیل دت نے سو کے قریب فلمیں کیں۔اُنکی آخری فلم ''منا بھائی ایم بی بی ایس'' تھی جسمیں اُسنے اپنے بیٹے سنجے کے باپ کو رول ادا کیا تھا۔اُنکی بڑی بیٹی نمرتا نے راجندر کمار کے بیٹے کمار گورو کے ساتھ شادی کی۔سنجے کی پہلی بیوی کا کینسر کے کارن انتقال ہوا۔سنجے نے دوسری شادی کی۔اُسکی چھوٹی بیٹی پریا جو چھایا بن ہمیشہ اُس کے ساتھ رہی اُسنے سیاست میں اُسکی جگہ لے لی۔25 مئی 2005 کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے دت صاحب کی موت ہوئی۔اسطرح ایک غریب پرور، ایک سماج سیوک ممبئی کی چالوں میں رہنے والے لاکھوں لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کے چلا گیا۔

''نیورل مشین''

گوگل نے نو بھارتی زبانوں کے لیے نیورل ٹرانسلیشن مشین متعارف کرائی ہے جو خود کار ترجمہ کر سکے گی۔گوگل کا نیورل مشین سسٹم انتہائی جدید ہے اور ترجمے کے لیے نیورل نیٹ ورکس پر انحصار کرتا ہے۔یہ ماڈل اس نظام سے مماثلت رکھتا ہے جس کے تحت ایک مشین دیگر اقدامات کے لیے مختلف معلومات سیکھتی ہے مثلاً تصویر کی شناخت لیکن اس معاملے میں نیورل نیٹ ورک کو جملوں کی صورت میں مختلف زبانیں اور ان کا ترجمہ سکھایا جاتا ہے۔فلحال گوگل نے ہندی، بنگالی، مراٹھی، تامل، تیلگو، گجراتی، پنجابی، ملیالم اور کنٹر زبانوں کے لیے اس مشین کی خدمات پیش کی ہیں۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام و آداب

چہارسو کے تازہ شمارہ کی پی ڈی ایف کاپی دیکھ لی ہے۔ آپ نے اس میں مجھ ناچیز پر تفصیلی گوشہ چھاپا ہے۔ میری کیفیت عجب ہے۔ ایک طرف آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور دوسری طرف شرمندگی ہو رہی ہے۔ اپنے بارے میں مختلف اہلِ علم کے مضامین دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے، اور آپ نے بےلوث ہو کر اس کا اہتمام کیا ہے، اس کے لیے دل میں سپاس گزاری کے جذبات محسوس کر رہا ہوں، جنھیں بیان کرنے کے لیے مناسب لفظ ابھی نہیں سوجھ رہے، اور دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا ہوں کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، مگر احباب اور اہلِ نظر نے تعریف کی ہے۔ بخدا میں انکسار سے نہیں کہہ رہا، اپنی اصلی کیفیت بتا رہا ہوں۔ میں نے گزشتہ پچیس سالوں سے جو مناسب لگا، بس لکھتا چلا گیا ہوں، اور اتفاق یہ ہے کہ وہ سب اچھے رسائل میں چھپا اور اچھے پبلشر نے چھاپا۔ بس۔ اس سے زیادہ نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ اپنی نئی کتاب پر کسی صاحب نظر کے تبصرے کا منتظر ضرور رہتا ہوں۔ باقی اپنے بارے میں مضامین کی خواہش نہیں ہوتی۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے کافی اصرار کیا کہ گوشے کی ضرورت نہیں، مگر آپ کے عزم اور بےانتہا خلوص کے آگے ہار گیا۔ سب سے زیادہ اس بات نے مجھے متاثر کیا کہ آپ شخصیات پر گوشے کسی صلہ و تمنا کی خواہش کے بغیر چھاپتے ہیں، جس کا تصور بھی فی زمانہ محال ہے۔ بہ ہر کیف میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس عزت کا سزاوار سمجھا۔

ناصر عباس نیر (لاہور)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

مشرف عالم ذوقی صاحب پر شمارہ بہت جامع ہے، ابھی عبدالصمد پر شمارے کی گونج تھی کہ یہ خاص شمارہ ہلچل پیدا کرنے لگا۔ مبارکباد! چہارسو کا ہر شمارہ دستاویزی ہوا کرتا ہے! پچھلے شمارے میں آپ نے جناب رؤف خیر کا ایک مضمون شامل اشاعت کیا ہے۔ رؤف صاحب خیر سے ذہنی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں اسی لیے پرانی تحریروں کو بار بار چھپوا رہے ہیں۔ کبھی حضور اکرمﷺ کی شان میں گستاخی کبھی علامہ اقبال پر ناواجب تنقید اور کبھی اس عاجز کے خلاف بےتکی ہانک کر اپنے نام کو چمکا رہے ہیں۔ جہاں تک میری کتاب ’’لسانی لغت۔۔ غازی علم الدین کے حوالے سے‘‘ کی بات ہے پہلی بار یہ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے خلاف ۲۰۱۴ء میں رؤف خیر نے وہی مواد شائع کرایا جو آپ کے یہاں چھپا ہے۔ اس کا تفصیلی جواب تب میں نے دیا تھا۔ سچائی یہ ہے کہ پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب ’’لسانی مطالعے‘‘ میں درج ذیل آٹھ مضامین ہیں:

’’زبان کے اخلاقی انحطاط کا نفسیاتی پس منظر، الفاظ کا تخلیقی اور معنوی و اصلاحی پس منظر، الفاظ معنی بدلتے ہیں، لسانی تحقیق کے کچھ نئے زاویے، اردو کا عربی سے لسانی تعلق اور اصلاح زبان و ادب، اردو میں مستعمل عربی الفاظ کی تشکیلی اور مصنوعی وسعت، املا میں الفاظ کی جداگانہ حیثیت سے انحراف اور قومی زبان اور ہمارے نشریاتی ادارے‘‘

غازی علم الدین صاحب نے مندرجہ بالا مضامین کا مسودہ مجھے ’’پیش لفظ‘‘ لکھنے کے لیے بھیجا تھا کہ مقتدرہ قومی زبان سے کتاب شائع ہونے والی ہے۔ پڑھتے اور لکھتے وقت مضامین کے بطون سے میں نے ’’لسانی لغت‘‘ تیار کی جس کا اعتراف سات صفحے کے پیش لفظ میں میں نے کیا۔ ۲۰۱۶ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غازی صاحب نے یہ کتاب آپ کو بھی بھیجی ہے۔ دیکھئے ’’لسانی لغت‘‘ میں ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے بلکہ الفاظ کی صحت اور معانی کی تفصیل درج ہے۔ اس لغت کا مسودہ غازی علم الدین صاحب کو بھیجا تو وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے اس لغت کو پہلے ہندوستان سے شائع کرانے کے لیے اصرار کیا۔ یہاں کے سب سے بڑے پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے یہ لغت شائع کی جس کی طباعت کا پورا خرچ غازی صاحب نے برداشت کیا اور ڈھائی سو جلدیں منگوا کر پاکستان میں تقسیم کر کے مجھے فون پر خبر دیتے رہے کہ یہ لغت مقبول ہو رہی ہے۔ پھر ۲۰۱۴ء میں غازی صاحب کی خواہش پر ان کی کتاب ’’لسانی مطالعے‘‘ پر موصولہ مضامین کو میں نے ترتیب دے کر کتاب ’’اردو: معیار اور مسائل (غازی علم الدین کی کتاب ’’لسانی مطالعے کے حوالے سے)‘‘ کے نام سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ہی شائع کرائی۔ اس میں سینتالیس مضامین اور سولہ مشاہیر کی آراء شامل ہیں۔ 263 صفحے کی اس کتاب کا بھی خرچ غازی صاحب نے برداشت کیا اور ڈھائی سو جلدیں انہوں نے منگوائیں۔ مئی ۲۰۱۴ء میں پبلشر کے پاس جلدیں ختم ہو گئیں تو جون میں دونوں کتابوں کا دوسرا ایڈیشن آ گیا، ۲۰۱۵ء میں غازی صاحب کی نئی تنقیدی کتاب پاکستان سے شائع ہوئی تو سرورق چار پر میری ان دونوں کتابوں کا اعلان انہوں نے شامل کیا۔

قارئین خود بتائیں کہ رؤف خیر بلا وجہ غلط فہمی پھیلا کر اپنے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جب کہ میرے کام کا اعتراف غازی صاحب کر رہے ہیں اور ’’لسانی لغت‘‘ پڑھنے والے دانشور کر رہے ہیں۔ جنہوں نے اس پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً مقبول ہوئی ہے۔ سہ ماہی ’’اصنام‘‘ وشاکھاپٹنم نے پوری لغت قسط وار شائع کی اور ماہنامہ ’’مفاہیم‘‘ رانچی نے ایک ہی شمارہ میں پوری لغت شائع کر کے ہمیں حیران کر دیا۔

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار، بھارت)

میرے گلزار، خوش رہو۔

ہم تو چراغِ سحری ہیں نہ جانے کب ہمارا سفر تمام ہو جائے مگر دل میں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم تمہارے ساتھ چہارسو کے قاری کے طور پر گواہ بن کے اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی فخر سے کھڑے ہوں گے کہ کس طرح ایک تن تنہا شخص اپنے رب کے آسرے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتا رہا جنہیں سوچنا بھی عام آدمی کے لیے دشوار ہے۔

ہر چند بزرگوں کو اولیت دینا احسن بات ہے مگر نوجوانوں کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بھی کسی طرح نیک شگون نہیں گردانا جاتا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کو پڑھ کر اس لیے زیادہ خوشی ہوئی کہ اُن کے قلم میں پروفیسر وارث علوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے قلم جیسی روانی بھی ہے اور تازگی بھی۔ میری طرف سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کو ڈھیر ساری دعائیں اور تمہیں اُس کے ہم وزن مبارک باد۔

افسانوں میں اپنے رتن جی چھائے ہوئے ہیں میں اُن کی تعریف میں صحت و سلامتی کی دعائیں پیش کر کے سرخرو ہونا چاہوں گا اور جناب یہ جولڑکی ہے ڈاکٹر رینو بہل جب سے اس نے ایوارڈ کی مراتھن کو سر کرنا شروع کیا ہے اُس وقت سے اس کے قلم نے خاص طرح کے موضوعات کو چننا اور انفرادیت سے برتنا شروع کر دیا ہے۔ ویسے تو میں اُسے مبارک دے چکا ہوں مگر چہارسو کے ذریعے دعا دینا میرا فرض اور اُس کا حق ہے۔ اب کچھ ذکر ہو جائے تمہارے افسانے کا۔ اس بار تم بہت چونچال نظر آئے ہو۔ موضوع بھی نیا، انداز بھی خوب رواں اور مکالمے بھی ایسے چٹاک پٹاک، لگتا تھا چاندنی چوک میں رادھا کی بارہ مصالحے والی چاٹ کھا رہا ہوں۔ شاباش۔ اردو ادب کو ابھی تم سے بہت توقعات ہیں۔ اور بھئی تم تو جانتے ہو اپنا سوہنا منڈا ڈاکٹر فیروز عالم میرے دل میں بستا ہے سو اُس کی ہر تحریر پڑھ کر میں مسرور ہو جاتا ہوں اور چہارسو کی ہیروئن پروین شیر کے قلم میں قدرت نے کچھ ایسی تاثیر دی ہے کہ سب سے پہلے اُسے پڑھنا اور پڑھ کر داد دینا عادت میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ تابش خانزدہ نے جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے اگر اسی طرح جاری رہا تو لگتا ہے چہارسو کا میلہ لوٹ کر ہی دم لیں گے۔

شاعری میں اپنے مہندر پرتاپ چاند، آصف ثاقب، عرش صہبائی، وِبھا نازلی، عارف شفیق اور ڈاکٹر ریاض احمد نے بہت متاثر کیا۔

یوگیندر بہل تشنہ (کیلیفورنیا)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۷ء اردو تنقید میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالہ سے ایک بلند قامت اور معروف شخصیت جناب ناصر عباس نیر کے نام منسوب کر کے آپ نے اپنے قارئین کو جدید اور اعلیٰ معیار کے تنقیدی ادب سے روشناس کرایا ہے۔ ناصر عباس نیر محض متن کی تشریح نہیں کرتے بلکہ شش جہات سے دیکھتے ہوئے سماج، تاریخ اور کائنات کے بنیادی اصولوں کے حوالہ سے بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے اردو تنقید میں نئی جان ڈال کر اپنے مخصوص انداز میں ایک تنقیدی ادب تخلیق کیا ہے۔ اسی شمارہ میں ان کا انشائیہ ''خبر کی بھوک'' بلاشبہ تنقیدی ادب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یٰسین آفاقی نے خوبصورت اور تکنیکی انداز میں ان کے تنقیدی ادب کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔

اس شمارہ میں آپ نے کئی اچھے افسانے اور مضامین شامل کیے ہیں۔ آپ کا افسانہ ''ایم ایس ایس پرائیویٹ لمیٹڈ'' پڑھتے ہوئے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے اور پھر کلائمکس پر پہنچ کر آپ کے مخصوص انداز تحریر کے مطابق کہانی ایسی انٹی کلائمکس پر اچانک ختم ہو جاتی ہے کہ قاری خلاف توقع اختتام پر حیران اور دیر تک سوچ میں گم رہتا ہے۔

آپا جمیلہ کی اکثر تحریریں عموماً طنز و مزاح کا امتزاج ہوتی ہیں۔ اس باران کا مضمون ''توبہ'' یکسر اصلاحی ہے۔ بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''کس کے من میں جائے بسے ہو'' دل کو چھو لینے والی بہترین جذباتی تحریر ہے جس میں بہت خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے۔ سیما پیروز کا افسانہ ''انہونی'' نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی کہانی ہے جو بہت جذباتی انداز میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔

شمارے میں معیاری نظمیں بھی شامل ہیں جو متاثر کن ہیں۔ اس سارے محنت طلب کام کو ایک خوبصورت شمارہ کی صورت میں قارئین چہارسو تک پہنچانے پر مبارک باد کے ساتھ دلی شکریہ قبول کیجیے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادرم گلزار جاوید صاحب

آپ کی محبتوں اور مہربانیوں کا میں کتنا شکریہ ادا کروں۔ یہ سلسلہ تو دراز ہوتا جاتا ہے۔ جب بھی ''چہارسو'' ملتا ہے، میں سوچنے لگتا ہوں کہ نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے بھی آپ کس جاں فشانی سے رسالہ اپنے چاہنے والوں کو بروقت پہنچانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس پابندی سے ''چہارسو'' ملتا ہے اتنی پابندی سے تو یہاں کے رسالے بھی نہیں ملتے۔

تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ ناصر عباس نیر کا گوشہ بھرپور ہے۔ آپ کے ساتھ ان کی گفتگو نہایت معلوماتی اور اہم ہے۔ اس سے پہلے مشرف عالم ذوقی پر بھی سیر حاصل گوشہ آپ نے نکالا تھا۔ مجھے اس کا اعتراف کرنے میں فخر کا احساس ہوتا ہے کہ پاکستان میں میرا اصل تعارف آپ ہی نے کرایا۔ فروغ اردو عالمی ایوارڈ (قطر) ملنا بھی دراصل اسی تعارف کا ایک حصہ ہے۔ آپ نے ''چہارسو'' کے مطالعے کو ایک ایسا دلکش نشہ بنا دیا ہے جس کے بغیر پڑھنے والے کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس کے لئے آپ جو محنت کرتے ہیں وہ رسالے کے ہر صفحے پر آشکارہ ہے۔ خدا آپ کو مزید حوصلہ دے۔

عبدالصمد (پٹنہ، بھارت)

چہارسو گلزار جاوید ''چہارسو'' السلام علیکم۔

شمارہ چہارسو حسرت آگیں و رونق گلزار ہے۔ اسی وقت جب ملا پڑھ

لیا۔کوئی حسرت نہیں رہ گئی۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ناصر عباس نیرّ رونق محفل ہیں۔میں نے انہیں پڑھا تو جی جان سے ہے مگر اتنا نہیں کہ جتنا پڑھنا چاہیے۔وہ اپنی کامیابیوں کے جھولے کے بقولے جھولے نہیں لے رہے بس کسرنفسی اور خود سپردگی کا عالم ہے۔
گزشتہ چند برس میں نیرّ صاحب نے ادبی تنقید کے ہمہ جہت پہلو نکالے ہیں۔وہ بھی ایسے کہ میں بے حد حیران ہوں یہ نگارش کیا ہے۔یہ کیا نیرّ صاحب نے بیگانگی کو بیگانگیت بنادیا ہے۔بیگانگی فارسی ترکیب ہے۔اور یہ اسم ہے اس عربی تشخص دینا چہ معنی دارد۔شخصیت،انسانیت،روحانیت وغیرہ عربی اسماء ہیں جو صفت سے بنے ہیں۔فارسی تراکیب کو یہ رخ دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔اسی طرح ایک پائے کے ادیب نے ناگزیر یت لکھا ہے ناگزیری اسم تو ہے اسے اس رنگ میں ڈھکیلنا ہے عجب ہے۔یکساں سے یکسائی ہے،یکسانیت درست نہیں آپ حیران ہوں گے ایک مشہور ادیب نے خوف، خوف ناک سے خوفناکیت لکھا ہے۔حال آنکہ اکیلا خوف خیرِ مطلب ہے۔آپ نے میری غزل شائع کی،مہربانی آپ کی۔ایک مصرع میں کھیتیوں کھیتوں ہوگیا ہے۔نوتن کے باب میں دیپک کنول نے درد وغم کا شعر آگیں سماں پیدا کیا ہے۔یہ مضمون دیپک کنول کی سب نوشتوں میں ممتاز ہے۔نوتن کی اداکاری معصومیت اور ''انجان پن'' کے نئے اسباب پیدا کرتی تھی۔احباب نے اپنے خطوں میں اس ناچیز کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے ان کی محبت میرے لیے خزانہ ہے۔دل مضطرب،نگاہِ شفیقانہ کے لیے پیار۔

آصف ثاقب (بوئی،ہزارہ)

بھائی گلزار جاوید،السلام علیکم۔

چند روز قبل چہارسو کا تازہ شمارہ اپنے جلو میں ناصر عباس نیرّ کا قرطاس اعزاز لے کر نمودار ہوا تو خوشی ہوئی کہ ادب کا ایک نامور ''چہارسو'' کے ۴۸ صفحات اپنی علمی بصیرت روشن کر گیا۔مرحوم وزیر آغا کے زیر عاطفت پروان چڑھنے والا یہ شجر اب ایک ثمر بار ہو کر اردو کو مالا مال کر رہا ہے۔۱۹۹۳ء میں میری پہلی کتاب ''آگہی سزا ہوئی'' شائع ہوئی تو میں نے انہیں بھی ارسال کی تھی جلد ہی ان کی جانب سے ایک تاریخی تبصرہ مجھ تک پہنچ گیا تو میں نے اپنے مجلّے میں ان کے خط کو بعینہٖ کر دیا تھا ایک اقتباس دیکھیے:(صفحہ ۲ پر)بات یہ نہیں ہے کہ انہوں نے میری پہلی کتاب پر کیا لکھا بلکہ بات یہ ہے کہ یہ ان جیسے نقادِ کرام کی حوصلہ افزائی نے میری شاعری کو مہمیز عطا کی۔اللہ ان کی بصیرت کو مزید بلندیاں عطا فرمائے،آمین۔''براہِ راست'' میں بھی یہ کھل کر سامنے آئے ہیں اور مجھ جیسے تشنۂ علم و ادب کے لیے سیرابی کا اہتمام کر گئے۔

جارج اوروہل کی ''پھانسی'' ترجمہ ہونے کے بعد بھی اب سے ایک صدی قبل کی جیل کی تاریخ بن کر نظر سے گزری اور بھرپور تاثر چھوڑ گئی۔''ایم ایس ایس پرائیویٹ لمٹیڈ'' جتنا مختصر تھا اتنا ہی متاثر کن بھی۔موضوع تیکھا ہے لیکن دولت کمانے کا آسان اور فوری قابلِ عمل طریقہ سکھاتا ہے۔مبارک ہو یہ افسانہ اور اس کا تازہ پن آپ کو!بشریٰ رحمٰن تو ویسے بھی افسانے پر ایک مستند شخصیت ہیں اُن کی یادنگاری پر مشتمل ''کس کے من میں جائے بسے ہو'' بہت خوبصورت شاہکار ہے۔''ایک صدی کا قصہ'' میں اس بار دیپک کنول نے نوتن کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔دیپک صاحب اردو میں(اور ہندی میں بھی)کہانیاں لکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں تو اُن کی یادداشت ان کو دھوکا دے دیتی ہے اور کہیں وہ اردو زبان کے ساتھ کھلواڑ کر جاتے ہیں۔کمار سین سمارتھ کی فلموں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک فلم ''نئی دیمنتی'' کا ذکر کیا ہے جو غلط ہے۔اُس فلم کا نام ''نل دیمنتی'' تھا جو ہندو اساطیر کے عشقیہ کرداروں پر مشتمل تھی۔پھر صفحہ ۱۱۴ کے دوسرے کالم کی پہلی عبارت میں ''کاجول'' کو موصوف نے نوتن کی بھتیجی لکھا ہے جبکہ وہ نوتن کی بھانجی (یعنی تنوجہ کی بیٹی)ہے تنوجہ کی شادی ایک بنگالی کیپٹن سے ہوئی تھی جس کی پہلی بیٹی کاجول ہے جو آج تک فلموں میں راج کر رہی ہے۔آخر میں ان سے عرض کہ وہ اس طرح کے مضامین میں بمبئی کی گلی کوچوں کی بازاری زبان پیٹ سے ہے یا تھی نہ استعمال کریں تو بہتر ہے جب کہ حاملہ عورت کے لیے اردو میں ''حمل سے ہے، پاؤں بھاری ہے یا حاملہ ہے'' مستعمل ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو(جنوری وفروری ۲۰۱۷ء)محترم انل ٹھکر صاحب کی مہربانی سے ملا۔میرے نام کا پرچہ ان کے پاس آیا تو نہیں تھا لیکن انل ٹھکر صاحب نے اپنی کاپی مجھے بھیج دی کیوں کہ اس میں میری دو تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ایک تو محترم پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب ''مکاتیب بہ نام غازی علم الدین'' کے لیے بطور پیش لفظ ''حرفِ خیر'' جو لکھا گیا تھا دوسرے بیس پچیس سال سے ہر مشاعرے میں پرانا کلام بار بار سنانے والوں پر طنزیہ غزل جس کا مطلع ہے:

پڑھتا ہے شعر باسی وہ یوں لہک لہک کے
ترکاری جیسے بیچے پانی چھڑک چھڑک کے

اس بار جناب مشرف عالم ذوقی کا گوشہ حسبِ معمول خوب ہے۔یہ آپ کی نگاہِ شفیقانہ ہے جو ہندو پاک کے مستحق ادیب وشاعر کو سرفراز کرتی ہے یہاں تو ہر رسالہ محض گوشے نکال کر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔ٹھیٹ کاروباری نوعیت کے یہ گوشے بے مزہ ہو کر رہ گئے ہیں مگر آپ تو ایسی خدمت بے غرض بے لوث انجام دے رہے ہیں اللہ آپ کو سلامت رکھے۔انل ٹھکر صاحب کے ناول جو ایک باب ''پسِ اشک'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ ان کی ناول پڑھنے پر اکساتا ہے۔اللہ کرے یہ ناول جلد چھپ جائے۔

رؤف خیر (حیدر آباد،دکن)

بہارِ ادب کے گلزار،سدا شاداب رہو،تا حشر کامیاب رہو،بامراد رہو۔آمین
کل برستی بارش میں تمہارا ادبی اور بدنی تحفہ پا کر میں محبت کی بارش میں بھیگتی رہی۔اپنی خوش بختی پہ نازاں و فرحاں۔وقار ابنِ گلزار تحفہ لے کر آیا۔میرا وقار اور پیار بڑھایا۔

''Love begets Love''

میرے پاس خانوادۂ گلزار کے لیے دعاؤں اور التجاؤں کے اور کیا ہے۔ رات
بادلوں کی گھن گرج میں رس رابطے پڑھا۔ محبت کے چاند، تشنہ محبت اور پیکرِ محبت
کے توصیفی کلمات پڑھ کر محبت بھرے آنسو امڈ آئے۔ کیسی کیسی پیار بھری ہستیوں
کے ساتھ رس رابطے قائم ہیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

دراصل تم ''کوہستانِ محبت'' ہو جہاں سے محبت کے پاکیزہ جذبے بہتے
چلے آ رہے ہیں۔ میں صدقِ دل سے آپ سب کی شکرگزار ہوں اور دعا گو ہوں۔
براہِ راست میں تمہارے نپے تلے اثر انگیز سوالات بانسری کی دلنواز
تالوں کی طرح براہِ راست میرے دل میں ایک خاص مقام بنا لیتے ہیں۔ نظرِ
بددور صفحہ اے بھی تمہارے قلم کی تابانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ لیکن اختتام دیکھ کر میری
آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔۔۔ یہ ہے روشن پاکستان؟

جو سوچتا تھیں بار وہ باتیں سہار لیں

پیکرِ محبت! رینو بہل کی اچھوتی، دل گداز تحریر ''ماں کی ڈائری'' مامتا
کی ماری ماں کی دلگیر کہانی۔ اُردو کی شیدائی ڈاکٹر رینو بہل نے سُہاسنی کے جان
سوز کرب کو نوکِ قلم سے کتنی اثر انگیزی سے عیاں کیا ہے۔

''مجھے بھی اپنوں کی شفقت اور رفاقت پر ناز ہوا کرتا تھا''
''کبھی میں بھی ان کی آنکھوں کا چمکتا ستارہ تھی''
''پھر وقت کی ایسی آندھی چلی کہ سب کچھ اڑا لے گئی''
''نا رشتے رہے، نا پیار، نا محبت، نا رتبہ، نا عزت۔۔۔ رہ گئی تو
صرف شرمندگی، پشیمانی، تنہائی اور جینے کی مجبوری۔۔۔''

رینو جی۔۔۔ اگر دو محبت بھرے دلوں کے مابین خاردار تاروں کی باڑ
نہ ہوتی تو میں تمہاری ہنرمند انگلیوں کو چومتی۔۔۔ آنکھوں سے لگاتی۔ جہاں بھی
رہو سکھی رہو۔۔۔ الفاظ کے سندر دیپ جلاتی رہو اور ہمارے دلوں کو گرماتی رہو۔
بشریٰ رحمٰن ''کس کے من میں جائے بسے ہو'' آپ میرے من میں
بستی ہیں (زمانہ دوشیزگی کی فرحت رشید، بشریٰ رشید اور مدرستہ البنات) میں
آپ کی من موہنی صورت وسیرت اور اُجلی اُجلی تحریروں کی پرستار ہوں۔ اپنی تحریر
کی سحر انگیزی دیکھئے:

''ہر روز صبح کاذب کے وقت جب آسمان کا سینہ چیر کر فجر کی پہلی
اذان اُبھرتی ہے تو آسمان کے پیچھے اذانوں کا ایک جھرنا کھل جاتا ہے گویا آسمان
جاگ کر زمین کو دیکھتا ہے۔ زمین فخر سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتی ہے اُس وقت
مجھے اچانک بچھڑے چہرے یاد آنے لگتے ہیں جو مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔۔۔ دل توڑ
گئے۔۔۔ اُن میں تمہارا چہرہ اُبھرتا ہے۔ صبح کی پھوٹتی ہوئی کرن کے ساتھ۔۔۔
نور میں نہایا تمہارا چہرہ مجھے نظر آتا ہے''

اللہ کرے پروازِ تخیل اور زیادہ ہو۔
اب پسندیدہ اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

گئے دنوں کی رفاقت کو بھول جا اے چاند
تو اس زمانے کا اب ذکر بار بار نہ کر

محمود الحسن کتنے وثوق سے کہتے ہیں:

کس طرح چپ چاپ کہہ دیتے ہیں یہ بھی دل کی بات
لوگ کہتے ہیں کہ اشکوں کی زباں کوئی نہیں

حسن عسکری کاظمی کی انکساری:

تجھ سے نسبت پہ سدا فخر رہے گا ہم کو
اپنی تقدیر بنا آئے تیرے کوچے میں

آصف ثاقب کا دردمندانہ لہجہ:

اُجاڑ گھر سے پوچھتا ہے ثاقب جگر فگار
وہ ہنسنے والے کیا ہوئے۔ وہ رونے والے کیا ہوئے

اختصارِ تحریر کا حسن ہے۔ گلزار میں تمہارا صبر مزید آزمانا نہیں چاہتی۔
ایک کہاوت ہے اگر دیگ کا منہ کشادہ ہے تو۔۔۔ چہارسو کے تخلیق کاروں کے
لیے دعاؤں کے تروتازہ ہار۔

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔
مارچ، اپریل ۲۰۱۷ء کا شمارہ ناصر عباس نیرّ صاحب سے موسوم ہو
کے موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز کے ساتھ ''براہِ راست'' کسی تبصرے وتوصیف کی
احتیاج نہیں رکھتا۔۔۔ دانشوروں و ناقدوں کے مضامین و تاثرات نے نیرّ
صاحب کی مختلف علمی، ادبی اور متنوع تنقیدی و تخلیقی جہات سے قارئین کو متعارف
کروایا اُن کے ادبی رجحانات کی جدید تشکیل سے شناسائی اور تنقیدی منظرنامے کے
اِمتیازات سے آگہی ملی۔۔۔
ایس ایم ایس پڑھنے، سننے اور کرنے کے بعد اس شمارے میں ''ایم
ایس ایس'' سے پڑھنے والوں کا دھانسو تعارف ہوا۔ ماڈرن ٹیکنالوجی کے اس عہدِ
حاضر میں۔۔۔ Clientage Service کے حسنِ کرشمہ ساز کی ترجمانی
کثیر المعانی لفاظی اور عکاسی متجسس مہارت سے خوب ہوئی۔۔۔
جارج اورویل کی کہانی (پھانسی) کے ترجمے میں پھانسی گھاٹ کے
راستے کو طے کرتے ہوئے کامیاب جزئیات نگاری نے ورق ورق قاری کو ساتھ
رکھا۔ اور وہ مختلف کیفیات کے جذبات واحساسات کے قلمی حصار میں رہا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔
چہارسو اپنی شاندار ادبی روایت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تازہ
شمارے میں ناصر عباس نیرّ کا گوشہ مرتب ہونا ایک تسلسل ہے جس سے بخوبی
اندازہ ہوتا ہے کہ پرچے پر ادبی تھکاوٹ کے آثار دور دور تک نہیں ہیں۔ ناصر
عباس نیرّ نے جس تیزی سے تنقید کے میدان میں اپنے آپ کو منوایا ہے وہ اظہر

من الشمس ہے''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات سچائی، سادگی اور عاجزی سے دیے ہیں۔ اچھے استاد کی یہ بڑی خوبی (خصوصاً ادب میں) ہے کہ وہ لائق شاگردوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُن پر منکشف کر کے انہیں راستہ دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن زیدی اور پرویز پروازی نے کیا زبردست رہنمائی کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی حوصلہ افزائی اور محبت ناصر عباس نیرّ کا اثاثہ اور قوت ہے۔ قاسم یعقوب نے ''اردو تنقید کے منظر نامے'' میں ناصر عباس نیرّ کا تنقید میں مقام متعین کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے اُن کی شخصیت کے خوب صورت پہلوؤں کا نمایاں کیا ہے۔ ناصر عباس نیرّ کی کتاب ''جدید شاعری'' کے ایک باب کا حصہ ''جدیدیت اور خاموشی کی جمالیات'' میں انہوں نے بیدل کو نئے سرے سے دریافت کیا ''طرز بیدل میں ریختہ لکھنا کے حوالے سے بھی فکرِ غالب کو نئے زاویے سے نمایاں کیا ہے۔ بیدل کے اشعار اور واقعات سے بیدل کی جدیدیت کو روشن کیا ہے۔''

گلزار جاوید صاحب جب بھی کوئی کہانی قارئین کی نذر کرتے ہیں حیران کر دیتے ہیں وہ ہمارے روز وشب کے معاملات سے کہانی کشید کرتے ہیں۔ ایم ایس ایس میں ہمارے سماج کا ایک ایسا تکلیف دہ مسئلہ پیش کیا ہے جس سے ہم کب تک نظر چرائیں گے۔ اب معاشرے میں برائی کو برائی نہیں سمجھا جا رہا۔ ''عرفی'' اور ''نظامی'' کے کردار ہمیں کیا پیغام دے رہے ہیں۔ رینو بہل کی کہانی ''ماں کی ڈائری'' میں خاندان سے بغاوت، عشق، بے وفائی، ماں بننے کی بے پناہ خوشی اور ماں سے محبت کی داستان کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ سیما پیروز کا افسانہ ''اَن ہونی'' میں ایک بانجھ عورت کی محبت اور کیفیت کو پیش کیا ہے، بہت سی خواہشات کی تکمیل انسان کے بس میں نہیں ہوتی زبردستی خواہش کی تکمیل نقصان دہ ہے یہی ''میداں'' کے ساتھ ہوا۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے جارج اورویل کی ذرا مختلف کہانی چہارسو کے قارئین کی نذر کی ہے اس کہانی کا حسن ''انسان کی مختلف کیفیات کی پیش کش ہے۔ پھانسی دینے والے، ڈاکٹر، جیل کے قیدیوں اور جس کو پھانسی دی جا رہی اُس کی کیفیت، بظاہر سب کچھ اچھا ہے مگر کہانی کی فضا اور کرداروں کے رویوں سے دکھ پھیل رہا ہے جسے سب اپنے اپنے انداز میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب۔ دیپک کنول نے اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے ''نوتن'' کا قصہ اپنے خاص انداز میں سُنایا ہے دیپک کنول کو مختصر لکھنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

''چند سیپیاں سمندروں سے'' قسط نمبر ۶ دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے سورج کی عبادت گاہ والا پہلو انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ ناول ''زہریلا انسان'' میں تابش خانزادہ نے کہانی کے مطابق ماحول خوب بنایا ہے۔ پڑھتے ہوئے اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ اچھا لگ رہا ہے۔ آصف ثاقب صاحب، مہندر پرتاپ چاند، غالب عرفان، حسنین اقبال، مالک سنگھ وفا اور انجم جاوید کی غزلوں کے اشعار میں فنی پختگی اور دل کو چھو لینے والی کیفیت ہے۔ محمود الحسن کا یہ شعر فانی انسانی کو آئینہ دکھا رہا ہے۔

جانے کیوں وہ خود کو سمجھ بیٹھے تھے گردوں کے ستوں
وہ کہ جن کا آج دنیا میں نشاں کوئی نہیں

جاوید صدیق بھٹی، تصور اقبال، عطاالرحمٰن قاضی اور عارف شفیق کی غزلیں رومانی کیفیت اور عصری مسائل کے پہلوؤں سے روشن ہیں۔ نصرت ظہیر کی غزل (نظم کی کیفیت ہے) بنارس کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مالک سنگھ وفا کے ایک شعر کی داد دیجیے:

اس کے بارے میں کروں کیا تجزیہ
دنیا ہے یہ جانی پہچانی مری

شوق انصاری کی نظم کیا ہے ''ابنِ آدم کی تقسیم'' ہمارے سماج اور سیاسی بے اُصولی کا کھلا خط ہے۔ وجیہہ الوقار ''رس رابطے'' میں خطوط بڑے سلیقے سے ترتیب دیتے ہیں۔ ''چہارسُو'' کے اکثر خط معلومات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اہلِ قلم کے کچھ نظریات اور فکر کا بھی علم ہوتا ہے۔

نوید سروش (میرپورخاص)

برادرم گلزار جاوید۔ السلام علیکم۔

کئی ماہ کے بعد ''چہارسُو'' کے شمارے پر کوئی تبصرہ کر رہا ہوں۔ ان دنوں مصروفیات اور بیماریوں نے گھیرے رکھا۔

آپ کا شکر گزار ہوں کہ ''چہارسُو'' میں آپ نے میری کتاب 'خاکہ گردی' پر ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے پیش لفظ کا اقتباس پیش کیا۔ ''رس رابطے'' میں بھی میری گذشتہ شمارے میں شائع ہونے والی شاعری کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے گویا اس شمارے میں مَیں موجود نہ ہونے کے باوجود موجود ہوں۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے نام ہے اور بہت خوب ہے۔ انہوں نے تنقید کے جس میدان میں قلم چلایا ہے آسان نہیں ہے، کئی سال پہلے تو ساختیات، مابعد جدیدیت جیسے عنوانات سے مضمون مجھ سے پڑھے ہی نہیں جاتے تھے، اب انہیں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس بارے میں ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا کام اتنا ہے کہ شاید بہت سے دیگر نقّادوں نے مل کر بھی نہیں کیا ہو گا۔ آپ نے ان سے لیے گئے انٹرویو کے سرنامے میں جو سوال اٹھایا ہے اس کا جواب ہر ادیب ''جی ہاں، درست فرمایا'' میں ہی دے گا، کیونکہ عالمی منظر نامے میں ہم اتنے تہی دامن نہیں ہیں۔ آپ کا افسانہ ''ایم ایس ایس پرائیویٹ لمیٹڈ'' ہلکے پھلکے لہجے میں ایک بڑے افسوسناک معاشرتی رویئے کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ افسانے کے آخر تک بھی یہ کلید نہیں کھلتی کہ ایم ایس ایس سے مراد موبائل سیکس سروس ہوگی، اور یہی ایک اچھے افسانے کا کمال ہوتا ہے۔ ''زہریلا انسان'' کی ساتویں قسط بھی پڑھی اور اول سے آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ تابش خانزادہ کی قسط کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی قسط ختم کرتے ہیں وہیں سے اگلی قسط پڑھنے کی بے چینی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کسی زمانے میں شکیل عادل زادہ کے ''سب رنگ ڈائجسٹ'' کی قسط وار کہانیوں میں یہ خوبی دیکھی تھی کہ اگلی قسط کے منتظر لوگ نیا شمارہ حاصل کرنے کے

لئے سول ایجنٹ کے پیچھے پیچھے ریلوے سٹیشن تک پہنچ جاتے تھے کہ وہ بلٹی چھڑائے تو وہیں اس سے تازہ شمارہ حاصل کر لیں۔عموماً کسی ادبی جریدے میں شائع ہونے والی کہانی یا ناول میں ایسی کشش کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار صاحب، ہمیشہ خوش رہیں۔

چہار سو کا تازہ شمارہ بنام ناصر عباس نیر باعث تسکین دل ونظر ہوا۔ایسے شماروں سے مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے کہ کتنے لوگ صحیح اور بجا طور پر اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور کس قدر بیش قیمت کتابیں اور کتنا دقیق کام تخلیق کر رہے ہیں۔ناصر صاحب نے اپنی زندگی اردو کی خدمت میں گذاری ہے۔میں چہار سو کے اس شمارے میں انکی تخلیقات پڑھ کر بیحد متاثر ہوا اور مجھے یقین ہے کے ایک دن ان کا شمار اردو کے جید اساتذہ جیسے ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے مشاہیر میں ہوگا۔خاص طور پر مرزا عبدالقادر بیدل پر انکی تحریر بیحد معلوماتی اور متاثر کن ہے۔آپکا شکریہ کہ آپ ہم جیسے قارئین کے لئے ''بحرے معلومات'' سے اس قسم کے جواہر تلاش کر لاتے ہیں۔

رینو بہل جیسی پائے کی قلمکار کے لئے مجھ سا مبتدی کیا لکھ سکتا ہے مگر انکا افسانہ ''ماں کی ڈائری'' انکے گذشتہ افسانوں کی طرح دل کو چھو گیا۔ہر پیرا گراف میں جذبات کی حدت تھی اور ہمارے کلچر میں خاندانی عزت و ناموس کی جو قدر و قیمت ہے اسکا بیان خوب ہے۔آجکل میں انکا ناول ''گرد میں اٹے چہرے'' پڑھ رہا ہوں اور اس نے بھی مجھے جکڑ رکھا ہے۔رینو بہن۔۔زورِ قلم اور زیادہ۔

اب، کچھ ''ایم ایم ایس۔۔۔'' کا تذکرہ! زبان اور بیان پر جو آپ کو عبور ہے اسکا تو تذکرہ تو میں بارہا کر ہی چکا ہوں۔چاہے وہ دلی کی چٹخارے دار زبان ہو یا پھر موالیوں کی بولی، پڑھے لکھے اشرافیہ کی گفتگو یا پھر مختلف علاقوں کی ملی جلی بات چیت۔۔۔آپ کو اس میں قدرتی ودیعت ہے۔اس مختصر افسانے میں بھی جو دو دوستوں کے درمیان بے تکلف مکالموں پر مشتمل ہے خوب خوب مزہ دیا اور پھر آخیر میں جب عقدہ کھلتا ہے تو پڑھنے والے کو جھٹکا سا لگتا ہے اور یہی افسانے کا نقطہء عروج ہے۔

واصف حسین کی تحریر یونس شرر کے لئے۔۔متاثر کن ہے مگر آخیر میں ''عذرا'' سمجھ میں نہیں آیا۔۔کیا یہ کسی عذرا صاحبہ کا خط تھا؟؟ میرے دوست ڈاکٹر ریاض کی غزل اور یوگی بہل صاحب کی نظم خوب ہے۔پروین شیر کا سفر نامہ اور دیپک کنول کا نوتن پر مضمون اور آپا جمیلہ کا توبہ بھی پسند آیا۔

مختصراً، ایک بار پھر اسقدر بھر پور شمارہ نکال نے پر دلی مبارک باد۔۔قارئین یقیناً آپ کی محنت، جانفشانی اور ''ادیب گری'' کے لئے آپ کی دیانت داری کے معترف ہوں گے۔اس خاکسار کی کاوشوں کو چہار سو میں شامل کر نے پر بھی دلی شکریہ۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

محترم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

''چہار سو'' کا اس لیے بھی انتظار رہتا ہے کہ یہ پانچویں سمت سے بھی کچھ نہ کچھ آگاہی ضرور فراہم کرتا ہے۔ناصر عباس نیئر ہمارے عہد کا وہ معتبر نقّاد ہے جس نے اپنے مطالعے کی وسعت اور غیر معمولی تجزیاتی صلاحیت کی بدولت ادب کو پڑھنے کے نئے زاویے فراہم کیے ہیں۔ان کے مضامین رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔۔۔تیزی سے نظر گزرنے والے اس مسرت سے بالعموم محروم رہ جاتے ہیں جو تنقیدی بصیرت کا حاصل ہوا کرتی ہے۔

جناب نجم الحسن رضوی کا افسانہ ''باتیں'' اور محترمہ سیما پیروز کا افسانہ ''انہونی'' دونوں خوب ہیں۔ڈائری کی تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ''ماں کی ڈائری'' پڑھ کر رینو بہل کے ناول ''گرد میں اٹے چہرے'' کو پڑھنے کی خواہش بھی سر اٹھاتی ہے۔یقیناً یہ ناول بھی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے کئی موسموں سے عبارت ہوگا۔

چند سیپیاں سمندروں سے ''فکشن''، ''مصوری'' (لفظی تمثالیں) اور شاعری کے امتزاج سے ایک منفرد سفر نامے کی تشکیل ہے۔واحد متکلم کے حصار سے نکل جانے کا تجربہ بھی اچھا لگا۔

دیپک کنول کی تحریر ''ایک صدی کا قصہ۔۔۔نوتن'' میں جہاں اچھے خاکے کی خوبیاں موجود ہیں وہیں فلمی دنیا کی تاریخ کا ایک منفرد باب بھی محفوظ ہو گیا ہے۔

عطاء الرحمٰن قاضی (عارف والا)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہار سو مارچ اپریل دستیاب ہوا۔بلاشبہ چہار سو کا ہر شمارہ انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔قرطاس اعزاز تو ایک ایسا منفرد و مقبول سلسلہ ہے جو مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔جناب ناصر عباس نیئر ہندو پاک کے یکساں پسندیدہ ادیب اور نقاد ہیں۔

ڈاکٹر رینو بہل کی کہانی حسبِ معمول دل کو چھونے والی تخلیق ہے۔ رینو جی کا انداز بیاں عروج پر ہے اور قاری کو لگا تار باندھے رکھتا ہے۔رتن سنگھ جی کی کہانی ''داؤ'' بہت اچھی کہانی ہے حال ہی میں رتن سنگھ جی کا ناول ''سانسوں کا سنگیت'' نظر سے گزرا آپ نہ صرف بلند پایہ ادیب اور دانشور ہیں بلکہ ہماری معدوم ہوتی تہذیب کے وارث اور علمبردار بھی ہیں۔آپ کی کہانی ''ایم ایس ایس پرائیویٹ لمیٹڈ'' کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے لیکن آپ کی قلم نے اسے دلچسپ کہانی کا روپ دے دیا ہے۔

شعر و شاعری کے دیار میں بہت چہل پہل ہے۔تمام غزلیں، نظمیں اور مکتوبات دل کو چھو لینے والے ہیں بالخصوص مالک سنگھ وفا، انجم جاوید، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، غالب عرفان، اشرف جاوید اور مہندر پرتاپ چاند کا کلام بہت خوب لگا۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب اور سلام

ناصر عباس نیئر صاحب والا شمارہ بڑا معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ نیئر صاحب کی تحریر بڑی خوبصورت اور جامع ہے،ان کے جواب تو پرلطف تھے ہی، بیدل کے حوالے سے جدیدیت پر ان کا مضمون خاصے کی چیز ہے، بہت وقیع اور وسیع۔ جدیدیت اور اس کے بیایے کے فرق کے بارے میں انھوں نے جس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے، وہ ایک ایسا سوال ہے جو بار بار اٹھتا ہے اور نئے کام پر بات کے دوران اس کی اکثر وضاحت کرنا پڑ جاتی ہے مگر شاید یہ ابھی بہت زمانے تک اور ہوتا رہے گا جب تک جدیدیت' بحثیت نظریہ اور اس کے ہمعصر نظریات ہمارے تنقیدی مکالمے کا لازمی حصہ ہیں۔ بہرحال بیدل کے یہاں قاری کے تصور کے حوالے سے یہ مضمون بڑا چشم کشا ہے، بہت سی داد۔ خاموشی کی جمالیات لی طرف اشارہ بھی بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ افسانوں میں رتن سنگھ کا ''داؤ'' دلچسپ تھا، آپ کا ''ایم ایس ایس'' خاص گلزار جاوید اسلوب میں رچا ہوا اور سماجی نفسیات پر لکھا ایک اور اچھا افسانہ ہے۔ حسن عسکری کاظمی کی نظم ''انتظار'' کے علاوہ اختر شاہجہانپوری، عارف شفیق، نصرت ظہیر، عطاالرحمٰن قاضی اور انجم جاوید کے اشعار، خصوصاً انجم جاوید صاحب کی غزل کی زمین اور حسنین اقبال کی غزل خوب ہیں۔ شاہین صاحب کی ''دھمال'' بڑی خوبصورت نظم ہے، واہ۔ ہمیشہ کی طرح دعاؤں کا طلبگار۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

مارچ ، اپریل کا ماہنامہ چہارسو نظر نواز ہوا۔ دل کو بے پایاں مسرت حاصل ہوئی۔ اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز کی قابل شخصیت معروف نوجوان نقاد جناب ناصر عباس نیئر ہیں جو میرے محبوب لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں جب وہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں تھے اُن سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ براہِ راست میں آپ کے طرح دار سوالوں کا جواب بڑے مدلل انداز میں دے کر ناصر عباس نیئر نے اپنی خداداد ذہانت کا لوہا منوایا یہ ایک تاریخی انٹرویو ثابت ہوگا۔ نامور احباب نے اُن پر بڑے عمدہ مضامین رقم کیے ہیں جو اُن کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ چہارسو میں شائع ہونے والے افسانے بہت اعلیٰ معیار کے حامل ہوتے ہیں۔ اس بار سیما پیروز کا ''انہونی'' رینو بہل کا ''ماں کی ڈائری'' گلزار جاوید کا ''ایم ایس ایس پرائیویٹ لمیٹڈ'' بے حد اہم افسانے ہیں۔ فیروز عالم کا ترجمہ ''پھانسی'' بھی پسند آیا۔ یادنگاری کے تحت بشریٰ رحمٰن نے شخصیت کا اپنے الفاظ میں نقشہ خوب کھینچا۔ شاعری میں آصف ثاقب، غالب عرفان، اشرف جاوید، رضیہ اسماعیل، عارف شفیق کی غزل تغزل کے اعتبار سے پختہ غزلیات ہیں۔ ایک صدی کا قصہ میں دیپک کنول نے ادا کارہ نوتن پر بڑا معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔

چمن کی خامشی میرے وطن سے ٹوٹ گئی
فصیلِ ظلمتِ شب تھی کرن سے ٹوٹ گئی
اُسے بہار متاعِ بہار کہتی ہے
وہ پنکھڑی جو ترے پیرہن سے ٹوٹ گئی
تمام شہر میں پھرتی رہی مچلتی کرن
ہوئی جو شام سفر کی تھکن سے ٹوٹ گئی
بہت کچھ اس نے بھی ردوبدل کیا خود میں
مری انا بھی بڑے بانکپن سے ٹوٹ گئی
وہ ہنستے ہنستے ہی آنکھیں رلا گیا سب کی
بڑی جمیل کہانی متن سے ٹوٹ گئی
شجر تو گم ہے نئی کونپلوں کی چاہت میں
مگر وہ شاخِ تمنا وطن سے ٹوٹ گئی
یہ زندگی بھی کوئی کانچ کی بنی تھی عدیلؔ
ذرا سی ٹھیس لگی اور چھن سے ٹوٹ گئی

ابراہیم عدیل (جھنگ)

''کوئک اسٹارٹ''

جدید طرزِ زندگی کے ردِعمل میں دنیا میں دل کے امراض کے باعث اموات کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف برطانیہ میں ہر سال ایک لاکھ افراد حرکتِ قلب بند ہونے سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ دل کے دورے کا سبب بالعموم دھڑکن کی رفتار بڑھ جانے سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی پانچ سو تک جا پہنچتی ہے جس سے جسم کو خون کی فراہمی منقطع ہوجاتی ہے۔ حال ہی میں ہالینڈ کے سائنسدانوں نے نہایت چھوٹا برقی آلہ ''کوئک اسٹارٹ'' تیار کیا ہے اس کو انسان کی پسلی کی ہڈی کے نیچے کھال کاٹ کر نصب کیا جاتا ہے جس کا ایک تار قلب کے اندر لگا دیا جاتا ہے۔ جونہی انسان کا دل ڈانوں ڈول ہوگا ''کوئک اسٹارٹ'' میں لگی بیٹری دل کو برقی جھٹکا دے کر رواں کر دے گی اور دل کی رفتار اعتدال میں لے آئے گی۔ دیا سلائی کے سائز کا یہ آلہ وہی کام کرتا ہے جو ہسپتالوں میں استعمال ہونے والی بڑی مشین کرتی ہے۔ فلحال یہ آلہ عام آدمی کی دسترس میں نہیں کیونکہ اس کی قیمت پندرہ ہزار پونڈ ہے۔ ماہرین کو یقین ہے کہ اس کی طلب میں اضافے سے قیمت میں کمی واقع ہوگی اور یہ آلہ پیس میکر کا بہتر نعم البدل ثابت ہوگا۔

...... مہکاہوالمحہ ......

ہمارے عہد کی نامور شاعرہ محترمہ پروفیسر دِرانجم عارف جہاں درس وتدریس سے وابستہ رہیں وہاں انہوں نے شاعری میں اپنی شناخت کی خاطر شعری تجربوں سے اردو کو مالا مال کیا ہے۔ وہ انگریزی ادب پڑھاتے اور اپنی قومی زبان اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے میں سرگرمِ عمل رہیں، انہوں نے شیکسپیئر، کیٹس، بائرن اور ٹینی سن جیسے انگریزی ادب کی نمائندہ ہستیوں سے راہ ورسم رکھی وہاں انہوں نے میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور احمد فراز کا مطالعہ حرزِ جاں بنایا، ان کے آباؤ اجداد بدایوں جیسے مردم خیز شہر میں آباد تھے، ان کے والدِ محترم پروفیسر تقی الدین انجم گورنمنٹ کالج جھنگ میں پرنسپل رہے، ادب سے گہرا شغف اور تخلیقیت کا جوہر ان کی شخصیت میں نکھار کا سبب بنا۔ ''مہکا ہوالمحہ'' ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے، اس سے پہلے ''نوائے زیرِ لب''، ''رتجگوں کا شہر''، ''درد آشنا'' اور ''شہرِ آرزو'' نے قارئین سے دادو تحسین وصول کی اور ناقدین نے ان کی غزل میں کلاسکیت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کو سراہا، دِرانجم عارف اپنی ہمعصر شاعرات کی تخلیقی ہنرمندی اور اظہار میں شائستگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، وہ غزل میں پاکیزہ جذبوں اور نئے موضوعات کو شامل کرنے کے حق میں ہیں یہی وہ وجہ ہے کہ ان کے بیشتر اشعار میں جہاں اور خصوصیات موجود ہیں وہاں انسانی نفسیات اور تبدیلیِ احوال نیز غمِ زیست کی آفاقیت کو غزل کا اہم موضوع تصور کرتی ہیں جس میں ہر لحہ گریز پا دکھائی دیا کرتا ہے۔ ......حسن عسکری کاظمی

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: اظہار سنز، اردو بازار، لاہور۔

...... عروض اور تقطیع ......

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا قول ہے کہ شاعری خود ایک کمال ہے یہ اگر کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے تمام کسبِ کمال ہیچ ہیں۔ اگر چہ عروض کے حوالے سے اس وقت بھی کئی کتابیں بازار میں موجود ہیں لیکن ان کتابوں کے خریدار اپنی رقم کے ضیاع پر افسوس کرتے ہیں اور بالآخر وہ ''رموزِ شاعری'' ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مَیں اس کتاب کے ہر ایڈیشن میں قارئین کی آرا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس میں اضافے بھی کرتا رہا اور مزید آسان بھی بناتا رہا ہوں اس کتاب کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ کتاب کے ہر باب کو لیکچر کے انداز میں لکھا ہے۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ''رموزِ شاعری جامع'' کے نام سے مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت صرف ڈھائی سو روپے ہے۔ اور اب یہ نئی کتاب ''عروض اور تقطیع'' کے نام سے طالبانِ رموزِ شاعری کے علم میں مزید اضافے کا باعث بنے گی انشاءاللہ۔ ...... پروفیسر عزیز جبران انصاری

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: جبران اشاعت گھر، اردو بازار کراچی۔

...... اس اندھیرے سے پرے......

میر ظفر حسن نے اپنی نظموں سے اس عہد کے انسانی تجربے کی عمیق صداقتوں اور اذیت ناک احساسات کو تخلیقی اظہاریے میں اس طرح سمولیا ہے کہ وہ اس عہد کی انسانی صورتِ حال کا عکس دکھاتے ہوئے خود ہمارے تجربے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس کے لیے شاعر نے بڑی چابک دستی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ اس نے نظموں کو Story narrative کے سانچے میں تخلیق کیا ہے۔ انسان ازل سے کہانی کہنے اور سننے کا شوق رکھتا ہے۔ کہانی کے اسلوب میں کہی گئی بات صرف ذہن ہی نہیں بلکہ دل، احساس اور مزاج سب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس narrative نے میر ظفر حسن کی نظموں کو زیادہ قابلِ فہم اور بامعنی ہی نہیں بنایا، بلکہ ان کی اثر آفرینی میں بھی غیر معمولی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور یہ وہی بات ہے جو امریکا کے رابرٹ فراسٹ کی نظموں کے حوالے سے کہی جاتی ہے، یعنی اس طرح یہ نظمیں قاری کے لیے صرف ایک متن کی قرأت تک محدود نہیں رہتیں، بلکہ تجربے میں ڈھل جاتی ہیں۔

......رضی مجتبیٰ

اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت: ۴۰۰، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی۔

چہارسُو
بے کرانیاں
پروین شیر
اُفق کے اُس پار
مترجم
فیروز عالم